قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

نومبر 2023 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب کا خانہ

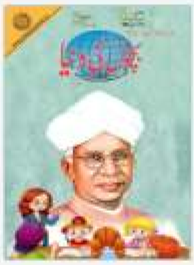

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ◆ زبان شناسی
- میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 :A/C، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
جلد:25، شمارہ:11، نومبر 2023
مدیر : پروفیسر دھننجے سنگھ
نائب مدیر : عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم
ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید
قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے
Total Pages: 100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 9/33، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in
شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5

ادب: زاویے اور جہات
وادیِ چناب میں اردو افسانہ — مشتاق احمد وانی 7
سیمانچل میں اردو شاعری — احسان قاسمی 11
رسالہ فیضِ میر: میر کی فسانہ طرازی اور سلوک ومعرفت کی دنیا — محمد حنیف خان 16
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور فہرست اردو مخطوطات — محمد شارب 18

محسن کاکوروی کی نعت گوئی ہندوستانی تہذیب کے تناظر میں — سعود عالم 21
اکیسویں صدی میں ناول نگاری اور چند غیر مسلم ناول نگار — مدثر احمد گنائی 24
دارالمصنفین اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی تحقیقات — محمد فرقان عالم 26
کتبوں سے کتاب تک — عاقل زیاد 29

یاد رفتگاں
شہباز حسین — اسلم جاوداں 31
پروفیسر صاحب علی — محمد زبیر 33

عرفان عباسی کی یاد میں — محمد اویس سنبھلی 35

لعل و گہر
منظور احمد منظور دلچسپ نثر نگار، باکمال شاعر — رؤف خیر 38
کرشن بہاری نور کا رنگ سخن — عمیر منظر 41

فروغ نقاش کا شاہکار: مہابھارت — محمد اسرار 44
گلزار دہلوی کا شعری انفراد — سجاد احمد نجار 46

سلسلہ صحافت
کرناٹک کی ادبی صحافت — ام عمارہ ضیا 48

عالمی ادب
لبنان کا ایک آشفتہ سر: جبران خلیل جبران — غزالہ پروین 53

دیارِ غیر میں
ازبکستان میں اردو زبان و ادب — قرۃ العین 56

خصوصی گفتگو
طرب میرٹھی سے انٹرویو — اکمل نعیم صدیقی 59

فلم
ساحر لدھیانوی کے فلمی نغموں میں محبت وانسانیت — محمد عطاء اللہ 62
اردو ہندی ناولوں اور ڈراموں پر مبنی فلموں کا مختصر جائزہ — شہزاد بخت 65

نیا آسماں نئے ستارے
کلام درد کا ہمہ جہت رنگ — میسرہ اختر 69

عورتوں اور مظلوموں کی بلند آواز: شکیلہ اختر — نصرت جہاں 72

کتابوں کی دنیا
تعارف وتبصرہ — ادارہ 75

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 86

ہماری بات

کسی بھی مہذب معاشرے کی شناخت ادب سے ہوتی ہے!

ادب کا بنیادی منشور اور مقصد ہی انسانیت، امن اور اتحاد کے ساتھ ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر و تشکیل ہے۔ دنیا کا کوئی بھی ادب ہو وہ اخلاقی اقدار اور انسانی افکار پر مرکوز ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادبیات میں بھی زیادہ تر اعلیٰ شہ پاروں کا تعلق اخلاقیات اور روحانیات سے ہے۔ مذہبی صحائف میں بھی انسانی اور اخلاقی اقدار پر ہی زور دیا گیا ہے۔ قدیم ترین ویدک ادب میں بھی جن اخلاقی اقدار اور انسانی اوصاف پر زیادہ توجہ دی گئی ہے وہ صحت منداور صالح انسانی معاشرے کے لیے بہت اہم ہے۔ دنیا کی کلاسیکی زبانیں ہوں یا ہندوستان کی سنسکرت، پالی، پراکرت، تلگو، تمل، کنڑ، اڑیا، مراٹھی، ملیالم، ہندی اور اردو، ان تمام زبانوں میں انسانی اور تہذیبی اقدار کے تحفظ کی ترغیب دی گئی ہے۔ ام الالسنہ سنسکرت ادب میں بھی جن اقدار پر زیادہ ارتکاز ہے ان میں ستیہ، دھرم، شانتی، پریم اور اہنسا اہم ہیں۔ رشیوں منیوں، صوفیوں اور سنتوں کی تعلیمات اور ملفوظات میں بھی انھی تصورات کی قدر و معنویت زیادہ ہے جو اخلاقیات اور روحانیات سے رشتہ رکھتے ہیں۔

ہمارے کثیر لسانی اور ثقافتی ملک میں بھی جن افکار کو اساسی اہمیت حاصل ہے ان میں اتیتھی دیوبھوا، ستیم ودا، دھرمم چھدا، اہمسا، پرمو دھرما، وسودیوا کٹمبکم ہیں۔ یہ وہ افکار و تصورات ہیں جو کسی بھی معاشرے کو تہذیبی، ثقافتی اور اخلاقی قدروں کے اعتبار سے ثروت مند بناتے ہیں۔ یہی انسانی قدریں ہیں جن سے کسی بھی ملک کی تہذیبی اور ثقافتی شناخت ہوتی ہے۔ خاص طور پر ہمارے ملک کے مذہبی صحیفوں میں سچائی، عدم تشدد، اتحاد و یگانگت اور انسانی برادری کی وحدت پر جس طرح زور دیا گیا ہے اس کی عکاسی ہمارے یہاں کے ادب میں بھی بہت ہی مؤثر انداز میں کی گئی ہے۔ جب ہم کسی زبان کے ادیبوں اور شاعروں کی نثری یا شعری تخلیقات پڑھتے ہیں تو ان کی تخلیق میں بھی رشی منی، وشوامتر، سوامی وویکانند، شنکر آچاریہ اور دیگر روحانی پیشواؤں کے تصورات کا عکس نظر آتا ہے۔ ہمارے یہاں کے زیادہ تر ادب میں انسانیت اور عالمی اخوت پر زور دیا گیا ہے اور ان تمام تصورات کی نفی کی گئی ہے جس سے انسانی ذات کی تقسیم کا شائبہ ہو۔

غالب نے بھی سب سے زیادہ زور انسانیت پر دیا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا   آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اسی طرح خواجہ میر درد نے انسانی دردمندی کے جذبے کو جگانے کے لیے یہ شعر کہا تھا۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو   ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کر و بیاں

ہندوستان کی تمام زبانوں کی شاعری میں اخلاقی اقدار سے متعلق بہت سے شعر ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ فکشن کا بھی ایک بڑا سرمایہ انھی اخلاقی تصورات پر مبنی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد، پریم چند، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ زیادہ تر فکشن نگاروں نے امن و اتحاد، بقائے باہم اور انسانیت کا پرچم بلند کیا ہے اور ان تصورات کی ترسیل کی ہے جن سے ہر دل میں انسانیت کی شمع روشن ہو۔ ان اعلیٰ ترین تخلیقی ذہانتوں کو اس کا ادراک تھا کہ افکار و نظریات الگ ہو سکتے ہیں، راہیں بھی جدا ہو سکتی ہیں مگر سب کی منزل ایک ہے اور وہ منزل ہے انسانیت، امن اور اتحاد۔ اسی لیے تمام تر مذہبی تحفظات اور تعصبات سے بالا تر ہو کر فنکاروں نے امن، انسانیت اور یکجہتی کی ہی بات کی ہے۔ شیخ سعدی نے یہ کہا تھا کہ

بنی آدم اعضائے یکدیگرند

تو اس کا واضح مفہوم و یہ ہے کہ شیخ سعدی تمام بنی نوع انسان کو وحدت کی ایک لڑی میں جوڑ کر دیکھتے تھے۔ یہ وہی تصور ہے جو **وسودیوا کٹمبکم** میں پیش کیا گیا تھا کہ پوری دنیا ایک خاندان کی طرح ہے۔ اسی لیے ندا فاضلی جیسا ایک حساس شاعر جب اس وحدت کو ختم ہوتے دیکھتا ہے تو اسے افسوس ہوتا ہے۔

گرجاہیں، مندروں میں اذانوں میں بٹ گیا   ہوتے ہی صبح آدمی خانوں میں بٹ گیا

دراصل کوئی بھی حساس، باشعور انسان ہو یا کسی بھی زبان کا مثبت سوچ رکھنے والا فنکار وہ انسانوں کو مختلف ٹکڑوں میں بٹا ہوا نہیں دیکھ سکتا، وہ ان اخلاقی اور تہذیبی قدروں کا تحفظ کرتا ہے جن سے معاشرے کو روشنی ملتی ہے کہ ادب اور ادیب کا بنیادی کام عالم انسانیت کو تاریکیوں سے نجات دلانا ہے۔

پروفیسر دھننجے سنگھ

ربط و التفات

ماهنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

دنیائے اردو ادب کو عالمی تخلیقات، آفاقی موضوعات، دریافت کے نئے جزیروں سے روشناس کرانے کا فریضہ جس حسن وخوبی کے ساتھ 'اردو دنیا' ادا کر رہا ہے، وہ قابل صد ستائش ہے۔ اکتوبر 2023 کا شمارہ ادبیت، غور وفکر، پرمغز موضوعات سے آراستہ باصرہ نواز ہوا، تذکروں کی بہار سرورق کا حسن اور ادبی قدر و قیمت میں اضافے کا باعث ہے۔ اردو زبان و ادب کی روشن تاریخ کو دہراتا ہوا، اردو کے شاندار مستقبل کا ضامن، صحت زبان، وضع اصطلاحات، طباعت اور صحافت، ادب اطفال، مشائخ دہلی کی فارسی شاعری، نظیرا کبرآبادی، حنیف نقوی کے امتیازات، آزادی کے بعد اردو غزل کا بدلتا منظرنامہ طلبہ تعلیمی تناؤ کے نرغے میں وغیرہ دعوت غور وفکر دینے والے مضامین ہیں۔ لعل و گہر، یادرفتگاں، نگرنگر اردو، ماحولیات، خصوصی گفتگو، نیا آسماں نئے ستارے، کتابوں کی دنیا، خبرنامے — عنوانات خواہ کچھ بھی ہوں موضوع کا حق ادا کرتے ہیں کہ موضوعات پر قلم اٹھانے والے اہل قلم نے تحقیق اور تنقید، دونوں کا حق ادا کر دیا ہے۔

اداریہ اردو زبان کے تدریجی ارتقا کا حق ادا کر رہا ہے کہ ماضی تا حال اردو کے ترویج وترقی کا اس سے بہتر منظرنامہ بھی کیا ہوگا۔ یوں تو 'اردو دنیا' کے تمام شمارے قابل رشک ہوتے ہیں اور قاری کی ادبی تشنگی کی سیرابی کا باعث ہیں مگر اس شمارے میں تانیثی افسانوں میں احتجاج طلبہ تعلیمی تناؤ کے نرغے ہیں۔ مظفر حنفی کی تحریروں میں ہندوستانی عناصر، ماحولیاتی تحفظ اور پائیدار ترقی کے لیے طرز حیات میں تبدیلی 'تبصرہ وتعارف' اردو فکشن میں تقسیم ہند کا بیانیہ — آن لائن مذکورہ اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں اہمیت کی حامل ہیں۔ محترم جناب عزت مآب ظفر اقبال صاحب کو جشن ظفر اقبال کی دلی مبارکباد!

مرا رنگ سخن کیا ہے، میری طرز نوا کیا ہے　　جبین وقت کی تحریر پڑھ لو پوچھنا کیا ہے

(پرویز شاہدی)

ڈاکٹر رضوانہ پروین ارم: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور وومنس یونیورسٹی، جھارکھنڈ

اکتوبر اردو دنیا کا شمارہ بروقت ملا، سرورق بے حد جاذب نظر اور دلکش ہے، تذکرہ

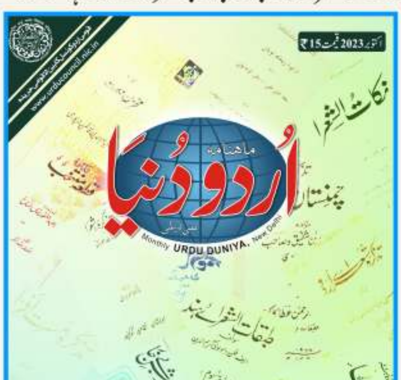

کی کتابوں کے نام کو جس انداز میں سرورق پر جگہ دی گئی ہے اس کے لیے ڈیزائنر قابل مبارکباد ہیں۔ تذکرہ کی بیشتر کتابوں کے نام مع مصنف و مرتب آگئے ہیں۔ اداریے میں ہماری بات کے تحت ان علاقوں پر خصوصی توجہ دینے کی درخواست کی گئی ہے۔ ایڈیٹر صاحب کی بات سے میں بالکل متفق ہوں،

اس لیے کہ دانستہ طور پر علاقائی ادب اور ادیبوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بہت سے علاقائی ادبا و شعرا تاریخ کے صفحات میں جگہ پانے سے محروم ہوجاتے ہیں، اس شمارے میں بیس مضامین اور ایک انٹرویو ہے، موضوعات کا انتخاب بھی بہت خوب ہے، پہلا مضمون مجید بیدار کا طباعت اور صحافت ہے، اس میں انھوں نے طباعت اور صحافت کی تاریخ کو مفصل اور مدلل طور پر بیان کیا ہے، صحافت کی تاریخ دوسو سال پر محیط ہے، اس کی ابتدا اور ارتقا پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ تابش مہدی کا مضمون بہت معلوماتی اور اہم ہے، ان کے مضمون کا عنوان صحت زبان و بیان اور اردو املا ہے، علم و ادب، تحریر و تصنیف، اور تقریر و خطابت کی دنیا میں صحت زبان و بیان اور اور اردو املا کی ہمیشہ اور ہر دور میں اہمیت رہی ہے، اس لیے اس پر بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے، کئی ادیبوں جیسے مولوی عبدالحق، شان الحق حقی، رشید احمد صدیقی، رشید حسن خاں، شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ وغیرہ نے اس اہم موضوع پر کتابیں تحریر کی ہیں، ان ادیبوں کی وضع کردہ اصطلاحات، تجاویز، سفارشات اور قواعد کو اپنی تحریروں، تقریروں میں برتنے اور اپنانے کی ضرورت ہے، نورین علی حق کا مضمون لذت کش آلام کا شاعر سید فضل المتین چشتی بے حد شاندار ہے، اور سید فضل المتین چشتی کی حیات و خدمات کا مکمل طور پر احاطہ کرتا ہے، ان کی شخصیت کو جس انداز اور جس الفاظ میں پیش کیا گیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دگر مضامین وضع اصطلاحات مسائل و امکانات، اردو کے تانیثی افسانوں میں احتجاجی عناصر، حنیف نقوی کے امتیازات، طلبہ تعلیمی تناؤ کے نرغے میں، گلابی اردو اور ملا رموزی وغیرہ بھی اہم ہیں، اردو کے ریسرچ اسکالرز اس رسالے کو ضرور پڑھیں، اس سے یقیناً ان کے علم میں اضافہ ہوگا۔

ابصار شمیم: رہوا، وارث نگر، سمستی پور، بہار

'اردو دنیا' ستمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ بہترین ڈزائننگ، کاغذ کی عمدہ قسم، اغلاط سے پاک کتابت اور مضامین کا نظام ترتیب ہر پہلو سے مدیر و معاونین کی محنت و دلچسپی عیاں ہے۔

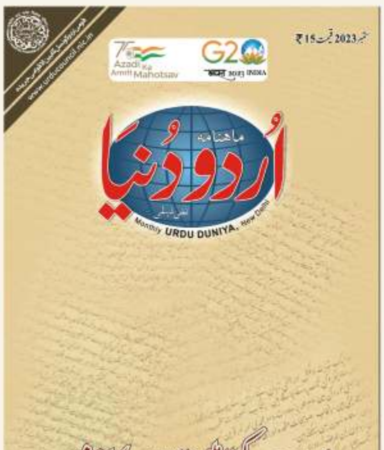

مجھے اس رسالے کے معیاری مشمولات کے ساتھ اس کی خوبصورتی نے بھی متاثر کیا۔

سفینہ بیگم کا مضمون 'ہندوستان میں نسائی نظم کے متنوع موضوعات' اچھا لگا۔ جیسا کہ سفینہ نے لکھا ہے ''خواتین کی نظموں میں محض عورت اور مرد کے ظاہری احوال و کوائف ہی نہیں ہیں بلکہ داخلی کیفیت کی ان زنجیروں کو بھی ہلایا گیا ہے جو عرصہ دراز سے روح کے رین بسیرے میں زنگ آلود پڑی تھیں۔''

خواتین لکھتی ہیں لیکن انھوں نے اپنے اندرون میں جتنا دکھ درد چھپایا ہوتا ہے اس کا عشر عشیر بھی سپرد قلم نہیں کیا جاتا۔ اسی لیے نسائی نظم میں موضوعات کی طرف اشارے کرتی قابل مصنفہ ان کے بہت سے موضوعات سے باخبر ہوتے ہوئے بھی بے خبر رہ جاتی ہیں۔ اشعار میں جو کچھ کہا جاتا ہے معنی و مفہوم کے اعتبار سے اس سے زائد موضوعات قاری کے ذہن کے پردوں کو کھولنے کا کام کرتے ہیں۔ اہم موضوع پر لکھنے کے لیے سفینہ بیگم کو بہت مبارکباد۔ عبدالباری کا مضمون 'تدوین متن کی قرات کے مسائل' ہر پہلو سے موضوع پر خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ اس کو پڑھ کر محسوس ہوا جیسے آسان زبان میں تفصیل سے سمجھا دیا گیا ہے۔ قابل تعریف ہے کہ اتنے عمیق موضوع پر ہر زاویے سے انصاف کیا گیا۔ رسالے کی دیگر سرگرمیاں جیسے 'زبان اور زمینی صورت حال' سوالنامہ اچھی پہل ہے۔ عرفان صدیقی کچھ یادیں کچھ باتیں، دلچسپ مضمون ہے۔ قومی اور علاقائی خبریں، اخبار سے لی گئی ہیں لیکن یہ کام بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اخبارات زمانے کی خرد برد میں ختم ہوجاتے ہیں رسالے کے ذریعے یہ تمام ادبی پروگرام رکارڈ میں رہیں گے۔ اور سب سے آخر میں غیر معمولی پہل ماہنامہ اردو دنیا کا نیا سلسلہ 'جن کتابوں نے متاثر کیا' نے مجھے بھی بہت متاثر کیا۔ واقعی یہ ہونا چاہیے ایف بی سوشل پلیٹ فارم پر یہ دیکھنے کو ملتا ہے، بہت سے قلم کار کتاب پڑھ کر اس پر اچھے مضامین ایف بی پر لکھ رہے ہیں، لیکن کسی رسالے میں اس طرح کے مواقع خال خال ہی سامنے آتے ہیں۔ رسائل میں شمولیت کے خواہشمند بھی اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ امید ہے نئے قلم کار اس موقع سے فائدہ اٹھائیں گے۔ دیگر عرق ریزی سے لکھے گئے ادبی مضامین بھی اس رسالے کے معیاری مشمولات کی سند ہیں۔ موضوع سے انصاف کے ساتھ چھان بین کرتے ہوئے رسالے میں شامل مضامین اور نئی معلومات بہم پہنچانے والے تمام قلم کاروں کو شمولیت پر بہت مبارک باد۔

عزہ معین: ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ماہنامہ اردو دنیا ستمبر کا شمارہ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ مجھے بطورِ خاص کنول جعفری، فیضان الحق، شعیب نظام اور صدام حسین مضمر کے مضامین نے متاثر کیا۔ کافی دنوں سے ان تمام پر کوئی مضمون پڑھنے میں نہیں آیا۔ شجاع خاور پر بہت کام کی گنجائش ہے۔ منموہن تلخ اور یگانہ چنگیزی کے درمیان کیا تعلق تھا یہ فیضان الحق کے مضمون سے معلوم ہوا۔ عرفان صدیقی کے بارے میں کم لکھا جاتا ہے۔ گیان چند جین کے بارے میں بہت کچھ پہلے بھی پڑھا ہے لیکن پھر بھی اور پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ شجاع خاور کی غزلیں لڑکپن سے رسالوں میں پڑھتے آئے ہیں۔ شجاع خاور کی شاعری قاری کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ڈاکٹر رؤف خیر صاحب کے خط معلوماتی ہوتے ہیں۔ ایک زمانے تک معراج العاشقین کو خواجہ گیسو دراز کی تصنیف کہہ کر نصابوں میں پڑھایا گیا۔ یہاں تو ابھی بھی یہی بتایا جاتا ہے۔ رؤف خیر صاحب کا شکریہ کہ انھوں نے اس بات کی وضاحت کر دی۔ تمام مضمون نگاروں کو مبارکباد۔

محمد اسرار: شعبۂ اردو، سیٹھ کیسری مل پوروال کالج، کامٹی، ضلع ناگپور، مہاراشٹر

مشتاق احمد وانی

وادیِ چناب میں اردو افسانہ

نثری اصناف میں جس صنف نے اپنے ابتدائی دَور سے تاحال قارئین کی دلچسپی کے ساتھ خاصی مقبولیت حاصل کی ہے وہ افسانہ ہے۔ میری اس بات سے آپ ضرور اتفاق کریں گے کہ اکیسویں صدی کی اس دوسری دہائی میں جہاں انٹرنیٹ اور دیگر سائنسی وتکنیکی سہولیات نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے وہیں قاری سے کتاب کا رشتہ بھی کسی حدتک منقطع ہوچکا ہے۔ کتابیں اشاعت پذیر ہورہی ہیں لیکن انھیں پڑھنے والے اب پہلے کے مقابلے میں کم نظر آرہے ہیں۔ اب ہمیں موبائل فون پر ایک ایسی دنیا دستیاب ہے جو بیسویں صدی کے لوگوں نے نہیں دیکھی تھی۔ ہمیں کیا دیکھنا چاہیے اور کیا نہیں دیکھنا چاہیے یہ شعور قدرتی طور پر ہمارے دل ودماغ میں موجود رہتا ہے۔ مانا کہ سائنسی وتکنیکی ترقی کے باعث ہماری بہت سی الجھنیں، مسائل ومشکلات آسان ہوگئی ہیں لیکن کتاب کی اہمیت، وافادیت اور عظمت پہلے بھی تھی اب بھی ہے اور آگے بھی رہے گی۔

یہ بات باعث مسرت ہے کہ کہانی یا افسانے میں زندہ رہنے کے امکانات موجود ہیں۔ دو ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ناول پڑھنے کے لیے اب ہمارے پاس وقت نہیں رہا لیکن کہانی یا افسانہ قلیل وقت میں ہمیں زندگی کے کسی ایک واقعے، حادثے، تجربے، مشاہدے، فکر، احساس، جذبے، تصور اور آپ بیتی کو جگ بیتی بنادینے کا انداز سکھا دیتے ہیں۔

جب ہم وادیِ چناب (جموں وکشمیر) کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد ضلع ڈوڈہ، ضلع کشتواڑ اور ضلع رام بن کے وہ تمام علاقہ جات شامل ہیں جن کے درمیان دریائے چناب بہتا ہے۔ بھدرواہ اور کشتواڑ کو چھوڑ کر باقی تمام علاقے انتہائی پہاڑی اور ڈروانی صورت حال کو پیش کرتے ہیں۔ وادیِ چناب اپنے مخلوط کلچر، تہذیب، روایات اور مختلف بولیوں کے اعتبار سے اپنی ایک منفرد شناخت رکھتی ہے۔ سائنسی، سیاسی، مذہبی، تعلیمی اور ادبی لحاظ سے یہ وادی نہایت زرخیز رہی ہے۔

وادیِ چناب میں دیگر ادبی وشعری اصناف کے مقابلے میں افسانہ نگاری آٹے میں نمک کے برابر ہوئی ہے۔ جب ہم اس خطے کی تاریخی اور تحقیقی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عشرت کشتواڑی جن کا پورا نام شیخ غلام مصطفےٰ تھا، نے سب سے پہلے افسانے لکھے۔ اس بارے میں ولی محمد اسیر کشتواڑی نے اپنی ضخیم کتاب ''صوبہ جموں کے اردو قلم کار (حصہ اوّل) میں عشرت کشتواڑی کی افسانہ نگاری کے متعلق نرسنگھ داس نرگس کا ایک بیان نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''نرسنگھ داس نے اپنی تصنیف 'پردیسی پریتم' میں عشرت کی افسانہ نگاری کا ان لفظوں میں تذکرہ کیا ہے ''آپ ایک اچھے شاعر اور بہترین افسانہ نگار ہیں۔ انداز بیان دلنشیں اور پرتاثیر ہے۔ قلم برداشتہ لکھتے ہیں اور لکھتے وقت خیالات کا ایک طوفان اُمڈ آتا ہے۔ زبان بڑی میٹھی اور رسیلی ہے۔ آپ کے افسانوں کا پس منظر بھی اگرچہ ترقی پسندی ہے لیکن اس ترقی پسندی میں یہ خوبی ضرور ہے اس سے مخالف وموافق طبیعتیں ایک ساتھ مخلوط ہوسکتی ہیں۔ متوسط طبقے کے خارجی اور داخلی حالات کو ایک اچھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مجھے آپ کا مستقبل بہت روشن دکھائی دے رہا ہے اور آپ کا افسانہ 'تشنہ تکمیل' ادبی دنیا میں بڑے فخر سے پیش کرتا ہوں۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس کے حوالے سے یہ عیاں ہوجاتا ہے کہ عشرت کشتواڑی پہلے شخص ہیں جنھوں نے وادیِ چناب میں سب سے پہلے اردو میں افسانے لکھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا کوئی بھی افسانوی مجموعہ کتابی صورت میں منظر عام پر نہیں آیا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ نرسنگھ داس نرگس نے اپنے دَور میں جموں وکشمیر کے نمائندہ افسانہ نگاروں کے افسانوں کا ایک انتخاب 'پردیسی پریتم' کے نام سے شائع کروایا تھا جس میں عشرت کشتواڑی کا افسانہ 'تشنہ تکمیل' بھی شامل تھا۔

بھدرواہ کی طرف رخ کریں تو یہاں ہمیں 1960 کی دکھائی کے بعد اردو افسانے سے شغف رکھنے والوں میں ملک غلام رسول اور ماسٹر غلام علی کیلو کے نام نظر آتے ہیں جو افسانے لکھتے تھے۔ البتہ ان کے افسانے نہ تو کسی مجموعے کی صورت میں دستیاب ہیں اور نہ ہی کسی اخبار یا

رسالے میں چھپے ہیں۔لیکن یہ بات طے ہے کہ بھدرواہ میں افسانہ نگاری کی ابتدا کا سہرا انھی کے سر بندھتا ہے۔ ان کے بعد بھدرواہ میں جس شخص نے سب سے پہلے اپنے افسانوں کو مجموعے کی صورت میں شائع کروایا وہ طالب حسین رند ہیں۔ان کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ 'سرابوں کا سفر' کے عنوان سے یاسر گولڈن پبلشنگ ہاؤس ڈوڈہ نے 1996 میں شائع کیا تھا۔ جو 124 صفحات پر محیط ہے۔ طالب حسین رند نے اپنے افسانوں میں علامتوں، استعاروں کی بھر مار کے بجائے ایک عام فہم زبان وبیان کا استعمال کر کے اس سماج کی تلخ سچائی کو بے نقاب کیا ہے جس میں وہ سانس لے رہے ہیں۔ولی محمد اسیر کشتواڑی نے طالب حسین رند کے افسانوی مجموعہ 'سرابوں کا سفر' میں شامل پندرہ افسانوں کا موضوعاتی اور فنی اعتبار سے ایک بھر پور جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

'سرابوں کے سفر' کی کہانیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ رند نے اپنی شاعری کی طرح ہی اپنے مشاہدات وتجربات کو صاف، سادہ، شستہ اور عام فہم زبان میں پیش کر کے افسانہ نگاری کا ایک بڑا تخلیقی کام کیا ہے۔ وہ صرف کہانیاں ہی نہیں بنا جانتے بلکہ ارد گرد سے مناسب کردار تلاش کرنے کے فن پر بھی اچھی دسترس رکھتے ہیں۔ چند افسانوں کو چھوڑ کر باقی سب افسانے مختصر افسانوں کے زمرے ہی میں آتے ہیں۔ایک بڑے حساس تخلیق کار ہونے کے ناطے وہ عمدہ سے عمدہ افسانے تحریر کرنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کسی بھی افسانے کی کہانی غیر متوازن، بورنگ اور دور از کار نہیں لگتی۔ مجموعی طور پر رند کے افسانے ہیئتی، فنی اور معنوی اعتبار سے اچھے اور دلچسپ ہیں۔''[2]

'سرابوں کا سفر' کے بعد طالب حسین رند کا افسانوی سفر رک گیا۔اس کی بنیادی وجہ ان کی طبیعت میں شاعری اور مضمون نویسی کی طرف رجحان زیادہ ہوا۔افسانوی دنیا کے لوگ ان کے پہلے مجموعے کی اشاعت کے بعد یہ توقع رکھے ہوئے تھے کہ وہ کچھ اور افسانے تخلیق کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔

طالب حسین رند کے بعد بھدرواہ کی خوب صورت وادی میں جن حضرات نے اپنے جذبات واحساسات، تجربات ومشاہدات اور حالات وواقعات کو افسانے کی صورت میں پیش کیا ان میں مرحوم پروفیسر عبدالرحیم مغل، ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی، مرحوم شاز شرقی، مرحوم عبدالمجید راز، جسونت منہاس، مرحوم علی محمد شاد، مرحوم غلام رسول ملک، ڈاکٹر محمد اقبال زرگر، سعادت علی کیلو، نوین کمار کوتوال، نیک چند کوتوال اور مرحوم ساغر صحرائی کا نام شامل ہے۔ان ناموں میں مرحوم شاز شرقی، جسونت سنگھ منہاس اور ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی کا افسانوی مجموعہ 'چبھن' 2021 میں زیور طباعت سے آراستہ ہوکر قارئین تک پہنچ چکا ہے۔ جہاں تک مرحوم پروفیسر عبدالرحیم مغل کی افسانہ نگاری سے دلچسپی کا تعلق ہے ان کے کچھ افسانے ان کے اپنے زمانے میں گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ کی میگزین 'شاہین' میں شائع ہوئے۔اسی طرح ان کے معاصرین کے چند ایک افسانے کسی مقامی اخبار کی زینت بنے۔ مرحوم ساغر صحرائی بنیادی طور پر ایک شاعر، ڈرامائی اداکار،

جب ہم وادی چناب(جموں وکشمیر) کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد ضلع ڈوڈہ،ضلع کشتواڑ اورضلع رام بن کے وہ تمام علاقہ جات شامل ہیں جن کے درمیان دریائے چناب بہتا ہے بھدرواہ اور کشتواڑ کو چھوڑ کر باقی تمام علاقے انتہائی پہاڑی اور ڈروانی صورت حال کو پیش کرتے ہیں۔ وادیِ چناب اپنے مخلوط کلچر، تہذیب، روایات اور مختلف بولیوں کے اعتبار سے اپنی ایک منفرد شناخت رکھتی ہے۔ سائنسی، سیاسی، مذہبی، تعلیمی اور ادبی لحاظ سے یہ وادی نہایت زرخیز رہی ہے۔

غزل گائکی میں ماہر ہونے کے علاوہ افسانہ نگار بھی تھے۔ ان کے لکھے چند افسانے جنھیں ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوئی ان میں ادھورے سپنے، خوب صورت وادی، بدصورت لوگ، میرے جوتے واپس کرو اور 'میں لٹتی رہی' شامل ہیں۔

مرحوم شاز شرقی کا پورا نام شبیر احمد قاضی تھا لیکن وہ شاز شرقی کے نام سے آخر وقت تک لکھتے رہے۔ان کی حیثیت اردو ادب میں ایک شاعر، مصور، مضمون نگار، بچوں کے ادیب ہونے کے علاوہ ایک افسانہ نگار کی رہی ہے۔ اگر چہ ان کے افسانوں میں طنز ومزاح اور انشائیے کا عنصر غالب نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود کچھ افسانے کہانی پن کے حامل ہیں۔شاز شرقی نے بہت زیادہ افسانے نہیں لکھے، ان کا ایک ہی مجموعہ 'اساطیر اقران' کے نام سے شائع ہوا جس میں ان کے بارہ افسانے شامل ہیں۔ یہ 146 صفحات پر مشتمل ہے۔ان انشائیہ نما افسانوں میں شاز شرقی نے اس سماج کی تصویر پیش کی ہے جہاں جھوٹ، مکاری، غداری، فریب، لالچ، خود غرضی، رشوت خوری اور بہت سی ذہنی خباثتیں پروان چڑھی ہیں۔ان افسانوں یا کہانیوں کا مطالعہ کرنے کے دوران ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ شاز شرقی نے اپنی آنکھوں کے سامنے رقص ابلیس دیکھا ہے۔ان کے کچھ افسانے موضوعاتی اعتبار سے رومانی اور کچھ احساساتی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان افسانوں کے عنوانات ہی سے یہ پتا چل جاتا ہے کہ ان میں مصنف نے کن موضوعات کو افسانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً فرضی پروفیسر، کھیل کھیل میں، انتظار، الجھن، خون کے رشتے اور 'غلط فہمی' ان کا ایک افسانہ 'موت کا ڈر' نصیحت آموز ہے جس میں انھوں نے موت جیسی ابدی سچائی کی طرف ہماری توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم دنیا میں جینے والے لوگ، مذہب، دھرم، ذات پات، فرقہ بندی، مسلک اور مختلف مسائل پر ایک دوسرے سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن موت سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ ہر ذی نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔

بھدرواہ ہی سے تعلق رکھنے والے ایک اور افسانہ نگار جسونت منہاس ہیں جنھوں نے تاحال اپنے پانچ افسانوی مجموعے شائع کروائے ہیں۔ 2002 میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'توجہ' 2006 میں 'مسکراتے ناسور' 2009 میں 'یادیں' 2012 میں 'کم ظرف' اور 2019 میں 'انصاف' شائع ہوا۔ان تمام افسانوی مجموعوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جسونت منہاس ایک حساس طبیعت کے آدمی ہیں جس کے باعث انھوں نے اپنے سماج اور ماحول میں وقوع پذیر کسی واقعے، حادثے اور فکر وخیال کو افسانہ بنانے کی بہتر کوشش کی ہے۔ وہ جموں اینڈ کشمیر فاریسٹ کارپوریشن میں ایک اونچے عہدے سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ان کے موضوعات اگر چہ روایتی ہیں لیکن ان موضوعات کی پیشکش قاری کو ذہنی اکتاہٹ میں مبتلا نہیں کرتی۔ ان افسانوں کی زبان سادہ، صاف اور دلچسپ ہے۔ بیان اور بیانیے کا خیال رکھا گیا ہے۔ کرداروں کی گفتگو اور ان کی حرکات وسکنات پورے کہانی پن کے ساتھ قاری کو ذہنی حظ فراہم کرتی ہے۔ بقول ولی محمد اسیر کشتواڑی:

''ان افسانوں کی کہانیاں پوری طرح ہماری اصلی زندگی کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ کردار بھی جانے پہچانے اور موزوں ہیں۔ مکالمہ نگاری بھی اچھی ہے۔ زبان بہت

ہی سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ چونکہ جسونت منہاس فاریسٹ کارپوریشن کی ملازمت کے سبب قدرتی نظاروں کو قریب سے دیکھتے رہے ہیں۔اس لیے ان کا مشاہدہ اور تجربہ زیادہ وسیع اور وقیع ہے۔''[3]

ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی اردو کے ایک معروف افسانہ نگار ہیں جن کا افسانوی سفر کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ موصوف نے آج تک درجنوں افسانے لکھے جو زیادہ تر روزنامہ کشمیر عظمیٰ، اڑان، لازوال، تعمیل ارشاد، کشمیر ایکسپریس کے علاوہ اور بھی اخبارات میں شائع ہوئے۔ ان کی افسانہ نگاری بتدریج ارتقا پذیر ہے۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'چبھن' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں ان کے 65، افسانے شامل ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی پیشے سے ایک میڈیکل آفیسر سے ترقی کرتے کرتے بالآخر ڈپٹی ڈائریکٹر ہیلتھ جموں سے 2002 میں سبکدوش ہوگئے۔ اردو زبان وادب سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے جراثیم ان کی شخصیت میں موجود ہیں۔ اسی لیے وہ کم وبیش اسی سال کی عمر میں بھی مسلسل افسانے لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی کے بیشتر افسانے مختصر ہوتے ہیں جو زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ مجھے ان کے بیشتر افسانے پسند ہیں البتہ ان کے وہ افسانے جنھوں نے میرے دل ودماغ کو متاثر کیا ہے ان میں یادوں کے مہیب سائے، جان من، بہتان، تنہائی کا آسیب، خواب اور آنسو، جلتا گلاب، پڑیے گر بیمار تو، یادوں کی پتوار، وہ ماں کا آنچل، کچھ دیر تو رک جاتے، ماں، اور 'چبھن' شامل ہیں۔ یہ تمام مختصر افسانے افسانہ نگار کی داخلی خود کلامی سے تعلق رکھتے ہیں۔ افسانہ نگار نے سماج میں جو کچھ دیکھا، سنا اور محسوس کیا ہے اسے بیانیہ انداز میں پیش کر دیا ہے۔ ذاتی تجربے اور مشاہدے کو افسانہ بنانے کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگ بیتی سے زیادہ آپ بیتی ہے۔ لیکن اگر ان افسانوں میں پیش کیے گئے مسائل اور معاملات پر غور کریں تو اس بات کا انکشاف ہوگا کہ یہ مسائل ذاتی ہوتے ہوئے بھی عمومی حیثیت رکھتے ہیں۔ عاصم فریدی عبدالمجید بھدرواہی کے افسانوں کو موضوع بناتے ہوئے ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''ان کے افسانوں میں نفسیاتی میلان کے ساتھ ساتھ رومانیت بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے نفسیاتی افسانے حسن پرستی اور ہوس ناکی کی علامت ہیں۔ وہ کہیں نسوانی کردار کی پاکدامنی اور اعلیٰ ظرفی ظاہر کر کے ہوس پرست کرداروں کو عبرت دلاتے ہوئے راہِ راست کا درس دیتے ہیں۔''[5]

بہرکیف ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی کی مختصر افسانہ نگاری میں ہمیں چھوٹے چھوٹے حالات وواقعات، احساسات وحادثات نظر آتے ہیں جو غور وتدبر کی دعوت دیتے ہیں، ہمیں جھنجھوڑتے ہیں اور اچھے برے کا خیال رکھنے کا درس دیتے ہیں۔

پروفیسر محمد اسداللہ وانی کا تعلق بنیادی طور پر وادی چناب کے ایک پسماندہ اور انتہائی پہاڑی علاقہ مرمت سے ہے اور اب وہ ایک طویل زمانے سے جموں میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کی تعلیم کا آغاز علاقہ مرمت ہی سے ہوا۔ بعد میں دسویں کا امتحان گورنمنٹ ہائی اسکول ملوٹھی سے پاس کیا (جو بھدرواہ سے نزدیک کا علاقہ ہے) بی اے کا امتحان گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ سے پاس کرنے کے بعد 1996 میں جموں یونیورسٹی نے انھیں 'اقبال اور جموں وکشمیر کا اردو ادب' کے موضوع پہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔

پروفیسر محمد اسداللہ وانی کی حیثیت اردو ادب میں ایک معتبر محقق، بے باک نقاد، شاعر اور افسانہ نگار کی ہے۔ ایک طویل زمانے تک وہ اردو کی خدمت درس وتدریس اور تحریر وتقریر کی صورت میں انجام دیتے رہے ہیں۔ ایک محقق، باذوق اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں سرگرم رہنے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ زبان وبیان کی باریکیوں پر خاص دھیان دیتے ہیں۔ جہاں تک ان کی افسانہ نگاری سے دلچسپی کا تعلق ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے 1973 میں جب وہ اردو میں جموں یونیورسٹی کے تحت ایم اے کر رہے تھے اسی دوران پروفیسر منظر اعظمی کی نگرانی میں 'جموں وکشمیر میں اردو افسانہ 1947 کے بعد' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ایم اے اردو کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا تھا۔ ظاہر ہے اس موضوع پر تحقیق کے دوران ان کے مطالعے میں مشہور ومعروف افسانہ نگاروں کے افسانے رہے ہوں گے جس کے باعث افسانے سے ان کی دلچسپی کا بڑھنا لازمی تھا۔ ان کے بہت سے افسانے مختلف روزناموں اور کچھ رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ سماجی نابرابری، انسانی درد وکرب، بے وفائی، ناآسودگی اور وقت وحالات کی ستم ظریفی ان کے افسانوی موضوعات ہیں۔ پروفیسر موصوف آج بھی گاہے بہ گاہے افسانے لکھتے ہیں جو اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ ولی محمد اسیر کشتواڑی ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''تحقیق اور تنقید کے علاوہ پروفیسر وانی کو افسانہ نگاری سے بھی دلچسپی ہے۔ ان کے افسانے عصر حاضر کے حالات اور واقعات کے ترجمان ہیں۔ وہ کہانی لکھنے کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں۔''[6]

لیکن یہ اردو والوں کی محرومی سمجھیے کہ ابھی تک پروفیسر صاحب کا ایک بھی افسانوی مجموعہ کتابی صورت میں قارئین کی نظروں سے نہیں گزرا ہے۔ امید ہے وہ بہت جلد اپنے افسانوی ادب کو کتاب کی صورت میں محفوظ کرنے کی فکر کریں گے۔ ان کے جن افسانوں کو ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی ان میں روشنی، میراث، آخری سہارا، عید کا تحفہ، تعاقب، بڑے صاحب کی حویلی، اظہار کا فالج، ادھورے تاج محل، انتظار کا قیدی، توی نے کہا، تخلیق کا کرب، اوڑھنی، اور ٹھاکر کی گائے شامل ہیں۔

ضلع ڈوڈہ کے صدر مقام ڈوڈہ سے ایک خاتون افسانہ نگار نیلوفر کے نام سے ادبی دنیا میں اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ 'دستک' (2023) لے کر آئی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ نیلوفر ضلع ڈوڈہ کی پہلی خاتون ہیں جو افسانہ نگار کے طور پر سامنے آئی ہیں، اس سے قبل ہمیں کوئی ایسی خاتون نظر نہیں آتی جو افسانے لکھتی رہی ہو یا جس کا کوئی افسانوی مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہوا

ہو۔نیلوفر کی افسانہ نگاری کے بارے میں مشتاق فریدی ایک جگہ لکھتے:

''نیلوفر کو انسانی جذبات وخیالات کو بیان کرنے میں اچھی دسترس ہے۔ان کی زبان وبیان میں تاثیر اور فنی نزاکت ہے جس کی مثال رنجش ہی سہی، دستک، چاہت، کتنے اچھے لوگ پرانے وغیرہ ہیں۔ان کے افسانوں کے عنوانات بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔''

نیلوفر نے اپنے افسانوں میں عورت ذات کے مسائل اور اس کے جذبات واحساسات کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ ایک سنجیدہ خاتون ہونے کے ناطے وہ سماج میں عورت کو ہر طرح سے خود کفیل اور خوشحال دیکھنا چاہتی ہیں۔'دستک' میں شامل افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ نیلوفر کو افسانہ نگاری کے ساتھ خاص دلچسپی ہے۔وہ موضوعاتی اور لسانیاتی اعتبار سے کامیاب نظر آتی ہیں۔کوئی بھی ادیب یا شاعر معراج کمال کو تب پہنچتا ہے جب وہ مسلسل معیاری ادب کا مطالعہ کرتا ہے۔مشق سخن جاری رکھتا ہے،اپنے خیالات،جذبات واحساسات میں پاکیزگی کے ساتھ آفاقیت کا عنصر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور فنی لوازمات کی پابندی کرتا ہے۔نیلوفر کو ابھی بہت دور جانا ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ وہ اپنے قارئین کے دل ودماغ پر دستک دے چکی ہیں۔ضلع ڈوڈہ سے ایک خاتون افسانہ نگار کا پیدا ہونا باعث مسرت ہے۔

کشتواڑ میں عشرت کشتواڑی کے بعد کوئی ایسا افسانہ نگار سامنے نہیں آیا جس نے ریاستی یا ملکی سطح پہ اپنی شناخت قائم کی ہو۔البتہ کچھ نوجوانوں نے اس نثری صنف میں طبع آزمائی کی ہے یعنی ان کے چند افسانے اخبارات میں شائع تو ہوئے لیکن باضابطہ طور پر کوئی مجموعہ سامنے نہیں آیا۔ان میں الطاف کشتواڑی، عبدالرشید فدا، اسلم شہزاد، طارق تمکین، عشاق کشتواڑی، بشیر احمد بشیر اور پرویز ابن طیب شامل ہیں۔

فرید آباد ڈوڈہ میں مشتاق فریدی ایک معتبر نام ہے جو شاعری اور مضمون نویسی کے علاوہ افسانے بھی لکھتے ہیں لیکن ان کا کوئی افسانوی مجموعہ ہماری نظروں سے نہیں گزرا۔ان کے علاوہ سید اللہ شاہ فریدی، فرید احمد فریدی، عاصم فریدی، صلاح الدین، تمنا مشی، صفیہ بیگم اور ڈاکٹر نسیم وغیرہ بھی افسانے سے دلچسپی رکھنے والوں میں شامل ہیں۔

ضلع رام بن میں پوگل پریستان کے علاقے میں جو حضرات اردو افسانے اخبارات میں کبھی کبھار لکھتے رہے ہیں ان میں آنجہانی صورت سنگھ، عبدالرحمٰن رونیال، عبداللطیف اور عبدالخالق شامل ہیں۔گویا یہ وہ لوگ ہیں جو نہ صرف افسانے پڑھتے تھے بلکہ لکھتے بھی تھے۔گول سنگلدان میں بھی افسانے سے دلچسپی رکھنے والوں میں عبدالحمید بٹ اور محمد شفیع میر کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

بانہال جیسی خوب صورت وادی میں جہاں مرحوم پروفیسر مرغوب بانہالی اور منشور بانہالی جیسے قابل لوگ پیدا ہوئے کہ جنھوں نے اپنی علمی، ادبی اور شعری صلاحیتوں کا لوہا نہ صرف ریاستی سطح پر بلکہ بیرون ریاست بھی منوایا تو وہیں بہار احمد بہار بانہالی، ڈاکٹر خالد رسول، بشیر بانہالی اور ظاہر بانہالی جیسے لوگ ہیں کہ جنھوں نے افسانے لکھے ہیں۔ان میں سب سے اہم نام اردو افسانے کے حوالے سے ظاہر بانہالی کا ہے کہ جن کے دو افسانوی مجموعے ادبی حلقوں میں خاصے مقبول ہوئے۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'شیطان پورے کا باغی' (2017) اور دوسرا 'توی کنارے' (2020) زیور طاعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئے۔ظاہر بانہالی نے ان افسانوں میں اپنے ماحول ومعاشرے میں پنپ رہی ان برائیوں کی تصویریں پیش کی ہیں جو ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔بانہال کو یوں بھی کلچر، زبان اور آب وہوا کے اعتبار سے کشمیر ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔اسے گیٹ وے آف کشمیر بھی کہا جاتا ہے۔ظاہر بانہالی کا پہلا افسانوی مجموعہ 'شیطان پورے کا باغی' 97 صفحات پہ مشتمل ہے جس میں بارہ افسانے شامل کیے گئے ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں شیطان پورے کا باغی، چندر بھاگا کی لہروں میں، سسکتے ارمان، بے آواز لاٹھی، ادھورے سپنے، وارث، پیر پنچال کے کوے، کم ذات، کشمکش، ثبوت اور 'کھمبا' مرحوم پروفیسر ظہور الدین نے ان افسانوں پر اپنی رائے ان الفاظ میں تحریر فرمائی ہے:

''دیں گے وہی جو پائیں گے اس زندگی سے ہم''
کے مصداق ظاہر بانہالی نے بھی زندگی سے جو کچھ پایا ہے۔اسے ہم تک پہنچانے کی کوشش کی ہے لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ زندگی کے اس منطقہ میں اس کی کوشش یہ ضرور رہی ہے کہ زہر کا کوئی قطرہ اس کے قارئین تک نہ جائے۔صرف وہ صداقتیں ہی ان تک پہنچیں جو زندگی کی تاریک راہوں کو منور کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔''[8]

ظاہر بانہالی کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'توی کنارے' 144 صفحات پر محیط ہے۔اس میں جو افسانے شامل ہیں ان کے عنوانات پر بھی غور کیجیے توی کنارے، آدھار کارڈ، مطلبی دنیا، فیس بک، کاغذی قتل، جنگل کا پھول، کتا، بدقسمت فائل، بے آواز لاٹھی، روٹھی محبت، ادھورا آدمی، جس کو پالا، بھروسہ، یتیم خانہ، ملاقات، کتے کی دم، تنہائی، ان دیکھا حسن، میکے کی مرغی، چالاکی، ثبوت، انسانی گوشت، اغوا، سایہ، اور 'دھوبی کا کتا' گویا اس مجموعے میں کل 25، افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ان افسانوں کے عنوانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ظاہر بانہالی نے اپنے گردونواح میں یا جن جن لوگوں کے ساتھ ان کی نشست وبرخاست رہی ہے ان کے تلخ وشیریں مزاج کو افسانہ بنادیا ہے۔یہاں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر بانہالی اپنے تجربے اور مشاہدے کو فنی طور پر عوام کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہیں۔بہرحال یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ بانہال سے ظاہر بانہالی کی افسانوی پیشکش بہت اچھی اور متاثر کن ہے۔اگر وہ اسی طرح افسانے لکھتے رہے تو ایک وقت آئے گا کہ وہ جموں وکشمیر کے معتبر افسانہ نگاروں کی صف میں شمار کیے جائیں گے۔

وادی چناب میں اردو افسانے کی صورت حال کوئی تسلی بخش نہیں ہے یعنی شاعری کے مقابلے میں اردو افسانہ نگاری بہت کم ہوئی ہے یا ہورہی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردو کی نوجوان نسل شاعری کی طرف زیادہ مائل ہے کیونکہ شاعری میں ایک دو غزلیں لکھنے کے بعد آدمی شاعر ہوجاتا ہے۔ان غزلوں میں استاد کا کتنا حصہ ہوتا ہے اور شاگرد کا کتنا یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔افسانہ تیار کرنے میں بہت محنت لگتی ہے۔فنی باریکیوں پر دھیان دینا پڑتا ہے۔بار بار سوچنا پڑتا ہے۔قاری کی نفسیات کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے،غرضیکہ موضوعاتی، فنی، لسانی اور اسلوبیاتی اعتبار سے آپ کو اپنے قاری کو متاثر کرنا ہوتا ہے۔اس لیے یہ سب بغیر محنت، کثیر مطالعے، وسیع تجربے ومشاہدے اور ذوق وشوق کے ممکن نہیں ہے۔ یہ بات یاد رکھیے کہ کاغذ یا لیپ ٹاپ پر لکھی ہوئی ہر تحریر ادب نہیں ہوتی۔

حواشی

1 صوبہ جموں کے قلم کار (حصہ اول) مصنف، ولی محمد اسیر کشتواڑی، اقرا پبلشرز بہروٹ راجوری، جموں وکشمیر، 2021، ص 148
2 ایضاً، ص 489-90
3 ایضاً، (حصہ سوم)، 2023، ص 175
4 ایضاً
5 ایضاً، (حصہ دوم)، 2021، ص 160
6 ایضاً، حصہ سوم، 2023، ص 198
7 ایضاً، ص 518
8 ایضاً، ص 263

■

Dr Mushtaq Ahmed Wani
Lane No,3 House No. 7
Firdousabad Sunjwan Jammu.180011
Mobile No:7889952532

سیمانچل میں اردو شاعری

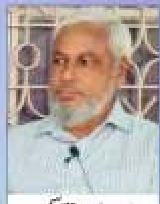

احسان قاسمی

ہمالہ کی ترائی میں بسا، نیپال کی سرحد سے بنگلہ دیش کی سیما تک پھیلا صوبۂ بہار کا شمال مشرقی زرخیز اور مردم خیز علاقہ جو کبھی قدیم پورنیہ ضلع کی حیثیت سے جانا جاتا تھا آج سیمانچل کے نام سے موسوم ہے۔ یہ وہی خطۂ ارض ہے جہاں پانڈوؤں نے اپنے 'اگیات واس' کے دوران راجا بِراٹھ کے دربار میں اپنی شناخت مخفی رکھتے ہوئے ملازمت کی۔ یہ وہی دھرتی ہے جہاں ست یگ میں 'نرسنگھ اوتار' کا مشہور واقعہ پیش آیا تھا اور یہ وہی پورنیہ ہے جہاں بنگالہ کی راجدھانی 'گوڑ' یا 'لکھنوتی' راجا لکشمن سین کے دور میں اپنے عروج پر ہوا کرتی تھی۔ بعدازیں ہمایوں نے شیر شاہ سوری کے تصرف سے نکال کر گوڑ میں اپنے نام کا خطبہ پڑھا اور اس کا نام 'جنت آباد' رکھا۔

سیمانچل کی تاریخ میں اسلامی دورِ حکومت کا آغاز 1200 میں سلطان قطب الدین ایبک کے جنرل اختیارالدین محمد بختیار خلجی کے فتح بنگال سے ہوا۔ مسلم حکمرانوں کے عہدِ حکومت میں اس خطے میں علم و ادب کا چرچا پروان چڑھا۔ حضرت شیخ تقی الدین مہسوی، حضرت شیخ سلیمان سہروردی مہسوی، مخدوم حسین غریب دھکڑ پوش مہسوی، حضرت جلال الدین تبریزی، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی، حضرت مخدوم نور قطب عالم پنڈوی اور حضرت مصطفی جمال الحق وغیرہ صوفیائے کرام نے بھی اس خطے پر بطور خاص توجہ فرمائی۔ ان میں سے کئی صاحبِ تصنیف بھی رہے۔

پورنیہ نے نواب سیف خاں، نواب سعید احمد صولت جنگ اور شوکت جنگ جیسے فوجداروں کی فوجداری میں رہنے کا شرف حاصل کیا ہے جو علم و ادب کی سرپرستی میں ملک گیر شہرت کے حامل رہے ہیں۔ یہ وہ فوجداران ہیں جن کا تذکرہ مربیانِ سخن کے تحت 'شعرالہند' میں آیا ہے۔

سیمانچل کی سب سے قدیم تصنیف 'بدیا دھر' شیخ کفایت اللہ کے ذریعے 1728 میں فوجدار نواب سیف خان کے عہد میں قلمبند کی گئی۔ اس کا رسم الخط قدیم زبان 'کیتھی' کے مماثل ہے۔ اس کی زبان مقامی اور برج بھاشا سے ملتی جلتی ہے، جواب متروک ہے۔

ڈاکٹر عنصری بدر اپنی کتاب 'اردو شاعری کے ارتقا میں قدیم پورنیہ کی خدمات' میں یوں رقمطراز ہیں ''شیخ محمد آزاد بخش ساکن جھالا (پورنیہ نے اسے اردو رسم الخط میں منتقل کیا ہے۔ سب سے پہلے مولوی مقبول حسین پورنوی نے اسے ترتیب دے کر چھپوانا چاہا لیکن وہ کرنہ سکے۔ 1938 میں مولوی محبوب الرحمٰن کے محبوب عالم پریس کشن گنج، پورنیہ سے اسے شائع کیا۔''

ڈاکٹر قمر شاداں نے اس کا مکمل ہندی ترجمہ کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ یہ مثنوی ملک محمد جائسی کی 'پدماوت' کے طرز پر قلمبند کی گئی ہے۔ اس میں ہندو مسلم اتحاد اور صوفیانہ تعلیم کے علاوہ عشقیہ داستان اور دوا دارو وغیرہ بہت کچھ موجود ہے۔ بطور نمونہ کلام چند اشعار پیش ہیں۔

بدیا بہت پڑھا من جانی　　کتھا کہو جو رہے نسانی
خلاف پیغمبر کے رہ گزید　　کہ ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید
کنیا روپ سنا جب راجا　　پریم ان کو رہیا میں جاگا
تروتا سامی ہم ابلہ　　تھر تھر کانپے انگا

سیمانچل کی دھرتی پر جنم لینے والوں میں ایسی کئی مشہور و معروف ہستیاں ہیں جنھوں نے عالمی ادب کو اپنی لازوال تخلیقات سے مالا مال کیا ہے۔ بنگلہ زبان کے پدم بھوشن شری بولائی چاند مکھوپادھیائے عرف بن پھول (پ 19 جولائی 1899 - 09 فروری 1978) اور اولین رابندر پُرسکار سے نوازے گئے مشہور بنگلہ ناولز 'جاگوری' اور 'ڈھورائی چرت مانس' کے خالق شری ستی ناتھ بھادری (پ 27 ستمبر 1906 - ر 30 مارچ 1965) کو بھلا کون بھول سکتا ہے؟ اسی طرح ہندی زبان میں 'میلا آنچل' ناول کے عالمی شہرت یافتہ تخلیق کار پدم شری شری پھنیشور ناتھ رینو (پ 04 مارچ 1921 - ر 11 اپریل 1977) کو بھی یقیناً فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں آخری نواب محمد علی خان کو معزول کر 14 فروری 1770 کو پورنیہ ضلع کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے پہلے سپروائزر کلکٹر تھے مسٹر جارج گستاوس ڈوکاریل (George Gustous Ducarrel) اس طرح قدیم پورنیہ ہندوستان کے قدیم ترین ضلعوں میں سے ایک ہے۔ لیکن اس کی بدقسمتی یہ رہی کہ اکثر یہ ضلع کتر بیونت کا شکار ہوتا رہا۔

1813 میں پورنیہ، دیناج پور اور راج شاہی ضلعوں کے بڑے حصص کو یکجا کر ایک نئے ضلع 'مالدہ' (بنگال) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ آزادی کے بعد State re-organization act 1956 کے تحت 1898 مربع کیلومیٹر اسلام پور سب ڈویژن کا علاقہ مغربی بنگال میں شامل کر دیا گیا۔ اسلام پور سب ڈویژن میں اردو لکھنے پڑھنے والوں کی بڑی آبادی واس کرتی ہے۔ یہ علاقہ اب سیاسی طور پر ضرور صوبۂ بنگال کا حصہ بن چکا ہے لیکن جغرافیائی، ماحولیاتی، لسانی، تہذیبی

اور ثقافتی طور پر آج بھی سیمانچل کا اٹوٹ حصہ ہے۔ 1973 میں باقی ماندہ پورنیہ کے کٹیہار سب ڈویژن کو سب سے پہلے اور پھر 1990 میں کشن گنج اور ارریہ سب ڈویژنوں کو بھی ضلع کا درجہ حاصل ہوا۔

اس طرح پورنیہ، کٹیہار، ارریہ، کشن گنج ضلعوں اور اسلام پور سب ڈویژن (ضلع اتر دیناج پور، مغربی بنگال) کو ملا کر عرف عام میں 'سیمانچل' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

'کلیاتِ عزیزی' اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو زبان میں سیمانچل کی پہلی مطبوعہ کتاب ہے جس کے شاعر عبدالعزیز ولد الحاج منصف فرید بخش ساکن پلاس منی ضلع کشن گنج ہیں۔ اس شعری مجموعے کا سال اشاعت 1314ھ بمطابق 1896 ہے۔ تقریباً پوری کتاب فارسی زبان میں ہے لیکن آخر میں چند اوراق غزلیاتِ اردو پر بھی مشتمل ہیں۔

سیمانچل میں یہ اردو شاعری کا ابتدائی دور کہا جا سکتا ہے کیونکہ اُس زمانے میں فارسی شاعری کا بول بالا تھا اور اردو میں شاعری کم کم کی جاتی تھی۔ اردو زبان میں اگر شاعری کی بھی جاتی تھی تو اس پر فارسی کا خاصا غلبہ رہا کرتا تھا۔

سیمانچل میں اردو شاعری کے کئی ادوار گزر چکے ہیں۔ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے یہاں مختلف ادوار سے تعلق رکھنے والے چند قابلِ ذکر شعرا کا مختصر تذکرہ قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

(الف) فوجدارانِ پورنیہ کا عہد: فوجداروں کے عہد حکومت کے دوران پورنیہ کا گہرا تعلق بنگال اور عظیم آباد سے رہا۔ اسفند یار خاں، بہمن یار خاں، سیف علی خاں، صولت جنگ، شوکت جنگ اور میر قاسم وغیرہ پورنیہ کے مشہور فوجداران رہے۔ ان کے دربار میں علما، شعرا و ادبا کی نشست رہا کرتی تھی۔ جہانگیر نگر (ڈھاکہ)، مرشد آباد، عظیم آباد اور پورنیہ کے درمیان شعرا کی آمد و رفت کا سلسلہ قائم تھا۔ خصوصاً سعید احمد خاں صولت جنگ جو نواب بنگالہ علی وردی خاں کے بھتیجے اور داماد تھے، پہلے انھیں 1749 میں بہار کا نائب حکمراں مقرر کیا گیا تھا لیکن سراج الدولہ کو یہ تقرری پسند نہ آئی۔ علی وردی خاں نے اپنے چہیتے سراج الدولہ کو یہ جگہ دی اور صولت جنگ کو پورنیہ کی فوجداری۔ پورنیہ کا فوجدار بننے کے بعد صولت جنگ نے اپنی تمام بے راہ روی ترک کر دی اور نہایت کامیاب فوجدار ثابت ہوا۔

غلام حسین طباطبائی مصنف 'سیر المتاخرین' اس کے خصوصی مصاحبین میں سے تھا۔ اسے پرگنہ سری پور کی زمینداری حاصل تھی۔ اس کا قیام پورنیہ میں سات سال رہا، اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ''نواب صولت جنگ صبح اٹھ کر فجر کی نماز سے فارغ ہو کر دربار میں آ بیٹھتا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد بھی وہ مصاحبین کے ساتھ بیٹھا کرتا جس میں علما مثلاً ملا غلام یحییٰ بہاری، مفتی ضیاء اللہ، میر توحید، مولوی لال محمد، شیخ ہدایت اللہ اور سید عبدالہادی وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ دیگر رفقا مثلاً سیف علی خاں برادر سیف خاں، تقی علی خاں برادر غلام حسین، امیر علی خاں وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ 1756 میں صولت جنگ کا انتقال ہو گیا۔

اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا شوکت جنگ پورنیہ کا فوجدار مقرر ہوا۔

1. میر محمد باقر حزیں جنھیں سودا نے اکابر شعرا کے ساتھ شمار کیا ہے صولت جنگ کے دربار سے منسلک تھے۔ تذکرۂ شورش کے مرتب محمود الٰہی نے لکھا ہے کہ ''دہلی سے روانہ ہونے کے بعد میر باقر حزیں کو شعر و شاعری کی خدمت کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ وہ اس کے بعد پندرہ سال سے زیادہ زندہ نہیں رہے اور اس مدت میں بھی انھیں عظیم آباد میں جم کر رہنا ممکن نہیں ہوا۔ انھیں ڈھاکہ اور پورنیہ میں قیام کرنا پڑا۔''

ان کے بارے میں مزید لکھا ہے کہ ''وہ نواب صولت جنگ کے ہمراہ میر محمد وحید صاحب قبلہ کے وسیلے سے پورنیہ چلے گئے اور وہاں انتقال کیا۔ حضرت شاہ مصطفیٰ، جمال الحق قدس سرہ کے روضہ میں چبوترے کے نیچے مدفون ہوئے۔''

میر باقر حزیں کے بارے میں شورش نے لکھا ہے کہ ''ریختہ کو سب سے پہلے بہار میں رائج کرنے والے حزیں ہی تھے۔''

میر باقر حزیں کا تخلص ظہور بھی تھا۔ مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ پروفیسر سید شاہ حسین احمد نے اپنی کتاب 'بہار میں اردو شاعری 1887 تک' میں سال وفات 65-1164ھ درج کیا ہے۔

نمونۂ کلام مختلف تذکروں میں ملتا ہے۔ طوالت کے مدِ نظر محض دو اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

اس بے وفا کے عشق میں کچھ مجھ کو حس نہیں
پاؤں تلک بھی ہائے مرا دست رس نہیں
کیا کیا گزرتی ہوگی دلوں پر قفس کے بیچ
ان بلبلوں کا وائے کوئی دادرس نہیں

2. خواجہ احمدی خاں راسخ، دہلی نژاد تھے جو 1757 سے 1760 کے درمیان سید خادم حسین خاں فوجدار کے زمانے میں مرزا جھبو کی وساطت سے پورنیہ آئے تھے۔ خواجہ محمدی خاں کے سوتیلے بھائی تھے۔ ان کا صرف ایک شعر دستیاب ہے۔

خانہ خراب حلقہ میں اس کے ہوئے ہیں جمع
ابرو کماں کے ملنے سے تب میں کشیدہ ہوں

3. میر مستقیم جرات کا ذکر میر حسن اور عشقی نے اپنے تذکروں میں کیا ہے۔ سید زادے تھے اور درویشانہ طبیعت کے حامل تھے۔ بقول عشقی ''مردے درویش صورت، نیک سیرت، صاحب جرأت در عہد محمد شاہ بود۔ طبع کریم و مزاج مستقیم داشت۔ از بعض تذکرہا بہ وضوح پیوست کہ بسمت پورنیہ ترک لباس کردہ بطاعت ایزدی می گزارید۔''

ان کا ایک مشہور شعر پیش ہے۔

ہر بن مو سے مرے شعلہ نمایاں کر دے
دل تو جلتا ہے بس اب سرو چراغاں کر دے

4. سلامت علی سلامت کا ذکر تذکرۂ شورش میں موجود ہے۔ پورنیہ کے عملہ پرگنہ ارول سرکار کے رہنے والے تھے۔ ان کے صرف دو اشعار دستیاب ہیں۔

تجھ ہاتھ سے کس کس کے لیے روئے ظالم
سینہ میں نہ دل ہی ہے نہ جی ہے نہ جگر ہے
کعبہ کو چلوں شیخ تیرے ساتھ میں کیوں کر
پھر ان دنوں دلدار کے کوچے میں گزر ہے

5. میر محمد رضا جرأت کا بھی ذکر تذکرۂ شورش میں موجود ہے ''شاعر اہل مروت و فتوت میر محمد رضا جرأت شاعر فارسی ولد سید محمد وحید تخلص مخاطب بجناب سید صدرالدین منصب دار شاہی صاحب جاگیر۔ در علم ظاہر فاضل جید و منشی و متعدی و سپاہی و سخی و شجاع و شوخ.... در پورنیہ جاں بہ جاناں داد نماز جنازہ حضرت پیر دستگیر قمر الحق خواندہ.... میر ہادی تاریخ وفات سید محمد رضا گفتہ....''

جرأت شورش کے ماموں زاد تھے۔ بیشتر کلام فارسی میں ہے لیکن ریختہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ بطور نمونہ کلام ایک شعر پیش ہے۔

نہ پایا کوئی بلبل نے گلوں سے مہرباں اپنا
کیا اس واسطے جا گرم گلخن میں مکاں اپنا

6. مرزا ندیم ندیم کو علی قلی خاں کا خطاب حاصل تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ پہلے عظیم آباد وارد ہوئے۔ تذکرہ نگار شورش عظیم آبادی سے وہیں شناسائی ہوئی تھی۔ شورش کے مطابق وہ شوکت جنگ کے دربار سے منسلک ہو گئے تھے لیکن عشقی کے مطابق میر جعفر کی سرکار سے متعلق ہوئے اور وہیں پورنیہ میں جاں بحق ہوئے۔

آپ زیادہ تر فارسی میں مرثیہ کہا کرتے تھے۔ شاداں فاروقی نے بزم شمال میں نو اشعار نقل کیے ہیں۔

گلشن میں جوشِ گل سے قیامت لگی ہے آگ
بلبل جلیں نہ تیرے پر و بال دیکھنا

ایک یار نے زروئے نصیحت کہا ندیم
کب تک تجھے بتوں کا خط و خال دیکھنا

7. شیخ غلام علی عشرت، شیخ غلام علی بنگالی کے نام سے بھی مشہور تھے۔ انھوں نے 'جنگ نامہ' لکھا ہے۔ شیخ لطف اللہ عظیم آبادی کے فرزند تھے جن کی وفات کے بعد خادم حسین خاں کے رسالے میں ملازم ہو گئے۔ تذکرۂ شورش میں لکھا ہے کہ "آخر میں پورنیہ میں تھے کہ مزاج میں وحشت سما اور صحرا کی راہ لی۔" 1785 تک باحیات تھے۔ تذکرۂ شورش میں ان کا درج ذیل شعر شامل ہے۔

تھا نظر بند تو کرتا تھا کبھی پھر اول
پائے زنجیر ہوا ہائے کہیں میرا دل

8. سرمست خان افغان مست، اصالت خاں ثابت کے بھتیجے یا بھانجے تھے۔ عشقی کے شاگرد تھے۔ قیام زیادہ تر پورنیہ میں رہتا تھا۔ 1785 تک بہ قید حیات تھے۔ نمونہ کلام۔

نہ وہ بانکوں میں گنا جائے نہ ٹیڑھوں میں یہ کیوں
خانہ جنگی تمھیں رہتی ہے سدامست کے ساتھ

9. ہیبت قلی خاں حسرت۔ نواب شوکت جنگ کے داروغہ دیوان تھے۔ یہ اتنے اہم شاعر تھے کہ حسرت موہانی نے ان کا انتخاب شائع کیا اور اسما سعیدی نے ان کا دیوان مرتب کیا۔ ہیبت قلی خاں کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ "حسرت میر باقر کے ہمراہ پورنیہ چلے گئے اور وہاں نواب شوکت جنگ بہادر کے دیوان خانہ کے داروغہ ہو گئے۔ اس کے بعد میر باقر کی بہن سے منسوب ہوئے۔"

تذکرۂ شورش کے مطابق "عظیم آباد میں انھوں نے ہی سب سے پہلے ریختہ کی بنیاد رکھی۔"

10. میر غلام حسین شورش ولد میر محسن وطن عظیم آباد تھا۔ پروفیسر شاہ حسین احمد اپنی کتاب 'بہار میں اردو شاعری 1857 تک' میں لکھتے ہیں کہ "شورش کا پورنیہ جانا ثابت ہے۔ شورش اپنے تذکرہ (تذکرۂ شورش) میں رنگیں کے ترجمہ میں لکھتے ہیں: در پورنیہ دیوان او بنظر آمدہ بود۔"

مزید لکھتے ہیں کہ "یہ بات قرین قیاس ہے کہ وہ اپنے ماموں ملا وحید اور ماموں زاد بھائی میر محمد رضا جرأت کے ہمراہ پورنیہ گئے ہوں گے، پورنیہ میں ان کے قیام کا زمانہ 1162ھ سے 1167ھ تک مانا جا سکتا ہے۔"

شورش میر باقر حزیں کے شاگرد تھے۔ حزیں کے انتقال کے بعد شاہ رکن الدین عشق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ دوران قیام پورنیہ انھوں نے دو مثنویاں 'درد و الم' اور 'باغ و بہار' لکھی تھیں۔

شورش کا انتقال بقول ابوالحسن شعبان 1195ھ میں ہوا۔ نمونہ کلام۔

داغ دل کی بہار تجھ سے ہے
یہ چمن لالہ زار تجھ سے ہے
عاشقی اور چیز ہے شورش
دل سے سب ننگ و عار کھوتی ہے
ہم نے اس بینشاں کا آج نشاں
اس دل بے نیاز میں پایا

(ب) فوجداران کے بعد کا دوسرا دور:

(1) اس دور میں بھگوان دین تائب سرفہرست ہیں جو ارریہ کے باشندہ اور منشی شنکر لال صبا کے شاگرد تھے۔ صاحب تاریخ شعرائے بہار کے مطابق 1854 میں باون برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ 'خمخانہ جاوید' کے مؤلف نے 'گلدستۂ شعراء' کے حوالے سے دو غزلیں پیش کی ہیں۔

غضب ہے یار ترے پھول سے بدن کی بہار
بنائے گی ہمیں دیوانہ اس چمن کی بہار
ٹکڑے ہیں دامن نہ گریباں کے
خوب وحشت کے ہاتھ چلتے ہیں

(2) حضرت شوق نیموی کے شاگردوں میں تفسیر پورنیوی تھے جن کا نام منشی معیذ الدین تھا۔ 'تذکرہ مسلم شعرائے بہار' اور 'یادگار وطن' میں ان کا ذکر ہے۔ شوق نیموی نے اپنے شاگردوں کی فہرست میں ان کا نام شامل کیا ہے۔

رنج و غم اپنا کوئی کیا جانے
درد دل درد آشنا جانے

(3) تسطیر پورنیوی، اصل نام منشی امیر الدین تھا اور عالم گنج شہر پورنیہ کے رہنے والے تھے۔ شوق نیموی نے اپنے تذکرہ 'یادگار وطن' میں ان کی شاگردی کا ذکر کیا ہے۔ اکمل یزدانی جامعی نے اپنی کتاب 'پورنیہ پر فوجداروں کی حکومت' میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔

کوچۂ عشق میں چلنے کا ارادہ پھر ہے
خیر ہے حضرت دل! آپ یہ کیا کرتے ہیں

(4) حکیم محمد عسکری سالم لکھنوی ثم پورنیوی ناسخ کے شاگردوں میں سے تھے۔ 1857 کے غدر کے ایک سال بعد عظیم آباد اور پھر آرہ چلے گئے۔ آرہ سے پورنیہ آئے اور 1872 میں یہیں انتقال فرمایا۔ مرثیہ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

خاک میں بھی داغ فرقت نے حرارت خوب کی
کاہ آتش دیدہ سے تربت پہ صورت ڈوب کی

(5) امیر بیگم امیر پورنیہ کی مشہور طوائف تھیں۔ 'تذکرۂ نسواں ہند' کے مطابق 1892 تک باحیات تھیں۔ 'تذکرہ شمیم سخن' مؤلفہ صفا بدایونی کے حوالے سے ان کے دو اشعار نقل کیے گئے ہیں۔

عرصہ محفل میں اس کا قرب بھی مل جائے گا
اپنی جا ہم ڈھونڈ لیں گے صاحب محفل کے پاس

(6) گلاب جان گلاب سیف گنج (کٹیہار) کی پیشہ ور طوائف تھیں۔ کوئی غیر معروف شاعر حبیب نامی ان کے کلام پر اصلاح دیا کرتے تھے۔ 1910 تک باحیات تھیں۔ 'پیام یار' لکھنؤ جون 1904 کے شمارے سے شاداں فاروقی نے ان کی طرحی غزل نقل کی ہے۔

جان من تم کو پیار کرتے ہیں
دل تمھیں پر نثار کرتے ہیں

(7) پرتھوی چند صبا۔ پورنیہ کے مشہور رئیس تھے۔ اصل نام پرتھوی چند لال تھا۔ عوامی طور پر راجا پلی لال کے نام سے شہرت تھی۔ حضرت شوق نیموی کے شاگرد تھے۔ شعر و شاعری سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ 'تذکرہ ہندو شعراء' میں آپ کا تذکرہ موجود ہے۔

عشق لیلیٰ کا اگر قیس کو کامل ہوتا
مانع دید نہ کچھ پردۂ محمل ہوتا

(8) راجا پدمانند سنگھ افسر (1910-1854) بنیلی اسٹیٹ کے مالک تھے۔ فارسی، اردو، ہندی، بنگلہ اور انگریزی زبانوں کے اچھے جانکار تھے۔ شعر و سخن سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے ہندی کے علاوہ اردو میں بھی شاعری کی ہے۔

قدرداں ہم ہیں ہمیں آکے سنگھاؤ صاحب
مفت کیوں کرتے ہو تم زلف کی نکہت برباد

(9) مولوی عبدالعزیز عزیز، ان کے والد فرید بخش ساکن پلامنی، حالیہ ضلع کشن گنج تھے جو کہ انگریزی حکومت کے دوران منصف کے عہدے پر فائز تھے۔ عبدالعزیز نے 1888 میں پورنیہ ضلع اسکول سے انٹرنس پاس کیا اور پورنیہ سٹی مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ بعد ازاں 1892 میں مختاری کا امتحان پاس کیا اور عدالت میں مختاری کرنے لگے۔ محض تیس سال کی عمر میں 1902 میں انتقال فرمایا۔ فارسی اور اردو زبان پر دسترس حاصل تھی۔ فارسی اور اردو غزلیات پر مشتمل 'کلیات عزیزی' 1314ھ (1896) میں شائع ہوا جو غالباً سیمانچل کا سب سے پہلا مطبوعہ شعری مجموعہ ہے۔ رکن الدین دانا سہرامی ندوی نے 'تحفۂ احسان' مطبوعہ 1940 میں پانچ اشعار کی ایک نعتیہ غزل شامل کی ہے۔

مجھے اپنا جلوہ دکھاؤ محمد
مجھے عطر گیسو سونگھاؤ محمد

(10) مولانا حفیظ الدین لطیفی رحمان پوری (پ 1245ھ - ر 1333ھ) والد بزرگوار شیخ حسین علی موضع چشتی نگر کمہریا، حالیہ ضلع کٹیہار کے زمیندار تھے۔ مولانا حفیظ الدین لطیفی نے پٹنہ اور دہلی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ پٹنہ

مٹن گھاٹ حضرت خواجہ رکن الدین عشق کی خانقاہ میں تشریف لائے اور صاحب سجادہ حضرت لطف علی قدس سرہ کے دست حق پرست پر بیعت طریقت فرمائی اور تخلص 'لطفی' اختیار فرمایا۔ آپ مدرسہ خانقاہ سہسرام کے صدر مدرس مقرر ہوئے، بعد ازاں کٹیہار لوٹ آئے اور رحمان پور میں خانقاہ قائم کی۔ آپ عربی، فارسی اور اردو زبان میں کلام فرماتے تھے۔ آپ کی رحلت کے پانچ سال بعد آپ کے شاگرد اور خلیفہ مولانا محمد عابد چنڈی پوری نے 1338ھ میں 'دیوانِ لطفی' مرتب کر کے شائع کیا۔

کس کس ادا و ناز پر تیرے بھلا کوئی مرے
جادو نگاہ ہے، کج کلاہ ہے، خوش لقا، خوش منظرے
بلبل نہیں پروانہ ہوں اس شمع رو سے پر مرے
ہاں اے لطفی سوختہ شد، گشتم اکنو بے پرے

(11) مولانا شرف الدین شرف حفیظی، مولانا حفیظ الدین لطفی کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ پیدائش 1875 کے آس پاس ہوئی اور 1949 میں رحلت فرمایا۔ کشن گنج کے گاگی میں ان کا مزار ہے۔ ایک شعری مجموعہ 'دیوان حفیظی' یادگار ہے جس میں فارسی کی 26 اور اردو کی 20 غزلیں شامل ہیں۔

تمھاری راہِ طلب میں ہم نے کیا ہے دل میں یہ عہد صادق
جفا کے بدلے وفا کریں گے ستم کے بدلے کرم کریں گے

(12) تہذیب احمد غافل، پناس حالیہ ضلع کشن گنج کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق تھا۔ آپ کی ولادت 1897 میں ہوئی اور 1972 میں انتقال فرمایا۔ پہلا شعری مجموعہ 'نیل و فرات' 1953 اور دوسرا 'بادۂ عرفان' نامی 1961 میں شائع ہوا۔

جمالِ حسن نے آنکھوں میں کر دیا جادو
کمالِ عشق دکھانا تھا پر دکھا نہ سکا

(13) محمد سلیمان سلیماں (پ: 1900 ر: 1975) منصف فرید بخش، پلاسمنی کے پوتے اور عبدالعزیز عزیز کے بھتیجے تھے۔ کشن گنج عدالت میں وکالت کرتے تھے۔ 1915 میں جبکہ چوتھی جماعت کے طالب علم تھے 'گلبن فصاحت' کے عنوان سے شعرائے پلاسمنی کے فارسی کلام کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا جس میں ان کی بھی دو غزلیں شامل تھیں۔ ایک مثنوی 'حسنہ و سیاہ فام' 1921 میں شائع ہوئی تھی۔ ان کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب ان کے شاگرد اکمل یزدانی جامعی نے 'نوائے نے' کے عنوان سے 1952 میں شائع کیا۔

خوش نوائی کی سلیمان کی سنی ہے شہرت
آؤ دیکھیں کہ خیالات میں رفعت کیا ہے

(14) حکیم رکن الدین دانا سہسرامی، سہسرام کے محلہ شاہ جمعہ میں 1305ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد سرزمین عرب سے تعلق رکھتے تھے۔ پیشے سے حکیم تھے اور شاعری کا شوق رکھتے تھے۔ کشن گنج اور گرد و نواح میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کھگڑا میلہ میں مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ 1940 میں منعقد ہونے والے میلہ مشاعرہ کی روداد 'تحفۂ احسان' (تذکرہ و تاریخ شعرائے پورنیہ) کے نام سے شائع کیا جس میں اس زمانے کے 28 شعراء کرام کا تفصیلی تذکرہ اور نمونہ کلام موجود ہے۔

نہ کر دے مجھ کو بھی خانہ خراب میلے کا
بہار میلے کی، رنگِ شباب میلے کا
سنا ہے حضرتِ دانا بھی پیتے کھاتے ہیں
شراب میلے کی، شامی کباب میلے کا

(15) مولانا عیسیٰ فرتاب، پیدائش بدھیسری رام پور حالیہ ضلع ارریہ میں محمد موسیٰ کے گھر 2 فروری 1911 کو ہوئی تھی۔ فارغ دیوبند اور مولانا حسین احمد مدنی کے مرید تھے۔ نظم کے شاعر تھے اور کلام پر اقبال کا گہرا رنگ تھا۔ غزلیں بھی خوب کہتے تھے۔ فارسی کلام کا مجموعہ 'بوستاں برائے دوستاں' 1958 میں شائع ہوا تھا۔ اردو شاعری کے دو مجموعے بالترتیب 'ارمغانِ سخن' 1932 اور 'رنگ و بو' 1940 میں منظر عام پر آئے۔

ہے سراپا نالہ بن جانے کی تجھ کو آرزو
نقش تیرے دل میں ہے اقبال کی تلقین کا

(16) مولانا یوسف رشیدی ہری پوری، مولانا کی شہرت کی اصل وجہ یوں تو ان کی 'احسن التواریخ' یعنی تاریخ پورنیہ نامی کتاب ہے جو 1938 میں شائع ہوئی تھی جسے پورنیہ کی تاریخ کے حوالے سے مستند کتاب گردانا جاتا ہے۔ وہ شاعر بھی اعلیٰ درجے کے تھے، خصوصاً نعت گوئی میں ملکہ حاصل تھا۔

فروغ شمع روئے مصطفیٰ سے ہے جہاں روشن
سمک روشن، سماوٗ روشن، زمیں روشن، زباں روشن

(17) قاضی نجم ہری پوری (پ: 1901-ر: 1949) اصل نام قاضی نجم الدین احمد تھا۔ نجم اور رسوا تخلص تھا۔ پیشہ کاشتکاری اور درس و تدریس تھا۔ حافظ حامد حسین علوی، اعظم گڑھ سے بیعت حاصل تھی۔ فارسی زبان میں شاعری کرتے تھے لیکن 1938 سے باقاعدہ اردو شاعری کی جانب بھی توجہ کی۔ ان کے پڑپوتے محمد رضوان ندوی نے ان کا کلام 'ارمغانِ قاضی نجم ہری پوری' 2013 اور 'غنچۂ عشق' 2019 میں ترتیب دے کر شائع کیا۔

آدمی وہ کیا جو تجھ پر جان سے مائل نہ ہو
دل وہ کیا جو خنجرِ غم کا ترے گھائل نہ ہو

(18) قاضی جلال ہری پوری (پ: 1921-ر: 1997) قاضی نجم ہری پوری کے بھتیجے تھے۔ پیشہ درس و تدریس تھا۔ سولہ سترہ سال کی عمر سے شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں نظمیں اور غزلیں کہا کرتے تھے۔ ان کے کلام کو بھی ترتیب دے کر محمد رضوان ندوی نے شائع کیا ہے 'کلام قاضی جلال ہری پوری' 2008 اور 'باقیاتِ قاضی جلال ہری پوری' 2017 میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئیں۔

ہیں میرے ناشاد دل میں سیکڑوں ارماں بھرے
دل کو اپنے دل کہوں یا شوق کی دنیا کہوں

(19) ظہور الحسن حسن (پ: 1899-ر: 1975) کمل داہا، ارریہ کے زمیندار خاندان سے تعلق تھا۔ پیشے سے مختار تھے۔ 1923 سے شعر گوئی کی ابتدا کی۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے فرزند زبیر الحسن غافل ایڈیشنل سیشن جج نے آپ کا مجموعۂ نظم و غزل 'صحرا بھی سمندر بھی' 2013 میں شائع کیا۔

میں کھیلتا ہوں گود میں موجوں کے رات دن
منت کش کنارۂ ساحل نہیں ہوا

(20) مولوی عبدالوحید ثاقب نعمانی (پ: 1919-ر: 1989) جوگندر، ارریہ کے رہنے والے تھے۔ پیشہ کاشتکاری اور درس و تدریس تھا۔ اس کے علاوہ ماہر فن کتابت اور خطاطی بھی تھے۔ اوائل عمری سے نظمیں اور غزلیں کہنے لگے تھے۔ اقبال سے متاثر تھے۔ 1970 میں مجموعۂ کلام 'رختِ سفر' شائع کیا۔ ان کے انتقال کے بعد 1983 میں ان کے صاحبزادے طارق بن ثاقب نے اسے دوبارہ شائع کیا۔

نہیں میں خوگرِ منزل ازل سے ہوں آزاد
سفر میں زندگی اپنی گزار دی میں نے

(21) مظہر القیوم مظہر (پ: 1912، ر: 2008) کمل داہا، ارریہ کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق تھا۔ 1950 سے رسل ہائی اسکول، بہادر گنج میں معلم رہے۔ دوران ملازمت پٹنہ یونیورسٹی سے فارسی زبان میں ایم اے کیا۔ ابتدائی عمر سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ منشی نور محمد سہسرامی ان کے استاد تھے۔ تقریباً تمام اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی لیکن نظموں کے کامیاب شاعر تھے۔ 2003 میں مجموعۂ کلام 'خیمۂ گل' زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔

یہ ہر موسم میں پھلتی پھولتی ہے
محبت کا کوئی موسم نہیں ہے

(22) وفا ملک پوری (پ: 1922-ر: 2003) اصل نام سید عباس حسین تھا۔ ملک پور، دربھنگہ میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ

سے فاضل کی سند حاصل کی اور پورنیہ سٹی مڈل اسکول میں ہیڈ مولوی بحال ہوئے۔ 1952 میں پورنیہ سے 'صبح نو' رسالہ شائع کیا جسے 59 سے پٹنہ سے شائع کرنے لگے۔ آخری دور پورنیہ میں گزرا اور یہیں دفن ہوئے۔ غزل گو شاعر تھے اور آواز میں ترنم تھا۔ اکثر آل انڈیا مشاعروں میں شرکت رہتی تھی۔ 'شاہراہ وفا' اعز انظموں کا مجموعہ ہے۔ شعری مجموعہ 'حرف وفا' 1988 میں شائع ہوا۔

یہ سچ ہے وفا نام ہمارا ہے عزیزو
یہ سچ ہے کہ تقصیر وفا ہم سے ہوئی ہے

اسی دور میں منشی مراد حسین یتیم کھپراوی، تمنا دلشاد پوری، مشتاق دلشاد پوری، اشہد اللہ اشہد، سید عظیم الدین احمد عظیم مونگیری، مہتر علی صبا، سید ابوالقاسم اختر، حکیم سید آغا علی اختر، محبوب الرحمٰن محبوب، محبوب الرحمٰن کامل پناسوی (اکمل یزدانی) وغیرہ نے سیمانچل کی اردو شاعری میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔

(ج) مذکورہ دور کے آخر میں شمس بمن گرامی (جلتے خیموں کی چیخ)، شمس جمال (سپنوں کا سمندر (2005)، شمس جلیلی (مکاں سے لامکاں تک 2010، شاہنامۂ سیمانچل 2018)، حکیم مظفر حسین بلگرامی، احمد حسین قیصر پورنوی، مولوی الیاس احمد صدیقی الیاس، حکیم بشیر احمد بشیر، مولوی محمد اسمٰعیل ندیم، حافظ مظفر حسین مظفر، پروفیسر طارق جمیلی (جذبِ دروں 2009)، صبا اکرام (کراچی)، کبیر الدین فوزان (گلگشت خیالات، زیر اشاعت)، قطب شاہین، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانش (پیکرِ سخن 2011)، زبیر الحسن غافل (اجنبی شہر 2006)، نظام صدیقی، پروفیسر محمد رضا، شاہ اکرام الحق اکرم، اسمٰعیل کنول، ظہور الحق مضطر، ریاست حسین صابر گیاروی، طٰہٰ خاموش وغیرہ ایسی قابل قدر شخصیات ہیں جنھوں نے سیمانچل میں اردو شاعری کی آبیاری کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

(د) 1970 کے بعد کا دور، اس دور میں حازم حسّان (سبز پیڑوں کے سائے 2014، نغمۂ سروش 2014، اشعاعِ آیاتِ کریمہ 2020)، شاذ رحمانی (شعور کی ردا 2003)، احمد ندیم مورسنڈوی (آئینۂ سخن 2015، آئینۂ صداقت 2018)، افتخار راز مورسنڈوی (تحفۂ عالم (2016)، پروفیسر اصغر راز فاطمی (وانہیں ہے کوئی در 2018)، مشتاق احمد نوری، رضی احمد تنہا، رہبان علی راکیش، دین رضا اختر (پھر وہی برسات کی شام، زیرِ اشاعت)، مشتاق انجم، حامد حسین حامی، فرمان علی فرمان، ہارون رشید غافل، مسیح الدین شاذی، ارشد انور الف، نیلوفر پروین، ڈاکٹر فرحت آرا، مجیب قاسمی (نغمۂ بہار 2009، خمار سخن 2017)، ایس ایچ معصوم (خوشبو کو لاش، زیر اشاعت)، حشمت صدیقی (انداز گفتگو 2022)، بیگانہ سارنوی (گلہائے رنگ بہ رنگ 2022)، بچے کمار کندن (بے چینیاں 2022)، پروفیسر انور ایرج، پروفیسر عبداللطیف حیدری، ممتاز نیر، عادل بیگناوی، غلام محمد یحییٰ، ظہیر انور، امام مظہر (حادثوں کے درمیاں، زیر اشاعت)، قمر ادریسی (وقت کی گونج 2018)، خضر نندنوی، سبطین پروانہ (درد نہاں 2020) اور احسان قاسمی (دشتِ جنوں طلب 2020) وغیرہ سیمانچل کی اردو شاعری کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

(ح) نئی نسل، سیمانچل کی نئی نسل میں مستحسن عزم (ہموار نہیں کچھ بھی 2021)، ڈاکٹر قسیم اختر، جہانگیر نایاب (ہوا کے خلاف 2020)، ڈاکٹر خالد مبشر، شاہنواز بابل، مبین اختر امنگ (وقت کے ساتھ 2022)، موصوف سرور، نجم السحر ثاقب، حسان کشن گنجوی، آفتاب اظہر صدیقی، ڈاکٹر زاہد الحق، قیصر خالد، حسین احمد ہمدم، عبدالغنی لبیب، عبدالباری زخمی، خورشید قمر، عنایت وصی، سلیم صدیقی عرف شوق پورنوی، عبیدالرحمٰن، خورشید انجم، رضوان ندوی، افقر پورنوی، احمد صادق سعیدی، صدام حسین نازاں،

شاداب وفا پورنوی، ابراہیم سجاد تیمی، نورالدین ثانی (عکسِ ثانی 2021)، عذیق الرحمٰن صارم، ظفر شیر شاہ آبادی، قیصر جمیل، ثاقب کلیم، حسن راہی، عامر قاسمی، نظیر اظہر کٹیہاری، نثار دیناج پوری (الہام ہوا ہے 2021)، محسن نواز محسن دیناج پوری، شہباز مظلوم پردیسی، جاوید سلطان وغیرہ ایسے نام ہیں جن سے سیمانچل کی کافی امیدیں وابستہ ہیں۔

شعری مجموعوں کے علاوہ حمد و نعت پر مشتمل چھوٹے بڑے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اسی طرح کئی مثنویاں اور مرثیوں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان پر الگ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

سیمانچل میں شعر و سخن کی شمع روشن کرنے والوں میں غیر سیمانچلی شعرا کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ایسی قابل قدر شخصیات میں درد محمد آبادی، عنایت الرحمٰن عنایت (ڈسٹرکٹ جج)، رمن پرشاد سنہا رمن، رفیق انجم، پروفیسر ڈاکٹر عبدالمنان طرزی، شفیع مشہدی، صبا نقوی، عبدالحمید غم، شاہد جمیل، ابھے کمار بیباک، پروفیسر ڈاکٹر سجاد حیدر، ڈاکٹر اقبال واجد وغیرہم کے نام نامی شامل ہیں۔

سیمانچل میں اردو شاعری کے فروغ میں کئی تنظیموں نے نہایت فعال کردار ادا کیا ہے۔ بزم ادب کشن گنج جو کافی پرانا ادارہ ہے ایک زمانے میں اس کی کافی شہرت تھی۔ کھگڑا میلہ مشاعرے کی بھی روایت تھی جس میں قدیم پورنیہ ضلع کے اور باہر کے بھی شعراء کرام ہر سال بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔

انجمن ترقی اردو، کشن گنج کے ذریعے 1934 میں 'ارمغانِ اتفاق' اور 1940 میں 'تحفۂ احسان' یعنی شعرائے کشن گنج کی مختصر تاریخ اور نمونۂ کلام حکیم رکن الدین دانا ندوی سہرامی کی ادارت میں شائع کیا گیا تھا۔

پورنیہ شہر میں پورنیہ اردو سوسائٹی، پورنیہ کی داغ بیل 1960 میں پروفیسر طارق جمیلی اور جناب صبا اکرام نے ڈالی۔ یہ ادارہ اب تک قائم اور فعال ہے۔

ارریہ میں بزم جدید کے زیر اہتمام ہر سال مشاعرے کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ 'ہم سب' اور 'رابطہ' کے ذریعے بھی مشاعروں کا اہتمام اور رسائل کی اشاعت کا کام انجام دیا گیا ہے۔

فاربس گنج میں 'گلشن ادب' کے زیر اہتمام مشاعروں کے انعقاد کا سلسلہ برسوں سے قائم ہے۔

کٹیہار میں 'سخن' کے زیر اہتمام ماہانہ مشاعروں کا انعقاد کیا جاتا ہے جس میں اکثر پورنیہ اور دیگر شہروں کے شعراء کرام کی بھی شرکت ہوتی رہتی ہے۔

اسلام پور اور گوال پوکھر میں نثار دیناج پوری اور محسن نواز محسن دیناج پوری کی قیادت میں مختلف تنظیموں کے بینر تلے بھی اکثر و بیشتر مشاعروں/آل انڈیا مشاعروں کا اہتمام ہوتا رہا ہے۔

اس خطے میں شعر و سخن کے فروغ میں مقامی طور پر شائع ہونے والے رسائل و اخبارات کا بھی کافی اہم رول رہا ہے۔ طلبا پورنیہ، الاحسان کشن گنج، انسان کشن گنج، ساحل کشن گنج، ماہنامہ جام کشن گنج، نہار کشن گنج، پیام سحر کشن گنج، فانوسِ ادب کشن گنج، ہمارا پرچم کشن گنج، صبح نو پورنیہ/ پٹنہ، قافلہ پورنیہ، افکار پورنیہ، نشانِ منزل پورنیہ، فانوس کٹیہار، غالب کٹیہار، عکس ارریہ، ابجد ارریہ، ہفت رنگ ارریہ، بصارت بہادر گنج، وجدان گوال پوکھر، نوائے بنگال گوال پوکھر (اتر دیناج پور) وغیرہ۔

خلاصہ یہ ہے کہ سیمانچل میں اردو شاعری کی جڑیں فوجداروں کے دور حکومت سے گہرائی کے ساتھ پیوست رہی ہیں اور شعر و سخن کا یہ شجر آج بھی بارآور ہو رہا ہے۔ ہم اسے ایک مختصر دبستان یعنی 'دبستانِ سیمانچل' کے نام سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔

■

Md. Ehsanul Islam
Noorie Nagar, Khazanchi Hat
Purnea- 854301 (Bihar)
Mob.: 9304397482
Email.: ehsanulislam1955@gmail.com

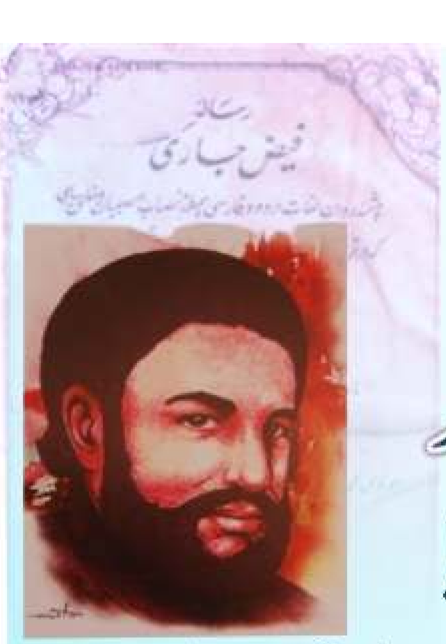

محمد حنیف خان

رسالہ فیض میر

میر کی فسانہ طرازی اور سلوک ومعرفت کی دنیا

میر شاعری کے خدائے سخن ہیں اس میں کوئی کلام نہیں لیکن وہ اعلی درجے کے نثر نگار بھی تھے، اگرچہ انھوں نے شاعری کی طرح ریختہ میں نثر نگاری نہیں کی، اس کے لیے انھوں نے فارسی کا انتخاب کیا، نکات الشعرا، ذکر میر اور فیض میر ان سے یادگار ہیں۔ یہاں 'فیض میر' سے متعلق گفتگو مقصود ہے۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں پانچ حکایتیں بیان کی گئی ہیں۔ میر نے یہ رسالہ اپنے بیٹے فیض علی فیض کی تربیت کے لیے لکھا تھا۔ جس کے چند سطری مقدمے میں اس کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''درایں ایام فیض علی پسر من ذوق خواندن ترسل پیدا کردہ بود، لہذا حکایات خمسہ متضمن فوائد بسیار را باندک فرصت نگاشتم ومراعات اسم اوںموده نام نسخہ 'فیض میر' گذاشتم''
ہر کہ ایں حکایات بخواند، غالب کہ دررنج وتختی نماند''

(میرتقی میر۔ فیض میر مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، ص 44، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، سنہ درج نہیں)

یعنی ان ہی ایام میں میرے بیٹے فیض علی کو ترسل پڑھنے کا شوق پیدا ہوا (ترسل نوع بنوع کے خط کو کہتے ہیں) اس لیے حکایات خمسہ لکھی جس کے بہت سے فوائد ہیں، بیٹے کے نام کی مناسبت سے اس رسالے کا نام فیض میر رکھا، جو بھی یہ حکایات پڑھے گا غالب امید ہے کہ اس کے رنج وغم دور ہو جائیں گے۔

'فیض میر' کا مطالعہ سلوک ومعرفت کے تناظر میں کیا گیا ہے، تحریر کا انداز ایسا ہے جیسے آپ بیتی ہو لیکن صفدر آہ سیتاپوری اپنی کتاب 'میر اور میریات' میں لکھتے ہیں:

یہ پانچوں کہانیاں انھوں نے 'جگ بیتی' کی صورت میں سنی ہوں گی جس کو زیادہ پر اثر بنانے کے لیے 'آپ بیتی' کی تکنک میں لکھ دیا۔ یعنی بصورت موجودہ میر خود ان کہانیوں کے واقعات کے عینی شاہد بن گئے ہیں۔''

(صفدر آہ سیتاپوری، میر اور میریات، ص 200، علوی بک ڈپو ممبئی، 1972)

میر نے یہ قصے کہاں سنے اور کس سے سنے، ان کا ماخذ کیا ہے اس حوالے سے ابھی تک کوئی تحقیق سامنے نہیں آئی ہے، چونکہ میر نے حقیقی مقامات کا ذکر کرتے ہوئے راوی واحد متکلم کا استعمال کیا ہے، اس لیے ان حکایات کو سچ مان کر ان کی قرأت کی گئی ہے، البتہ واقعات کی حقیقت پر سوالات بھی اٹھائے گئے لیکن واقعات کے حقیقی اور فرضی ہونے سے قطع نظر اگر مذکورہ حکایات یعنی کہانیوں کے تکنیکی بیانیے اور اس کی تکنیک پر غور کیا جائے تو کئی باتیں نکل کر سامنے آتی ہیں۔ جہاں تک مسئلہ تکنیک کا ہے تو اس باب میں میر تقی میر پہلے شخص ہیں جنھوں نے حکایات یعنی کہانیوں میں راوی واحد متکلم کا استعمال کیا ہے۔ یہ اردو افسانے کا وہ راوی ہے جو ہمہ داں نہیں اور نہ ہی وہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے بلکہ یہ ایک ذمے دار راوی ہوتا ہے، جس پر صدق وکذب کا الزام عائد کیا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کہانیوں کے حوالے سے میر پر صدق اور کذب دونوں چسپاں کیے گئے۔ اگر انھوں نے واحد متکلم کی جگہ راوی واحد غائب کا استعمال کیا ہوتا تو وہ اس سے بچ جاتے لیکن میر ذرا الگ ڈھب کے تھے، انھوں نے حکایات نویسی میں بھی اپنے لیے نئی راہ نکالی اور ایسا انداز اختیار کیا کہ قصے کے باوجود اس پر سچ کا احتمال ہونے لگا۔ یہ معاملہ بھی مرزا ہادی رسوا کے امراؤ جان ادا کی طرح ہے۔ وہاں بھی تخلیق کار نے واحد متکلم کا استعمال کر کے قارئین کو شک میں ڈال دیا ہے۔ تمکین کاظمی نے اس پر لکھے اپنے مقدمے میں صدق اور کذب دونوں صورتوں میں تخلیق کار کی بڑائی کا اعتراف کیا ہے کہ اگر کہانی سچ ہے تو اس کو ناول بنا دینا ایک بڑی فنکاری ہے اور یہ حقیقی نہیں ہے اور ایک فرضی قصے کو ایسے بیان کرنا کہ لوگ اس کے کردار کا پتہ پوچھتے پہنچ جائیں تو یہ اور بڑی فنکاری ہے۔ یہی معاملہ میر تقی میر کے ساتھ ہے۔ حکایات خمسہ میں سے ابتدائی چار حکایات کا ایسا رنگ ہے جنھیں عقل حقیقی تسلیم نہیں کرتی البتہ پانچویں حکایت ایسی ضرور ہے جسے حقیقی تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے کرداروں کی تشفی بخش تحقیق اب تک نہیں ہوسکی ہے اس لیے وہ بھی شک کے ہی دائرے میں ہے۔

میر نے اپنی حکایات کے لیے دور جدید کے افسانوں کی طرح کردار خلق کیے ہیں، آخری حکایت کو چھوڑ کر دیگر سبھی چار حکایتوں میں کرداروں کی بھی بہتات نہیں ہے۔ پہلی کہانی میں شاہ ساہا اور ایک تیلن مرکزی کردار ہیں جس میں متعدد ضمنی کردار بھی ہیں جن میں حشرات الارض بھی شامل ہیں۔ اس حکایت کا راوی صرف ایک راوی نہیں بلکہ کردار بھی ہے، جو جگہ جگہ نہ صرف اپنی موجودگی کا اظہار کرتا ہے بلکہ اپنے جذبات کا بھی اظہار کرتا ہے۔ مثلاً شاہ ساہا نے بھوک کے عالم میں راوی سے جو کی روٹی کھانے کی خواہش کا اظہار کیا، دیر رات وہ اپنے گھر گیا لیکن اس وقت تک سب سو چکے تھے، ایک بوڑھی خادمہ جاگ رہی تھی جس سے روٹی پکوائی، جس نے جز بز ہوکر روٹی پکائی جب راوی یہ روٹی لے کر شاہ ساہا کے پاس پہنچا تو وہ کہنے لگا کہ یہ روٹی کسی انسان کے کھانے کے لائق نہیں کیونکہ اس پر ایک کتیا بھونکی ہے، اسے لے جاؤ اور کتوں کے آگے ڈال دو۔ راوی بیان کرتا ہے:

غرض اس نے وہ روٹی کسی طرح نہ کھائی اور مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی۔

اس طرح راوی کہانی میں بار بار دخل دیتا ہے اور شاہ ساہا کی کرامات بیان کر کے اس کی عظمت کا سکہ قاری کے دل میں بٹھانے کی بھر پور کوشش کرتا ہے۔ یہیں سے شاہ ساہا کی معتقد ایک بوڑھی تیلن کا داخلہ ہوتا ہے جس کے یہاں سے وہ اکثر روٹی کا ایک ٹکڑا لے کر کھا لیتا تھا اور پانی پی لیتا تھا۔ ایک بار اس فقیر پر حالت طاری ہوئی تو اس کے جسم کے جوڑ جوڑ الگ ہوگئے اور سر ہوا میں معلق ہوگیا جسے دیکھ کر بڑھیا نے چیخ وپکار مچادی اور لوگوں سے کہا کہ دیکھو کسی نے شاہ ساہا کو قتل کر ڈالا، اس کے شور سے وہ اپنی اصلی حالت پر آگئے، جس کے بعد انھوں نے یہ کہتے ہوئے بد دعا دی کہ جس نے میرا راز فاش کیا ہے

اس کا لڑکا آج رات ہی قتل ہوجائے، وہ خود ذلت کی موت مرے، ناگہاں آگ لگ جائے، میرا نشان نہ رہے۔ آبادی ویرانہ ہوجائے، ایک سانپ کا ادھر سے گذر ہو، آدمی تباہ ہو اور گھر سیاہ ہوجائیں، یہ محلّہ بہہ جائے، یہاں ایک چڑیا تک دکھائی نہ دے۔ یہاں سے کہانی میں دلچسپی بڑھتی ہے جو دھیرے دھیرے بڑھتی ہی جاتی ہے، کہانی میں دلچسپی اس قدر ہے کہ قاری تخلیق کار کے ساتھ انگلی پکڑ کر چلنے لگتا ہے۔ ابتدا میں تو لگتا ہے کہ راوی کوئی بہت عام واقعہ بیان کر رہا ہے لیکن جوں جوں کہانی آگے بڑھتی ہے وہ دلچسپ ہوتی جاتی ہے۔ شاہ ساہا کے منھ سے جو بھی نکلتا ہے جس کا بیان اوپر ہوا وہ سب ہوتا ہے جسے میر نے اس حکایت میں دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ میر راوی واحد متکلم کے طور پر اس درویش کے قول کی صداقت کا عینی مشاہدہ کرنے کے لیے ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔ بڑھیا کا بیٹا اسی رات ڈاکوؤں کے ہاتھ قتل ہوا، وہ گھر میں آگ لگا کر سب مال و اسباب لوٹ لے گئے، رات اس قدر بارش ہوئی کہ مکان تک بہہ گئے، بڑھیا کو کالے سانپ نے ڈسا جسے کالی آندھی کی طرح بڑھیا کی جانب جاتے ہوئے خود میر نے بطور راوی دیکھا، درویش ساہا نے راوی سے بتایا کہ وہ سانپ آج رات مجھے بھی کاٹے گا اور ایسا ہی ہوا لیکن طرفہ تماشا یہ کہ ان سب کے باوجود راوی زندہ ہے۔ ایسے میں اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ یہ حکایات ہی ہیں جنھیں میر نے زبان و بیان کی چاشنی اور افسانوی حیلے بازی کے ساتھ بیان کرکے انھیں دلچسپ بنا دیا۔ اردو فکشن کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے، جتنی عمر اردو فکشن کی ہے کم و بیش اتنے ہی برس پہلے یہ رسالہ لکھا گیا، اس کے باوجود اگر ان حکایتوں کا مطالعہ جدید فکشن کے تناظر میں کیا جائے تو اس کے بہت سے عناصر ان میں ملتے ہیں۔ ابتدا میں افسانہ کے لیے پلاٹ لازمی تھا لیکن چونکہ فن نامیاتی ہوتا ہے اس لیے اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اس تناظر میں اگر ان حکایات کا مطالعہ کیا جائے تو دونوں صورتیں ان میں دکھائی دیتی ہیں۔ پہلی حکایت کا ابتدائی حصہ پلاٹ سے خالی ہے جبکہ کہانی میں تیلن کے داخلے کے بعد ایک مربوط پلاٹ نظر آتا ہے، واقعات کی فنی ترتیب ہے، وقوعے ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اسی طرح سے دوسری کہانیاں بھی ہیں جن میں کچھ وقوعے پلاٹ پر مبنی ہیں تو کچھ فرداً فرداً بیان کیے گئے اور سب مل کر ایک حکایت / کہانی کی تکمیل کرتے ہیں۔

دوسری حکایت میں میر نے اکبرآباد کے ایک محلّہ ممتاز گنج کی کہانی بیان کی ہے، جس میں ایک بزرگ کو دیوانہ سمجھ کر لوگ ڈھیلے مارنے لگتے ہیں، وہ دھمکی بھی دیتا ہے کہ اگر ان ڈھیلوں سے ہمیں کوئی گزند پہنچی تو پورا محلّہ جل کر خاک ہوجائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ یہاں بھی راوی واحد متکلم ہی ہے جو ایک شعلے کو اٹھتے ہوئے اور بازار کی جانب جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ جس نے پورے بازار کو جلا کر خاکستر کردیا۔ اس میں صدق و کذب کو میر نے مدغم کردیا ہے، اکبرآباد حقیقت ہے، لیکن واقعات خارق عادت ہیں کہ انھیں عقل درست ماننے کو کسی صورت تیار نہیں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک فقیر احسن اللہ ہے جس کا لقب رام تھا۔ اس میں میر نے ہندو میتھالوجی کا بھی بڑی چابکدستی سے استعمال کیا ہے، جس سے کہانی کے انسلاکات اور معنوی امکانات کی دنیا واقع ہوجاتی ہے اور میر کی فکر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

متعدد وقوعوں سے یہ کہانی تکمیل کو پہنچتی ہے جس میں ایک خوبصورت، خوش رنگ عورت شوخ و شنگ چھینٹ سازوں کے قبیلے کی صبح و شام دریا پر پانی بھرنے آیا کرتی تھی جس پر ایک عالم فریفتہ تھا۔ ایک دن وہ مٹی کا گھڑا کندھے پر رکھے بڑے ناز و انداز سے فقیر کے سامنے سے گزری، فقیر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا اے دل و دین کو غارت کرنے والی، اس قدر گمراہی۔ جا رام رام کہا کر یہ سنتے ہی اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، منھ پر خاک ملی اور رام رام کہتی ہوئی ادھر ادھر دوڑنے لگی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ عورت مثنوی سحرالبیان کی نجم النسا ہے جو جوگن بن کر بے نظیر کی تلاش کے لیے نکل جاتی ہے۔ لیکن یہاں فرق اتنا ہے کہ اس پر جنون طاری ہوجاتا ہے اور چند دنوں میں موت کے بے رحم ہاتھوں کا شکار ہوجاتی ہے۔

احسن اللہ کا لقب رام اور عورت کو رام رام کی تلقین کہانی کا صرف وقوعہ نہیں ہے بلکہ اس کے پس پشت میر کی ذہنیت، بقائے باہم، صلح کل اور ہندستانی معاشرت ہے، جس میں مذہب کی دیواریں نہیں تھیں، طالب متعدد ہوسکتے تھے مگر ان سب کا مطلوب ایک تھا، راہیں جدا ہوسکتی تھیں مگر منزل سب کی ایک تھی۔ جب بھی سلوک و معرفت کی بات ہوتی ہے تو اس کے مرکز میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا نظریہ ہوتا ہے۔ 'فیض میر' کا مطالعہ بھی سلوک و معرفت کے تناظر میں ہی کیا گیا ہے لیکن جس طرح سے میر نے ہندو مذہبیات کا یہاں استعمال کیا ہے اور لفظ 'رام' کے اثرات بیان کیے ہیں، وہ اس ادغام و انضمام کے ساتھ کسی دوسری کتاب میں نہیں بیان کیے گئے ہیں۔ میر کہہ بھی چکے ہیں۔

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

چوتھی حکایت میں ایک مجذوب فقیر اسد دیوانہ اور جوگی کے درمیان گفتگو بڑی اہم ہے۔ جس میں بعث بعد الموت اور حشر کا بیان کیا گیا ہے۔ اس میں 'آواگون' یعنی حلول روح کا انکار ایک ہندو جوگی کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ در اصل اس کا تعلق سلوک و معرفت سے کہیں زیادہ عقیدے سے ہے۔ اس پوری حکایت میں بعث بعد الموت کو موضوع بنایا گیا ہے، جس میں وہ انسان اور روح کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔ ہندو جوگی کہتا ہے:

''روح انسانی بذات خود قدیم ہے اور موت کے معنی روح کا معدوم ہونا نہیں، بلکہ قالب سے اس کے تعلق کا قطع ہوجانا ہے، بعث و حشر کے معنی یہ نہیں کہ روح کو وہی قالب ملے گا قالب ایک سواری سے زیادہ نہیں۔''

چونکہ میر نے یہ رسالہ اپنے بیٹے فیض علی فیض کی تربیت کے لیے لکھا تھا، جس میں سلوک و معرفت کے مضامین بیان کیے، واقعات اور اس کے تفکیری بیانیے کے ذریعے میر نے اس میں انسان کے عدم و وجود، روح، بہشت و دوزخ کی حقیقت مکالمے کی صورت میں بیان کی ہے۔

وہ اپنے بیٹے کی تربیت ایک ایسے انداز میں کرنا چاہتے تھے جس سے وہ للّٰہیت اور انسانیت سے متصف ہوجائے، وجود و عدم کی حقیقت سے آگاہ ہوجائے جس کے لیے وہ صرف اسلامی تعلیمات اور سلوک کے قائل نہیں تھے، وہ ہندستان میں رہتے تھے، جہاں کے غالب مذہب کی عقیدت سے بھی ان کا دل لبریز تھا جس کی جانب انھوں نے رہنمائی کی ہے۔

اسی طرح وہ ما قبل تاریخ کے واقعات سے بھی کہانی کے کینوس کو وسیع کرتے ہیں، تیسری حکایت میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جس کا مرکزی کردار ایک درویش شاہ برہان ہے، راوی نے اس میں بزرگ کی زبانی مصر میں خشک سالی کا واقعہ بیان کیا ہے، جب لوگوں نے اس کی شکایت کی تو ذوالنون کو باطنی توجہات سے معلوم ہوا کہ ایک سورنی نے جنگل میں بچے دیے ہیں، بارش کی صورت میں ان کی جانوں کے اتلاف کا خطرہ ہے اس لیے بارش نہیں ہورہی، جب لوگ ان بچوں کی حفاظت کے لیے دوڑے تو بارش ہوئی، اس طرح کے واقعات کے ذریعے میر نے اپنی حکایتوں کی معنوی دنیا کے امکانات کو وسیع تر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ میر فسانہ طرازی کے گر سے خوب آگاہ تھے جنھوں نے فنی حیلے بازیوں کے توسط سے اپنی حکایات کو دلچسپ بنا دیا۔

■

Mohd Haneef Khan
Dept of Urdu, Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.:9359989581
Email.: haneef5758@gmail.com

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

اور فہرست اردو مخطوطات

محمد شارب

سرزمین دکن نے اردو کے علمی وادبی سرمائے کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ یہاں کے ارباب علم ودانش اور ماہرین فکر وفن نے ہر دور میں اپنی فہم وفراست کے ذریعے علوم وفنون کو تقویت بخشی اور دکن کے مختلف حصوں میں شعر وسخن کی آبیاری کی، لیکن ادارہ جاتی طور پر ادب اردو کو فروغ دینے میں جامعہ عثمانیہ کا اہم کردار ہے۔ اس ادارے نے زندگی کے تمام شعبہ جات میں اپنا دخل اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اپنی تحقیقی صلاحیتوں کی بدولت کم وبیش چار دہائیوں تک اردو زبان وادب کی خدمت کی۔ ان کی ادبی خدمات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بیک وقت اردو کے بلند پایہ محقق صاحب نظر نقاد اور ماہر لسانیات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مؤرخ، مدون، شاعر اور افسانہ نگار بھی تھے۔ ڈاکٹر زور کی ادبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد علی اثر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

”ان کی اولوالعزمی صرف صفحۂ قرطاس تک محدود نہ تھی۔ وہ ایک باعمل اور فعال شخصیت کے مالک بھی تھے۔ انھوں نے ایک طرف ایک پروفیسر، ایک پرنسپل اور ایک صدر شعبہ کی حیثیت سے سیکڑوں تشنگان علم کی پیاس بجھائی تو دوسری اور نہ جانے کتنے ہی علمی، ادبی اور تحقیقی اداروں کے مشیر اور سرگرم رکن کی حیثیت سے اردو کی بقا اور فروغ کے لیے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔“[1]

ڈاکٹر زور کی اردو دوستی کی مثال ان کی تدریسی مصروفیات، متعدد مضامین اور کتابیں لکھنے، دکنی ادب پر تحقیق، مخطوطات حاصل کرنے کے لیے ریاست حیدرآباد کے باہر اپنے آدمی بھیج کر بے شمار قلمی مسودے جمع کرنے، 'ادارۂ ادبیات اردو' کی بنیاد ڈالنے اور 'سب رس' جیسے علمی جریدے وغیرہ سے دی جاسکتی ہے۔ انھیں دکنی ادب کے ساتھ ساتھ دکن کی ہر چیز سے بے پناہ محبت تھی اور اسی محبت کی بنا پر سرزمین دکن سے تعلق رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کی نگارشات کو آنے والی نسلوں کے لیے مخطوطات کے تذکرے کی شکل میں محفوظ کرلیا۔ ڈاکٹر زور کے انھیں کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے سید حرمت الاکرام لکھتے ہیں:

ڈاکٹر زور نے اردو کے لیے صرف شاعرانہ الفاظ میں نہیں حقیقی معنوں میں اپنا لہو دیا ہے۔“[2]

جہاں تک ڈاکٹر زور کی علمی وادبی خدمات کا معاملہ ہے انھوں نے علم وادب کے شعبے میں بے شمار نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ لیکن 'ادارۂ ادبیات اردو' کا قیام ان کی زندگی کا اہم کارنامہ ہے۔ محمد اسحاق ایوبی کے الفاظ میں:

”اگرچہ ادارہ 1931 میں وجود میں آگیا تھا لیکن اس کے کتب خانے کی داغ بیل صحیح معنوں میں 1933 میں پڑی۔ یہاں پانچ ہزار سے زائد مخطوطات اور تقریباً پچیس ہزار مطبوعات محفوظ ہیں۔“[3]

'ادارۂ ادبیات اردو' میں عربی، فارسی، ہندی، سندھی، پنجابی، اردو اور خاص کر دکنی مخطوطات کا ذخیرہ کثیر تعداد میں موجود ہے اور انھیں مخطوطوں کی بنیاد پر اس ادارے کا شمار دنیا کے چند اہم کتب خانوں میں کیا جاتا ہے۔ ادارے میں محفوظ ایک ہزار قلمی کتابوں کی فہرست چھ جلدوں میں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہے۔ جن میں سے پانچ جلد 1943 سے 1959 کے درمیان شائع ہوئی ہیں جس میں ایک ہزار ایک سو پچاس مخطوطات شامل ہیں۔ چھٹی جلد 1983 میں اکبرالدین صدیقی اور ڈاکٹر محمد علی اثر کی کوششوں سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد علی اثر ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

”ڈاکٹر زور نے ایک ہزار ایک سو پچاس مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں پانچ جلدوں میں 1943 اور 1959 کے درمیان شائع کیں۔ پانچویں جلد کی اشاعت کے چوبیس سال بعد 1983 میں محمد اکبرالدین صدیقی مرحوم اور راقم الحروف کے اشتراک سے چھٹی جلد کی اشاعت عمل میں آئی۔“[4]

'ادارۂ ادبیات اردو' کے 'تذکرۂ مخطوطات' کی پہلی جلد 1943 میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد 396 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں 275 مخطوطات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ 1984 میں پہلی جلد کا عکسی ایڈیشن

'ترقی اردو بیورو' دہلی سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر محمد علی اثر کے مطابق ''راقم الحروف نے استاد محترم پروفیسر مغنی تبسم کے زیرِ نگرانی 'تذکرہ مخطوطات' کی پہلی جلد کو ترمیم و اضافے کے ساتھ مرتب کیا ہے''۔[5] اس جلد میں کچھ مخطوطات ایسے ہیں جو دنیا کے کسی اور کتب خانے میں دستیاب نہیں ہیں۔ تقریباً پچاس مخطوطے ایسے ہیں جو خود مصنف کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ مخطوطات صرف دکنی شعرا یا ادبا کی تصنیفات و تالیفات پر ہی مشتمل نہیں ہیں بلکہ لاہور، دہلی، آگرہ، لکھنؤ، رام پور، بریلی، قنوج اور کلکتہ جیسے شہروں کے شعرا و ادیبوں کی قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ بعض مخطوطات کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ وہ ''فرمارواؤں مثلاً محمد قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ، علی عادل شاہ ثانی والی بیجاپور، عبداللہ قطب شاہ والی حیدرآباد، واجد علی شاہ والی لکھنؤ اور نواب یوسف علی خان والی رام پور کے رشحات قلم ہیں۔[6] اس جلد میں 825ھ سے 1319ھ کے درمیانی دور کی تقریباً پانچ سو سال کی کتابوں کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

'تذکرۂ مخطوطات' کی دوسری جلد 1951 میں شائع ہوئی۔ اس جلد میں 554 مخطوطات کو شامل کیا گیا ہے جس میں عربی کے 48، فارسی کے 250، اردو کے 251 اور ہندی کے 5 مخطوطات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ 'تذکرہ مخطوطات' کی پہلی جلد میں جتنی محنت اور جاں فشانی کے ساتھ تمام مخطوطوں کا مختصر خلاصہ مصنف کے واقعات زندگی، کتاب کی قدر و قیمت اور اس کے ماخذوں پر جس مدلل اور مفصل انداز میں بحث کی گئی ہے وہ دوسری جلد میں خال خال نظر آتی ہے۔ کیوں کہ پہلی جلد کے مقابلے میں دوسری جلد کے مخطوطات کی ترتیب کا کام ڈاکٹر زور نے بہت ہی رواداری اور عجلت میں کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ بتاتے ہوئے جلد دوم کے دیباچے میں ڈاکٹر زور رقم طراز ہیں:

''کل ہند اردو کانگریس کے انتظامات اور اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب میں ارباب ادارہ ایسے مصروف ہوگئے کہ راقم الحروف بھی تذکرہ نگاری کے سلسلے کو جاری نہ رکھ سکا ہے۔...... اب نہ اتنا وقت تھا اور نہ اگلی سی صحت، اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ کم سے کم وقت اور محنت میں زیادہ سے زیادہ مخطوطات کا ایک اجمالی تذکرہ قلم بند ہوجائے۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر 'تذکرہ مخطوطات' ادارہ کی یہ دوسری جلد مرتب کی گئی ہے۔ اس میں پانچ سو قلمی کتابوں کی تفصیلات پیش نظر ہوگئی ہیں۔''[7]

وقت کی قلت اور ڈاکٹر زور کی تمام تر مصروفیات کے باوجود دوسری جلد کے 'تذکرۂ مخطوطات' کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ جلد دوم میں 14 مخطوطات کے مصنفین ہندو ہیں۔ علاوہ اس کے 23 مخطوطات ایسے ہیں جن کے کاتب ہندو ہیں۔ اس جلد کے نصف مخطوطات تو ایسے ہیں جن کے کاتبوں کے نام معلوم نہیں ہوسکے ورنہ یہ فہرست اور بھی طویل ہوسکتی تھی۔ مثال کے لیے چند مخطوطات کے مصنفوں اور کاتبوں کے نام ملاحظہ ہوں۔

نمبر شمار	مصنف یا مولف	نام کتاب	نمبر مخطوطہ
1	لالہ تلسی رام	رقعات	27
		بھاگوت گیتا	94
2	نہال چند لاہوری (1217)	مذہب عشق (قصہ بکاؤلی)	121
		مذہب عشق دوسرا نسخہ	151
3	لکشمی نارائن شفیق	قصیدہ درجواب سودا	136
4	نیم چند حیدرآبادی	گل باصنوبر	169 (ب)

چند مخطوطات ایسے ہیں جن کے کاتب ہندو ہیں ملاحظہ ہو۔

نمبر شمار	نام کاتب	نام کتاب	نمبر مخطوطہ
1	لالہ دولت رائے 1192	دیوان فارسی میر تقی میر	43
2	رادھا کشن 1192	دیوان اردو میر	44
3	منوہر لال 1191	دیوان ولی	112
4	سورج بھان گوڑ 1306	منتخب دیوان ناظم	342

درج بالا فہرستوں کے درپیش مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ کوئی بھی زبان و ادب کسی بھی قوم و مذہب کی جاگیر نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور کے خیالات ملاحظہ فرمائیں:

''یہ امر بطور خاص قابل ذکر ہے کہ اس جلد دوم میں بھی متعدد کتابیں ایسی ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح ایسے حضرات سے رہا ہے جو مسلمان نہ تھے۔ ان فہرستوں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ علم و فضل اور شعر و ادب کسی ایک مذہب و ملت ہی کا ورثہ نہیں اور نہ کوئی زبان ہی کسی ایک فرقے کی ملک رہ سکتی ہے۔''[8]

مندرجہ بالا حوالے سے ڈاکٹر زور کے زبان و ادب اور مذہب کے حوالے سے ان کے خیالات واضح ہو جاتے ہیں اور ان کے یہ خیالات ایسے لوگوں کے لیے ایک مستند جواب بھی ہے جو کسی بھی زبان و ادب کو کسی خاص قوم و مذہب سے جوڑ دیتے ہیں۔

'تذکرۂ مخطوطات' کی تیسری جلد ساہتیہ اکیڈمی کے اشتراک سے 1957 میں شائع ہوئی۔ تیسری جلد میں بیشتر اردو مخطوطات ہی شامل ہیں۔ 890 صفحات پر مشتمل اس جلد میں صرف 200 مخطوطات کو شامل کیا گیا ہے۔ باوجود اس کے کچھ جلدیں اور بیاضیں ایسی ہیں جن میں ایک ساتھ کئی شاعروں و ادیبوں کے کلام موجود ہیں۔ جلد سوم میں شامل مخطوطہ نمبر 700 میں تقریباً 50 سے زائد شعرا کے کلام کا نمونہ موجود ہے۔ بطور مثال مخطوطہ نمبر 700 میں سے چند شعرا و ادبا کے نام ملاحظہ ہوں:

	سلام و مراثی	قبل از 1200ھ
1	راجہ مکھن لال مکھن	ایضاً
2	میر محمد علی محب	ایضاً
3	رحم علی	ایضاً
4	ولی	ایضاً
5	معزز خان معزز	ایضاً
6	باباشاہ ابراہیم	ایضاً

تیسری جلد کے اشعار سے اردو ادب کے متعدد ایسے شعرا اور ان کے مجموعے منظر عام پر آئے جس سے ادبی دنیا اب تک ناواقف تھی۔ ایسے گمنام شعرا اور ادیبوں کو دنیائے ادب سے واقف کرانے کا سہرا 'ادارۂ ادبیات اردو' اور 'ڈاکٹر زور' کے سر جاتا ہے۔ ان شعرا میں چند نام بطور مثال ملاحظہ ہوں:

1	فدوی اورنگ آبادی	دیوان
2	واجد دہلوی	دیوان

3	بسمل مدراسی	بیاض
4	ملک محمد جوہر	مثنوی جوہر عشق
5	خالق	مراثی

اس کے علاوہ بہت سے مصنفین کی نئی کتابوں کے مخطوطوں کا حال اس جلد میں شامل کیا گیا ہے۔ جن میں:

ملک خوشنود	بازار حسن اور نور نامہ
ضیاءالدین پروانہ	دیوان دوم وغیرہ

اس کے علاوہ اس جلد میں کچھ ایسے نسخے بھی شامل کیے گئے ہیں جو ہندوستان کے دیگر کتب خانوں میں نہیں ملتے، البتہ یورپ کے کتب خانوں میں یہ نسخے موجود ہیں۔ علاوہ ازیں ایک مخطوطہ ماہنامہ جوہر جس سے حیدر آباد کے تہذیبی و علمی ورثے پر روشنی پڑتی ہے، جلد دوم کا دوسرا عکسی ایڈیشن 1984 میں ترقی اردو بیورو، نئی دہلی سے شائع ہوا۔

تذکرۂ مخطوطات کی چوتھی جلد ساہتیہ اکادمی کے مالی اشتراک سے 1958 میں منظر عام پر آئی۔ جلد سوم کی طرح جلد چہارم میں بھی 200 مخطوطات کو شامل کیا گیا ہے، جن میں بیشتر مخطوطات اردو کے ہیں یا پھر فارسی کے وہی نسخے شامل ہیں جنھیں اردو کے شاعروں یا ادیبوں نے لکھا ہے یا پھر کچھ ایسے نسخے بھی شامل ہیں جو اردو کتابوں کے ساتھ ایک ہی جلد میں شامل ہیں۔

تذکرۂ مخطوطات کی چوتھی جلد میں اعلیٰ درجے کی خوش نویسی کے نمونے جا بہ جا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس لحاظ سے چوتھی جلد کو دیگر جلدوں پر اہمیت و فوقیت حاصل ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

''اس جلد کے مخطوطات نمبر 892 تا 899 ایسے نادر و نایاب اور بیش بہا نسخے ہیں جن کی خطاطی سورت کے محمد زاہد علی ولد حسن محمد نے کی ہے۔ جو اعلا پائے کے خطاط تھے۔''[9]

جلد چہارم کا دوسرا عکسی ایڈیشن 1984 میں ترقی اردو بیورو، نئی دہلی سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔

1958 میں چوتھی جلد منظر عام پر آئی اور اس کے ایک سال بعد 1959 میں تذکرۂ مخطوطات کی پانچویں جلد ساہتیہ اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی۔ جلد پنجم کے دیباچے میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

''مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو کی توضیحی فہرست کی یہ پانچویں جلد ہے۔ اس میں 250 مخطوطات سے بحث کی گئی ہے اور اس کی اشاعت کے بعد ادارہ کے جملہ 1150 مخطوطات کے بارے میں تفصیلات (پانچ جلدوں میں) منظر عام پر آ رہی ہے۔''[10]

اگر پانچویں جلد اور دیگر جلدوں کا بہ غور جائزہ لیا جائے تو ہمیں مصنفین کے حالات زندگی کے سلسلے میں صرف ماخذوں کی نشاندہی ملتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دوسری جلدوں کی طرح اس پانچویں جلد میں بھی مخطوطوں کی خصوصیات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مصنفوں اور شاعروں کے حالات کی تفصیلات نہیں دی گئی ہے۔ ان کے بارے میں صرف حوالوں اور ماخذوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے تاکہ تحقیق کرنے والے اصحاب کتابوں تک پہنچ جائیں۔ ان جلدوں کی ترتیب کا بڑا مقصد یہی ہے کہ ادارے میں جو مخطوطے ہیں ان کی نسبت اہل ذوق اصحاب اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کو علم ہو جائے کہ ادارہ میں کیا کیا کتابیں موجود ہیں۔''[11]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی پوری زندگی ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف کر دی۔ اس کی زندہ مثال ادارۂ ادبیات اردو کا قیام اور تذکرۂ مخطوطات کی توضیحی فہرست ہے۔ تذکرۂ مخطوطات جیسا مستند کام کرنے کے لیے انھوں نے رات دن ایک کر دیا تاکہ اردو اور دیگر زبانوں کی مایۂ ناز تصانیف کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کیا جا سکے۔ ان کی محنت اور جاں فشانی کو دیکھتے ہوئے محمد اکبر ایوبی لکھتے ہیں:

''راقم الحروف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ڈاکٹر زور مخطوطوں کی چھان بین اور کھنگالنے کا کام کس طرح انجام دیتے تھے۔ سیکڑوں سال پرانی کتابوں کے گرد و غبار، خطرناک جراثیم اور ناگوار بو کسی بھی شخص کو ان سے متنفر کر سکتی تھی لیکن ڈاکٹر موصوف ان 'آثار الصنادید' کی قدر و قیمت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ زیادہ تر انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اردو ادب میں جنوبی ہند کی ناقابل فراموش خدمات کا اعتراف سبھوں کو کرنا پڑا۔''[12]

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ادارۂ ادبیات اردو کے قیام سے نہ صرف اردو ادب کی خدمات کا کارنامہ انجام دیا ہے بلکہ تذکرۂ مخطوطات کو ترتیب و تدوین کے ذریعے اگلی نسلوں تک پہنچانے کا کام کیا ہے۔ وہ تا عمر اردو ادب کے کلاسیکی سرمائے کی حفاظت کے لیے کوشاں رہے۔ ان کے مطالعے کی وسعت اور تحقیقی صلاحیت کا اندازہ لگانے کے لیے ڈاکٹر حرمت الاکرام کے یہ الفاظ قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے:

''یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ ان کی دوسری تصنیفات و تالیفات سے قطع نظر اگر حیدر آباد اور باقی پورے ہندوستان کے مخطوطات ایک دوسرے کے مقابلے میں رکھ دیے جائیں تو اس میں حیدر آباد سبقت لے جائے گا جس کا سہرہ زور کی ذات واحد کے سر ہے۔''[13]

حواشی

1. ڈاکٹر زور کے مرتبہ تذکرۂ مخطوطات، ڈاکٹر محمد علی اثر، مشمولہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور: حیات، شخصیت اور کارنامے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2005، ص 351
2. ایضاً، ص 352
3. ڈاکٹر زور اور مخطوطات کے تذکرے، محمد اکبر ایوبی، مشمولہ سب رس زور نمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر 1963، ص 220
4. ڈاکٹر زور کے مرتبہ تذکرۂ مخطوطات، ڈاکٹر محمد علی اثر، مشمولہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور: حیات، شخصیت اور کارنامے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2005، ص 353
5. ایضاً
6. تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول، اعظم پریس حیدر آباد، 1943، ص 14
7. تذکرۂ اردو مخطوطات جلد دوم، ترقی اردو بیورو ایڈیشن، ص 25
8. تذکرۂ اردو مخطوطات جلد دوم، ترقی اردو بیورو ایڈیشن، ص 26
9. ڈاکٹر زور کے مرتبہ تذکرۂ مخطوطات، ڈاکٹر محمد علی اثر، مشمولہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور: حیات، شخصیت اور کارنامے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2005، ص 357
10. تذکرۂ اردو مخطوطات جلد پنجم، ترقی اردو بیورو ایڈیشن، ص 5
11. ایضاً، ص 5-6
12. ڈاکٹر زور اور مخطوطات کے تذکرے، محمد اکبر ایوبی، مشمولہ سب رس زور نمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر 1963، ص 222-23
13. ماہنامہ سب رس، 1963

■

Dr. Mohammad Sharib
Assistant Professor
P.G. Department of Language & Literature
Fakir Mohan University,
Balasore-756089 (Odisha)
Mob.: 7032775100
Email: mohdsharibkhan54@gmail.com

محسن کاکوروی کی نعت گوئی

ہندوستانی تہذیب کے تناظر میں

سعود عالم

نعت ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو غزل کی ہیئت میں بھی لکھی جاتی ہے اور قصیدے کی ہیئت میں بھی۔ مثنوی کی ہیئت میں لکھی جاتی ہے تو رباعی ودیگر اصناف کی ہیئت میں بھی۔ اسی طرح نعت مسدس اور دیگر فارمیٹ میں بھی لکھی جاتی ہے لیکن نعت کے لیے جتنی موزوں قصیدہ اور غزل کی ہیئت ہے دوسری کوئی ہیئت نہیں۔ باوجود اس کے محسن کاکوروی کے قصیدے کے علاوہ مثنویوں میں بھی جا بجا نعتیہ عناصر نظر آتے ہیں۔

محسن کاکوروی نے اپنا پہلا قصیدہ سولہ سال کی عمر میں لکھا تھا جو 'گلدستہ کلام رحمت' کے نام سے 1258ھ بمطابق 1842 میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ دراصل ان کا نعتیہ قصیدہ تھا، جس کا مطلع کچھ اس طرح ہے۔

پھر بہار آئی کہ ہونے لگے صحرا گلشن
غنچہ ہے نامِ خدا نافۂ آہوئے ختن

محسن کاکوروی کا سب سے مشہور قصیدہ مدیحِ خیر المرسلینؐ ہے۔ یہ قصیدہ 1293ھ بمطابق 1876ء میں منصۂ شہود پر آیا، (یعنی 34 سال بعد) جس کا مطلع کچھ اس طرح ہے۔

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدان گوکل
جاکے گنگا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ امل

قصیدے کا پہلا جز تشبیب ہوتا ہے، جس کو نسیب بھی کہتے ہیں۔ تشبیب میں ہر طرح کے مضامین کی گنجائش ہوتی ہے۔ (عربی قصیدے کی روایت تھی کہ ابتدا میں شاعر اپنے عہدِ جوانی کو یاد کرتا تھا اور محبوبہ کے قبیلے کے آثار و باقیات کو دیکھ کر آنسو بہاتا تھا۔ یہ روایت کئی سو سال تک رہی۔ ایرانی شعرا نے تشبیب میں دو نئے عناصر کا اضافہ کیا۔ عارفانہ/حکیمانہ تشبیب اور دوسری بہاریہ) محسن نے یہ قصیدہ بہاریہ روایت کی پاسداری میں لکھا۔ بہاریہ کی جگہ 'برشگالی' موسم برشگال 'بہار ہند' بھی کہا گیا۔ محسن نے اس قصیدے کو مرزا سودا کے لامیہ قصیدے کی تقلید میں لکھا، جب کہ سودا نے عرفی سے لیا، ممکن ہے عرفی نے انوری و خاقانی کا تتبع کیا ہو۔ بہرحال سودا کی تشبیب یکسر بہاریہ ہوتی ہے، مثلاً ''اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستان سے عمل۔ محسن نے اس میں یہ جدت پیدا کی کہ بہار کی جگہ برشگال کو لے آئے اور مبالغے میں کمی نہیں کی، اور ایک اجتہاد یہ کیا کہ اس وقت کے شمالی ہند کے ہندو تمدن اور رسوم ورواج کو منظرنامے کا حصہ بنادیا۔ اس وجہ سے لوگوں نے محسن کاکوروی کے مذکورہ بالا قصیدے پر اعتراض کیا اور کہا کہ محسن نے نعتیہ قصیدے کا آغاز کاشی، متھرا، گوکل اور گنگا جل جیسے الفاظ سے کیسے کیا جو کہ نعت کے بالکل خلاف ہے یعنی نعتِ رسولؐ میں مناسبات کفر کا استعمال غیر مشروع ہے۔ چنانچہ اس اعتراض کا جواز امیر مینائی نے صحابیِ رسول حضرت کعب بن زہیر بن ابی سلمٰی کے ایک قصیدے سے نکالا جس میں کعب نے ابتدائے اسلام میں اللہ کے رسول کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جس سے خوش ہوکر اللہ کے رسول نے انھیں اپنی ردائے مبارک عنایت کی تھی، جس کی تشبیب بھی غیر مشروع تھی۔ یہ قصیدہ دنیائے ادب میں 'قصیدہ بردہ' کے نام سے موسوم ہے۔

بَانَتْ سُعَادُ فَقَلْبِي اليَوْمَ مَتْبُولُ
مُتَيَّمٌ إِثْرَهَا، لَمْ يُجْزَ، مَكْبُولُ
وَمَا سُعَادُ غَدَاةَ البَيْنِ إِذْ رَحَلُوا
إِلَّا أَغَنُّ غَضِيضُ الطَّرْفِ مَكْحُولُ

مذکورہ بالا اشعار سے یہ جواز نکالا ہے کہ قصیدے کی تشبیب میں ہر طرح کے مضامین کی گنجائش ہوتی ہے۔ ایسے میں محسن کاکوروی کا اپنے نعتیہ قصیدے میں ان الفاظ کا استعمال کرنا جو خالص ہندوستانی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے، کسی بھی صورت میں غیر موزوں و غیر مشروع نہیں۔

یاد رہے کہ معترضین کے جواب میں خود محسن کاکوروی کو صفائی کے طور پر چند اشعار پیش کرنے پڑے، وہ کہتے ہیں۔

پڑھ کے تشبیب مسلماں مع تمہید و گریز
رجعتِ کفر بایماں کا کرے مسئلہ حل
کفر کا خاتمہ بالخیر ہوا ایماں پر
شب کا خورشید کے اشراق سے قصہ فیصل
ظلمت اور اس کے مکارہ میں ہوا طولِ سخن
مگر ایمان کی کہیے تو اسی کا تھا محل
مدعا یہ ہے کہ رندوں کی سیہ بختی سے
ظلمتِ کفر کا جب دہر میں چھایا بادل
ہوا مبعوث فقط اس کے مٹانے کے لیے
سیفِ مسلول خدا نورِ نبی مرسل

محسن کاکوری نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو اس وقت پورے ہندوستان میں اور بالخصوص لکھنؤ میں شیخ امام بخش ناسخ (1254ھ 1838) کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ آتش، مصحفی، غالب اور مومن سب کے سب طرز ناسخ کے قائل تھے اور ان کے پیروکار بھی۔ یہ لوگ اس وقت ناسخ کے کلام کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ یہ منظر بالکل ویسا ہی تھا جیسے کم وبیش دو سو سال قبل دیوان ولی کی دہلی آمد پر شاہ حاتم اور ان کے معاصرین نے رنگ ولی کو دیکھا تھا اور قبول کیا تھا۔ اس تناظر میں غالب لکھتے ہیں:

''مومن خاں نے شاہ نصیر کے طرز کو چھوڑ کر ناسخ

کے طرز پر غور کیا، اور فارسی کی تراش خراش پر توجہ کی۔ ادھر میں نے بھی.....''

(بحوالہ جلوۂ خضر، ج، اوّل، صفیر بلگرامی، ص 237، آرہ، بہار 1884)

ایسے حالات و ماحول میں بھلا کیسے ممکن تھا کہ محسن کاکوروی شاعری کے اس چڑھتے سورج سے دور رہتے۔ وہ اسی سرزمین میں پیدا ہوئے، یہیں پلے بڑھے اور اسی ہندوستانی فضا میں پروان چڑھے۔ یہ ملک کئی ہزار برس قدیم تہذیب کا وارث ہے، حکمت و دانائی اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی میں روم اور یونان اس کے شاگرد کہے جاتے ہیں۔ یہاں ایسی عبادت گاہیں ہیں جہاں لوگ زیارت کو جاتے ہیں۔ یہاں ایسے دریا ہیں جن کی تقدیس کی جاتی ہے۔ ایسے میں ہندوستانی شعرا کی شاعری میں اس کا اثر تو آنا یقینی تھا اور یہی تمام چیزیں محسن کاکوروی کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ محسن نے اپنی شاعری کا رنگ ناسخ کے رنگ سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی راہ الگ بنانے کی کوشش کی تھی، اس سلسلے میں وہ کس حد تک کامیاب ہوئے اس کے بارے میں جمیل جالبی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''محسن کاکوروی نے موضوع کی مناسبت سے عشق اور جذبے کو اپنی شاعری میں قائم کیا اور ناسخ لکھنوی کی مضمون آفرینی کو قبول کرتے ہوئے بھی، ہندی الاصل الفاظ کو اپنے کلام میں پوری طرح استعمال کیا اور ہندو مسلم کلچر کی روایت اور رنگ کا ایسا امتزاج پیش کیا جو محسن کی انفرادیت اور ان کی اصل پہچان ہے۔''

(بحوالہ مضمون، محسن کاکوروی کی شعری کائنات، ص 90)

اگر ہم اس قصیدے کے پہلے شعر پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ شاعر کس چابک دستی سے الفاظ کو استعمال میں لایا ہے۔ محسن نے اس قصیدے میں کاشی، متھرا اور گنگا جل جیسے الفاظ استعمال کرکے ہمارے سامنے ہندو تہذیب کے کچھ بنیادی رنگ ابھار دیے ہیں۔ دوسرے شعر میں گوکل اور اشنان جیسے الفاظ نے اس تصور کو مزید واضح کر دیا ہے۔ ہندی الفاظ کی کثرت سے گرچہ عربی و فارسی الفاظ (برق، صبا اور سروقداں) دب کر رہ گئے ہیں باوجود اس کے ان الفاظ کی انفرادیت پر کوئی آنچ نہیں آتی بلکہ ان کی امتزاجیت سے ان میں مزید چار چاند لگ جاتا ہے۔ 'برق' عربی زبان کا لفظ ہے، 'صبا' فارسی کا لفظ ہے اور 'سروقد' بھی عجم کی تہذیبی روایت کو سامنے لا رہا ہے۔ خاص طور پر 'سروقد' کا تصور ہندو تہذیب و اساطیر سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ ہندو جمالیات میں قامتِ بالا کا کوئی تصور نہیں۔ محبوب کے قامت کی درازی خالص اسلامی عجمی تصور ہے، جس کی اپنی جمالیات ہے۔ اس تصور کو غالب نے بھی نکھارا ہے۔

سایے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قد و قامت سے جو گلزار میں آوے

الغرض 'سروقدان گل' کی ترکیب میں 'گوکل' بے شک ہندی الاصل لفظ ہے لیکن 'سروقد' کا تصور اسلامی تہذیب کی یاد دلاتا ہے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھیں تو صرف یہی دو شعر برصغیر میں پروان چڑھنے والی ہند اسلامی تہذیب کی صورت گری کے لیے کافی ہیں۔

محسن کاکوروی کا کلام ہندوستانی تہذیب کا عدیم المثال کارنامہ ہے۔ وہ ہندو مسلم کلچر کے پروردہ تھے۔ عالم طبعی اور عالم خاکی دونوں کا وہ احترام کرتے تھے۔ ان کے کلام میں اجتماع ضدین کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اردو ادب میں روز اول سے رام چندر اور شری کرشن اور دیگر ہندو میتھولوجی کو جگہ ملتی رہی ہے اور اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو سیکولر زبان کی حیثیت سے اپنا الگ مقام رکھتی ہے۔ ایسے میں محسن کاکوروی کے کلام میں ہندوستانی تہذیبی عناصر کا پایا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ محسن نے عالم طبعی کو جس کیف کے ساتھ قبول کیا اور اپنی شاعری میں برتا اس کی مثال ان کی دیگر نظموں میں بہت کم دیکھنے ملتی ہے لیکن جہاں تک ان کے نعتیہ قصیدے کا تعلق ہے تو اس میں فطرت اور انسان ایک دوسرے میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ عوام کا بیان فطرت کی اصطلاح میں اور فطرت کا بیان انسانی زندگی کی اصطلاح میں ضم ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں ان کے قصیدے سے یہ اشعار۔

خبر اڑتی ہوئی آتی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
دھر کا ترسا بچہ ہے برق لیے جل میں آگ
ابر چوٹی کا برہمن ہے لیے آگ میں جل
ابرِ پنجاب تلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم
برق بنگالہ ہے ظلمت میں گورنر جنرل
جوگیا بھیس کیے چرخ لگائے ہے بھبھوت
یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل
خوب چھایا ہے سر گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنہیا کے ہے ڈوبا بادل
دلِ بے تاب کی ادنیٰ سی چمک ہے بجلی
چشمِ پُر آب کا ہے ایک کرشمہ بادل
راجا اندر ہے پری خانۂ مے کا پانی
نغمۂ نے ہے سری کرشن کنہیا بادل

مذکورہ بالا اشعار کے بارے میں محمد حسن عسکری اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ''محسن نے عناصر فطرت میں ایسی زندگی کی لہر دوڑائی ہے، روح فطرت کی تازگی اس طرح نچوڑی ہے، انسان اور فطرت میں وہ انضباط پیدا کیا ہے کہ صرف ہند اسلامی تہذیب میں نہیں بلکہ پوری اسلامی تہذیب میں اس نظم کا ایک خاص مقام ہے۔''

(بحوالہ مضمون، محسن کاکوروی، ص 83-82)

محسن کی شاعری کا بڑا حصہ نشاطیہ لے اور راگ سے تخلیق ہوا ہے۔ وہ رسول اللہؐ کے واحد حقیقی عاشق ہیں جو وہ شوخی بھی کرتے ہیں اور اس شوخی میں ہندو تصور بھکتی (عشق) کا اثر بھی ملتا ہے، لیکن وہ حد ادب کو پار نہیں کرتے۔ محسن کا معشوق ہر دم نئے نئے دل کش رنگ اور دل فریب روپ میں سامنے آتا ہے۔

محسن کاکوروی نے فطرت کے علاوہ مقامی عناصر میں سرشار ہو کر بھی اپنی شاعری میں اسلامی تصورات کو پیش کیا ہے۔ ہندوستان میں ایسے کئی اہم مقامات ہیں جن کا ذکر انھوں نے اپنے اس قصیدے میں کیا ہے۔ ان میں، کاشی، متھرا اور گوکل قابل ذکر ہیں۔ کاشی: جسے بنارس اور ونارس بھی کہتے ہیں، یہ شمال مشرقی ہند میں اساطیری دریائے گنگا کے کنارے آباد ہے۔ اسے مندروں کا شہر بھی کہتے ہیں اور یہ تقدس کے اعتبار سے ہندوستان کے (ہندوؤں کے نزدیک) سات بڑے تیرتھوں میں غالباً سرفہرست ہے۔ یہ شہر عین گنگا کے کنارے آباد ہے، ہندو متھ کے مطابق گنگا ندی اس شہر کے قدموں میں بہہ رہی ہے، یعنی شہر کا تقدس اپنی جگہ، لیکن گنگا کا تقدس باقی ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ متھرا: ہندوؤں کا ایک مقدس مقام ہے جو آگرہ سے بیس اکیس میل شمال مشرق میں دریائے جمنا کے کنارے آباد ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ وہ سری کرشن مہاراج کی جنم بھومی ہے جو ہندوؤں کے اوتار ہیں۔ گوکل: متھرا سے پندرہ میل دور ایک قصبہ ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کرشن مہاراج کا بچپن اسی قصبے میں گزرا تھا۔ گنگا: ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق گنگا کا پانی مقدس ترین ہے، قرب و جوار اور دور دراز کے علاقوں میں بھی لوگ از راہِ عقیدت اُسے منگواتے/لاتے ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں رکھتے ہیں۔ یہ تمام تلمیحات چشم زدن میں ہمارے سامنے ہندو تہذیب کے بنیادی رنگ اُبھار دیتی ہیں، اسی طرح دوسرے شعر میں ''گوکل'' اور ''اشنان'' جیسے الفاظ اس تصور کو مزید واضح کر دیتے ہیں۔

اس قصیدے کا مرکزی کردار 'بادل' (میگھ) ہے۔ ہندی اور سنسکرت شاعری میں 'میگھا' کو خاص اہمیت حاصل

ہے۔ مہاکوی کالی داس کی شہرۂ آفاق نظم 'میگھ دوت' (قاصدِ ابر) اس کی ایک بہترین مثال ہے۔ محسن کی تشبیب 'بادل' بھی کچھ یہی بیان کررہی ہے کہ وہ برق کے کاندھے پر، گنگا جل کاشی سے متھرا اور گوکل کی طرف لارہا ہے تاکہ متھرا اور گوکل والوں کو بنارس کے سفر کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

اس قصیدے میں 'بادل' کے قافیے پر دو غزلیں ہیں۔ ایک غزل دورانِ تشبیب کی ہے۔ یعنی بحرِ ظلمات کی اور دوسری غزل گریز کے بعد کی ہے۔ دونوں غزلوں کے فرق سے اندازہ ہوجائے گا کہ شاعر نے کس خوبی اور جدت ادا سے انھیں استعمال کیا ہے۔ دونوں کے بیانیے، دونوں کی روایات اور دونوں کی تلمیحات مختلف ہیں، باوجود اس کے دونوں ایک ہی قصیدے کا جزو لاینفک ہیں۔ یہی ہماری تہذیب اور سنسکرتی کی انفرادیت ہے جو ادب اور سماج دونوں کو آپس میں جوڑتی ہے۔ موازنہ کے طور پر ملاحظہ ہوں دونوں غزلیں۔

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
تیرتا ہے کبھی گنگا، کبھی جمنا بادل
سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برج میں آج سری کرشن ہے کالا بادل
خوب چھایا ہے سر گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنہیا کے ہے ڈوبا بادل
سطحِ افلاک نظر آتی ہے گنگا جمنی
روپ بجلی کا سنہرا ہے روپہلا بادل
بجلی دو چار قدم چل کے پلٹ جائے نہ کیوں
وہ اندھیرا ہے کہ پھرتا ہے بھٹکتا بادل
میری آنکھوں میں سماتا نہیں یہ جوش وخروش
کسی بے درد کو دکھلائے کرشمہ بادل
دل بے تاب کی ادنیٰ سی چمک ہے بجلی
چشمِ پُرآب کا ہے ایک کرشمہ بادل
تپشِ دل کا اُڑایا ہوا نقشہ بجلی
چشمِ پُرآب کا دھویا ہوا خاکہ بادل
اپنی کم ظرفیوں سے لاکھ فلک پر چڑھ جائے
میری آنکھوں کا ہے اُترا ہوا صدقہ بادل
دیکھتا گر کہیں محسن کی فغاں و زاری
نہ برستا کبھی ایسا نہ گرجتا بادل

اب ان کی دوسری غزل کے اشعار ملاحظہ کیجیے جو گریز سے پہلے کے اشعار ہیں۔

کیا جھکا کعبے کی جانب کو ہے قبلہ بادل
سجدے کرتا ہے سوئے یثرب و بطحا بادل
چھوڑ کر بت کدۂ ہند و صنم خانہ برج
آج کعبے میں بچھائے ہے مصلّا بادل
بحرِ امکاں میں رسولِ عربی درِّ یتیم
رحمتِ خاصِ خداوند تعالیٰ بادل
قبلۂ اہلِ نظر کعبۂ ابروئے حضور
موئے سرِقبلہ کو گھیرے ہوئے کالا بادل
دور پہنچی لبِ جاں بخش نبی کی شہرت
سن ذرا کہتے ہیں کیا حضرتِ عیسیٰ بادل
چشمِ انصاف سے دیکھ آپ کے دندان شریف
دُرِّ یکتا ہے ترا، گرچہ یگانا بادل
تھا بندھا تار فرشتوں کا درِ اقدس پر
شبِ معراج میں تھا عرشِ معلّیٰ بادل
تو وہ فیاض ہے دَر پر ترے سائل کی طرح
فلکِ پیر کو لایا دیے کاندھا بادل
تیغ میدانِ شجاعت میں چمکتی بجلی
ہاتھ گل زارِ سخاوت میں چمکتا بادل

ان دونوں غزلوں کے درمیان حسین گریز کا استعمال ہوا ہے۔ یاد رہے، ہدایت کا متلاشی کبھی مایوس نہیں ہوتا، وہ اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ پورب، پچھم ہر طرف جاتا ہے اور آخری سانس تک کامیابی کے پیچھے لگا رہتا ہے اور ایک نہ ایک دن اسے ضرور کامیابی ملتی ہے۔ شاعر نے ان کو اشارہ، کنایہ، استعارہ اور اسلامی تلمیحات کی روشنی میں بخوبی استعمال کیا ہے۔

گرتے پڑتے ہوئے مستانہ کہاں رکھا پاؤں
کہ تصور بھی جہاں جا نہ سکے سر کے بل
یعنی اس نور کے میدان میں پہنچا کہ جہاں
خرمنِ برقِ تجلّی کا لقب ہے بادل
تارِ بارانِ مسلسل ہے ملائک کا ورود
پئے تسبیحِ خداوندِ جہاں عزوجل
کہیں طوبیٰ کہیں کوثر کہیں فردوس بریں
کہیں بہتی ہوئی نہرِ لبن و نہرِ عسل
گلِ بیرنگیِ مطلق کے لہکتے گلزار
بے نیازی کے ریاحیں کے مہکتے جنگل
باغِ تنزیہہ میں سرسبز نہالِ تشبیہ
انبیا جس کی ہیں شاخیں عُرفا ہیں کونپل

اس حسین گریز کے بعد شاعر مدح کی طرف لوٹتا ہے اور انوار عالم کا ایسا نقشا کھینچتا ہے کہ سارا مدوجزر اسلام آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتا ہے۔ اور تمام معترضین کو بھی جواب مل جاتا ہے کہ یہ قصیدہ گل وبلبل کی زبان میں یا پرندوں اور حیوانوں کے استعارے میں نہیں بلکہ بادل اور بارش کے استعارے میں بیان ہوا ہے، کیوں کہ بادل رحمتِ خداوندی اور عطائے آسمانی ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کہاں کس طرح کی بارش ہے، ضلال وظلمت کی یا نورِ ہدایت کی، وہ اس طلب میں کاشی اور متھرا جاتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ شاید بادل کی گردش ان ہی دو شہروں میں محصور ہے اور ایک خاندان یا ذات کے لیے محدود ہے۔ اور اس کو ایسا لگتا ہے جیسے یہ بادل سیاہ اور بھیانک ہوں اور ساری دنیا میں صرف انھی کا عمل دخل ہو۔

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

اور یہ 'ابر سیاہ' ان منازل کی طرف بڑھ رہے ہیں جہاں سے سارے عالم کے لیے خیر وبرکت کا مینہ برسا کرتا تھا۔ دین براہیمی کا جو مرکز تھا۔

جانبِ قبلہ ہوئی یورشِ ابرِ سیاہ
کہیں پھر کعبہ پہ قبضہ نہ کریں لات وہبل

لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ ان مقاماتِ زیارت میں جہاں لوگ ہدایت کے لیے جاتے ہیں ان کے لیے یہی 'بادل' ابر رحمت بن جاتا ہے۔ اور اسلام کی علامت بن جاتا ہے۔

اس کے بعد شاعر مدح کی طرف لوٹتا ہے۔ مدح کے بعد محسن نے اس قصیدے کا اختتام مناجات پر کیا ہے۔

اس قصیدے کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے یہ ہے:

''محسن کاکوروی کی نعتوں کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی کلچر اسی طرح شامل ہے جس طرح عربی وفارسی کلچر معنی واظہار کے رگ وپے میں شامل ہے۔ میر انیس کے مرثیوں میں حضرت امام حسین اپنے طور طریقوں، ادب آداب اور طرزِ فکر وعمل سے لکھنوی دکھائی دیتے ہیں لیکن محسن کی نعتوں میں ان کا ممدوح اپنے اصلی روپ میں قرآن وحدیث کے مستند حوالوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور ساتھ ہی ہندو مسلم کلچر محسن کے مزاج، ان کے بیان اور فکر میں موجود رہتا ہے۔ ان نعتوں کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نعتیں صرف اور صرف ''ہندو مسلم کلچر'' کا پروردہ ہی کہہ سکتا تھا۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے محسن کی جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے اس کے دو پہلو اہم ہیں۔ ایک ان کا عقیدہ وایمان جس پر وہ پوری طرح عامل ہیں اور دوسرے یہ پہلو کہ ان نعتوں کا شاعر عرب میں نہیں، بلکہ ہندوستان میں رہتا ہے جہاں کی روایتِ فکر میں کرشن اور بھگوت گیتا دونوں کے اثرات شامل ہیں۔''

■

Dr. Saud Alam
Dept of Urdu
C. M. College
Darbhanga- 846004 (Bihar)
Mob: 9818675498
saudalam1983@gmail.com

اکیسویں صدی میں ناول نگاری اور چند غیر مسلم ناول نگار

مدثر احمد گنائی

اردو کی ترقی اور آبیاری کے حوالے سے جہاں مسلم قلمکاروں نے اپنے قلم سے اس زبان کو وقار بخشا وہیں غیر مسلم قلمکار بھی اس میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ جہاں تک اردو ناول میں غیر مسلم ناول نگاروں کی بات ہے تو اس حوالے سے بھی ہمیں بہت سے اہم نام دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، جوگندر پال، کشمیری لال ذاکر وغیرہ اہم ہیں۔ چونکہ اکیسویں صدی کو فکشن کی صدی کہا جاتا ہے اس لیے راقم نے اس مضمون میں موجودہ صدی کے غیر مسلم ناول نگاروں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جنھوں نے اردو کی بیشتر اصناف میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے، انھیں اردو، ہندی اور پنجابی تینوں زبانوں پر دسترس تھی۔ وہ بیک وقت ایک افسانہ نگار، ناول نگار، شاعر، خاکہ نگار اور ایک صحافی کی حیثیت سے اردو ادب میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوئے۔ مختلف موضوعات پر ان کی سو سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں کئی افسانوی مجموعے، ناول، ڈرامے، خاکے اور شاعری وغیرہ شامل ہیں۔ جہاں تک کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری کا تعلق ہے، تو انھوں نے اردو ادب کو کئی اہم ناول دیے جن میں سندور کی راکھ، سمندر، صلیب اور وہ، انگھوٹھے کا نشان، کرماں والی، دھرتی سدا سہاگن، لمحوں میں بکھری زندگی، ڈوبتے سورج کی کتھا، آدھی رات کا چاند، لال چوک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ کشمیری لال ذاکر کے اکثر ناولوں میں کشمیر کی دیہاتی زندگی کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ چونکہ ناول نگار اپنے سماج سے جڑا ہوا ہوتا ہے اسی کے پیش نظر کشمیری لال ذاکر نے بھی کشمیر کے سماجی و سیاسی مسائل کو اپنے ناولوں میں برتنے کی کوشش کی اور ایک صحت مند سماج کی خواہش بھی کرتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں انھوں نے اردو ادب کو تین ناول دیے جن میں آخری ادھیائے، دردِ بے زبان اور لال چوک شامل ہیں۔ 'آخری ادھیائے' کا موضوع ایڈز کی جان لیوا بیماری ہے۔ ناول میں مصنف نے قارئین کو ان بچوں کی جانب متوجہ کرانے کی کوشش کی ہے جن کے والدین اس جان لیوا بیماری کے سبب انتقال کر گئے اور اپنے بچوں کو لاوارث اور بے یار و مددگار چھوڑ گئے۔ ناول کا پورا تانا بانا اسی کے ارد گرد گھومتا ہے۔ ناول 'دردِ بے زبان' میں سکم کے پس منظر میں مہاتما بدھ کے پیغامات کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول 'لال چوک' کشمیری لال ذاکر کا آخری ناول ہے جو 1914 میں شائع ہوا۔ اس ناول میں کشمیری لال ذاکر نے اپنے وطن کشمیر کے سیاسی منظر نامے کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کشمیر کے تشویش ناک حالات اور پنڈتوں کی ہجرت کے ساتھ ساتھ کشمیر کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کو مصنف نے کچھ اس انداز سے پیش کیا کہ ناول ایک کولاج بن گیا ہے۔

جوگندر پال

جوگندر پال بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور وہ ایک معتبر افسانہ نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں جانے جاتے ہیں۔ موصوف اپنی فکر و نظر سے ہی اردو ادب میں پہچانے جاتے رہے ہیں۔ اردو ناول نگاری میں بھی جوگندر پال نے اپنا ایک مخصوص اور منفرد اسلوب اختیار کیا ہے جو انھیں اپنے معاصر ناول نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ انھوں نے بہت سے افسانے، افسانچے اور چار ناول لکھے ہیں جن میں ایک بوند لہو (1963)، نادید (1983)، خواب رو (1991) اور پار پرے (2004) شامل ہے۔ اکیسویں صدی میں ان کا واحد ناول 'پار پرے' شائع ہوا جس کا موضوع بحر ہند میں واقع جزیرہ انڈمان نکوبار کی سیلولر جیل ہے لیکن مصنف کا کمال یہ ہے کہ وہ 'پار پرے' کے تناظر میں موجودہ دور کے ہندوستان کی سماجی و معاشی، سیاسی، تہذیبی و تمدنی، فرقہ پرستی، قومی یکجہتی اور عصری حسیت جیسے متعدد سماجی مسائل کو زیر بحث لائے ہیں۔ جوگندر پال کے حوالے سے پروفیسر قدوس جاوید اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ جوگندر پال کے افسانوں اور ناولوں میں اساطیری اور آرکی ٹائپ کے دانشورانہ برتاو سے حقائق میں بڑی تہداری اور گہرائی پیدا کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔''

(مشمولہ ریسرچ جرنل 'دستک' بنارس ہندو یونیورسٹی، شمارہ 9، 2022)

جتیندر بلو

اردو میں بہت کم ایسے لکھنے والے ہیں جنھوں نے جس صنف کو بھی ہاتھ لگایا اس میں اپنی انفرادیت قائم کی، جتیندر بلو کا شمار بھی انہی اشخاص میں کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے افسانہ اور ناول دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور دونوں میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ جتیندر بلو نے طویل مختصر افسانوں کے علاوہ تین ناول پرائی دھرتی اپنے لوگ، مہانگر اور 'وشواس گھات' لکھے ہیں۔ ان کے پہلے دو ناول بیسویں صدی میں ہی منظر عام پر آئے ہیں لیکن ان کا تیسرا ناول 2004 میں شائع ہوا جو ہر لحاظ سے ان کے پہلے دو ناولوں سے بہتر ہے۔ اس ناول کا موضوع زندگی کی وہ سچائیاں ہیں جن سے انسان ہر لمحہ دو چار ہو جاتا ہے۔ اصل میں ناول نگار انسان کے اندر کی لالچ اور خود غرضی کو دکھانے کی کوشش کرتا ہے جس کے لیے وہ اپنوں کا ہی استحصال کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور ان کے ساتھ وشواس گھات کر دیتا ہے جس سے انسانی رشتوں میں شگاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ لندن میں مقیم برصغیر کے لوگوں کے مسائل کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ چونکہ مصنف خود کافی عرصے سے لندن

میں مقیم رہ چکے ہیں اس لیے ناول میں لندن کے ماحول کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ناول سے چند سطور ملاحظہ فرمائیں:

’’بیرون ملک میں سکونت اختیار کرنے پر اسے گہرا احساس ہو چکا تھا کہ مغربی طرز زندگی کس قدر انفرادی، پیچیدہ، تیزگام اور مصروف ترین ہے۔مقامی لوگ ’وقت‘ کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں؟اس کے ساتھ پیسہ، مادی آسائش اور ذاتی خواہشات کیوں جڑی رہتی ہیں۔اور لوگ ان سے الگ کیوں نہیں ہو پاتے؟‘‘

نند کشور وکرم

چالیس سے زائد کتابوں کے مصنف نند کشور وکرم نے افسانہ نگاری، ناول نگاری اور صحافت نگاری جیسی اصناف کے ذریعے اردو ادب میں اپنی پہچان بنائی۔ انھوں نے جہاں اردو افسانے میں اپنا الگ رنگ اختیار کیا وہیں اپنے ناولوں کے ذریعے بھی قارئین کو متاثر کیا ہے۔ ان کے کل دو ناول شائع ہو چکے ہیں جن میں پہلا ناول ’یادوں کے کھنڈر‘ ہے جو 1961 میں شائع ہوا نیز ان کا دوسرا ناول ’انیسواں ادھیائے‘ 2008 میں شائع ہوا۔ اکیسویں صدی کی ناول نگاری کے فروغ میں ان کا ناول ’آخری ادھیائے‘ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔اس ناول میں انھوں نے اپنے عقیدے کو پیش کیا اور بعض فلسفیانہ سوالات بھی کھڑا کیے ہیں۔ناول میں انھوں نے معروضی حقیقت نگاری پر زور دیا ہے اور آفاقی باتوں کو مسترد کیا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ میں کسی نادیدہ خدا کو نہیں مانتا بلکہ میرے لیے نیچر ہی میرا خدا ہے۔یہ پورا ناول مصنف کے عقیدے کو سامنے لاتا ہے جس میں مصنف اپنے عقیدے کو سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اس لیے وہ زندگی کے پورے فلسفے کو سائنسی زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی سعی بھی کرتا ہے۔مصنف کے مطابق کوئی یم دوت، کوئی ملک الموت، کوئی فرشتہ یا عزرائیل انسان کی روح نہیں نکالتا ہے بلکہ یہ سارے فرضی کردار ہیں جن کو قدیم انسانوں نے لاعلمی کی وجہ سے خلق کیا ہے۔موت، خدا، جنت، جہنم، مذہبی عقائد وغیرہ جیسے سوالات کے اردگرد یہ پورا ناول گھومتا ہے جس میں انسان کے مذہبی عقائد کے بجائے سائنسی معروضیت کو ترجیح دی گئی ہے:

’’72-73 سال کی زندگی میں وکرم صاحب نے زندگی کو جیسا دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا، زندگی سے متعلق جیسے جیسے سوالوں سے گزرے، وہ سارے سوال ’انیسواں ادھیائے‘ کے طور پر قاری کے سامنے رکھ دیے۔‘‘

(مشمولہ: اردو ناول کا تنقیدی جائزہ، احمد صغیر، ص 208)

انل ٹھکر

انل ٹھکر ایک ہمہ پہلو شخصیت کے مالک تھے وہ بیک وقت ایک ادیب بھی تھے اور ڈراما نگار بھی، افسانہ نگار بھی تھے اور ناول نگار بھی نیز ایک بہترین ہدایت کار بھی تھے اور ایک بہترین مصور بھی۔انھوں نے ناول نگاری کا آغاز ہی اکیسویں صدی میں کیا۔ان کے چھ ناول منظر عام پر آچکے ہیں جن میں اوس کی جھیل (2002)، خوابوں کی بیساکھیاں (2008)، رشتے (2012)، گم شدہ شناخت (2014)، پس اشک (2017) اور گناہ کبیر (2019) قابل ذکر ہیں۔اوس کی جھیل ہندوستانی معاشرت کے ہر پہلو کو سامنے لاتا ہے۔معاشرتی انحطاط اور سماجی برائیوں کی صاف جھلکیاں اس ناول میں دکھائی دیتی ہے۔ رشوت، سیاسی سازشیں، مہنگائی، افلاس، سکولوں اور کالجوں میں داخلے کے لیے دھاندلیاں، پرموشن سے لے کر دفتر کی فائل تک سب رشوت کے دلدل میں گرفتار ہیں۔گویا یہ پورا ناول سماجی حقائق کو تخلیقی انداز میں قاری کے سامنے لانے میں کامیاب ہوا ہے۔اس ناول کے بارے میں سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

’’مجھے خوشی ہے کہ اردو میں ایک اچھے ناول کا اضافہ ہو رہا ہے جو ہماری معاشرت جو ’اوس کی جھیل‘ بن چکی ہے، کے کئی پہلوؤں کو محیط کرتا ہے۔ناول دلچسپ ہی نہیں، فکر انگیز بھی ہے۔سلیقہ سے لکھا گیا اور اہتمام سے پیش کیا گیا ہے۔‘‘ (اوس کی رات، ص 12)

’پس اشک‘ میں موصوف نے مسلمانوں کے شرعی مسئلہ تین طلاق کو موضوع بنایا ہے۔ انل ٹھکر نے اس موضوع پر اس وقت قلم اُٹھایا جب کوئی بھی مسلم قلم کار اسے برتنے سے کتراتا تھا۔اسی طرح ان کے دوسرے ناول بھی اپنے اندر موضوع اور اسلوب کی ندرت رکھتے ہیں۔

آنند لہر

آنند لہر پیشے سے وکیل ہیں لیکن وکالت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے قلم سے ادبی حلقوں میں بھی اپنا نام منوایا۔وہ ایک افسانہ نگار اور ڈراما نگار کے ساتھ ساتھ ایک منجھے ہوئے ناول نگار بھی ہیں۔کئی افسانوی مجموعوں کے علاوہ ان کے اب تک پانچ ناول اگلی عید سے پہلے (1998)، سرحدوں کے بیچ (2000)، مجھ سے کچھ کہا ہوتا (2002)، یہی سچ ہے (2008) اور نام دیو (2012) شائع ہو کر داد حاصل کر چکے ہیں۔آنند لہر اپنے افسانوں اور ناولوں میں ملک کی سرحدوں پر جنگ ختم کرنے، انسانی قدروں کو فروغ دینے اور انسانیت اور بھائی چارگی کو بڑھاوا دینے پر زور دیتے ہیں کیونکہ صوبہ جموں سے تعلق رکھنے کے سبب انھیں سرحد کے انتشار انگیز حالات کا بخوبی علم ہے۔ناول ’سرحدوں کے بیچ‘ میں انھوں نے اسی انتشار انگیز ماحول کو پیش کیا ہے نیز اس ناول میں انھوں نے ہندوستان کی تقسیم اور سرحدوں کے دونوں جانب رہنے والے لوگوں کے مسائل کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ دوسرے ناولوں سے قطع نظر ان کا اہم ناول ’نام دیو‘ اپنے علامتی اسلوب کے سبب ادبی حلقوں میں اپنی اہمیت قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ناول میں انھوں نے علامتوں کے استعمال سے انسانی زندگی اور جنسی نفسیات کے سلسلے میں خاص فضا تیار کی ہے۔

رینو بہل

رینو بہل کا ناول ’میرے ہونے میں کیا بُرائی ہے‘ 2017 میں منظر عام پر آیا۔ یہ ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک انفراد کا پتہ دیتا ہے۔جو اپنی نوعیت کا شاید پہلا ایسا ناول ہے جس میں Transgender (خواجہ سراؤں) کی زندگی کے متنوع مسائل کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس طرح یہ ناول موجودہ سماجی صورت حال کی ترجمانی میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔

آشا پربھات

’دھند میں اُگا پیڑ‘ کے بعد آشا پربھات کا ایک اور ناول ’جانے کتنے موڑ‘ 2009 میں منظر عام پر آیا۔اس ناول میں عورتوں کے ساتھ ہو رہے مظالم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ناول کا موضوع مرکزی کردار ’لتا‘ کے اردگرد گھومتا ہے۔جس میں اس کی دو زندگیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مذکورہ ناول میں بھی عورت قدیم رسوم و روایات کی پاسداری کے لیے مجبور نظر آتی ہے۔ناول میں اس بات کا تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ’لتا‘ کی طرح تہذیبی پاسداری کے جبر میں تقریباً ہر عورت اپنے ارمانوں کا قتل کرتی ہے۔خواہشات کو کچل دیتی ہے اور اپنے جذبات کا جنازہ نکالنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ اکیسویں صدی کے غیر مسلم ناول نگاروں میں بلراج ورما ’شب تاز‘ (2002)، ’گوتم‘ (2004) اور رتن سنگھ ’سانسوں کا سنگیت‘ وغیرہ قابل ذکر ہیں جو اردو ناول نگاری کو وسعت دینے میں ہنوز اپنا زور قلم صرف کر رہے ہیں۔الغرض مسلم ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم ناول نگار بھی اکیسویں صدی کو فکشن کی صدی بنانے میں یکساں طور پر اپنا زور قلم صرف کر رہے ہیں۔

■

Mudasir Ahmad Ganie
Research Scholar, Dept of Urdu
University of Hyderabad
Hyderabad-500046 (Telangana)
Mob.:7006824655

محمد فرقان عالم

دارالمصنّفین اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی تحقیقات

دارالمصنفین اعظم گڑھ، قیام (1914) شبلی کی ہمہ جہت شخصیت کا فکری مرکز ہے اور ان کے بلند خوابوں کی حقیقی تعبیر بھی، یوں تو اس کا باقاعدہ قیام شبلی کی وفات کے بعد عمل میں آیا تاہم اس کا اصل اور بنیادی خاکہ شبلی کی زندگی میں ہی مرتب ہو گیا تھا، جس میں ان کے لائق شاگردوں، حمید الدین فراہی، سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی کے ذریعے بعد میں مکمل رنگ بھرا گیا اور اس طرح بقول خورشید نعمانی دارالمصنفین کے مقاصد حسب ذیل قرار پائے:

''1. ملک میں اعلی مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا۔
2. بلند پایہ کتابوں کی تصنیف وتالیف اور ترجمہ۔
3. تصنیف شدہ کتابوں اور دیگر علمی وادبی کتابوں کی طباعت واشاعت کا سامان کرنا۔''[1]

چونکہ شبلی عمدہ تحقیق، گہری علمیت اور بہترین انشا پردازی کے نہ صرف یہ کہ نظری قائل تھے بلکہ زبردست عملی مثال بھی تھے، یہی وجہ ہے کہ یہاں کے رفقا نے دارالمصنفین کے مندرجہ بالا نظری مقاصد کے ساتھ شبلی کی عملی کاوشوں کے تتبع کو بھی پیش نظر رکھ کر آگے بڑھنے کی کوششیں کیں اور اسلامیات و ادبیات کو مرکز بنا کر تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کی منفرد، متنوع اور جامع کتابیں تصنیف کیں، جو نہ صرف یہ کہ اندرون ملک بلکہ بیرون ممالک میں بھی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی گئیں اور تحقیقی ذوق کے لیے سامان تسکین بنیں۔ آج بھی دارالمصنفین کی کیٹلاگ، کتابوں کے مشتملات اور موضوعات کے تنوع کو دیکھ کر غیر معمولی حیرت ہوتی ہے۔ ذہن میں یہ سوال بھی کوندتا ہے کہ کیا ایک ہی ادارے کے تمام تر افراد کی کاوشیں اتنی معیاری، تحقیقی اور زبان و بیان کے اوصاف سے متصف ہوسکتی ہیں؟ اس کا جواب بھی 'اخلاص' اور 'اختصاص' جیسے الفاظ سے بن پڑتا ہے، ان الفاظ کے مکمل عناصر شبلی کے ساتھ ان کے تربیت یافتگان میں یکساں طور پر پائے جاتے تھے، جس کی وجہ سے گرانقدر تصانیف کے غیر معمولی ذخائر آج بھی علمی دنیا کے خوان نعمت کی زینت ہیں۔

دارالمصنفین کے اہم معماروں اور رفقا میں سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، مسعود علی ندوی، ریاست علی ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمن، ابو الحسنات ندوی، ابوظفر ندوی، عبدالباری ندوی، سعید انصاری، عبدالسلام قدوائی ندوی اور ضیاء الدین اصلاحی وغیرہ جیسے اہم ناموں کے ساتھ ایک بہت ہی اہم اور مستند نام پروفیسر نجیب اشرف ندوی (1968-1900) کا بھی ہے۔

نجیب اشرف ندوی ایک طرف ندوۃ العلما لکھنؤ کے تعلیم یافتہ، شبلی کے فیض یافتہ اور سید سلیمان ندوی کے خاص تربیت یافتہ تھے، تو دوسری طرف ان کا آبائی وطن دیسنہ، جائے پیدائش مہاراشٹر، اعلی تعلیم کے مراکز بہار، یوپی اور بنگال جبکہ تدریسی فرائض کی انجام دہی کے صوبے گجرات اور مہاراشٹر تھے، اس طرح دیکھا جائے تو اہم اداروں سے استفادہ اور عظیم شخصیات کے زیر تربیت ہونے کی وجہ سے ان کی علمی زندگی جہاں تحقیق کی گہرائی، تاریخ کی گیرائی اور فکر کی بلندی کے اعتبار سے مضبوط، مستحکم اور پختہ نظر آتی ہے وہیں ملک کے الگ الگ خطوں کی خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر لینے کی وجہ سے ذہنی کشادگی، قلبی وسعت کے ساتھ ان کی شخصیت بہت ہی معتدل اور متوازن معلوم ہوتی ہے، اس طرح کہنا چاہیے کہ دونوں ماحول کے ملاپ سے جو آمیزہ تیار ہوتا ہے، اس سے نجیب اشرف ندوی کی علمی زندگی کے ساتھ شخصی زندگی بھی ہم آہنگ نظر آتی ہے، جس کی کسی حد تک تائید صباح الدین عبدالرحمن کے ان جملوں سے بھی ہوتی ہے:

''ان کا وطن بہار تھا، بچپن مدھیہ پردیش میں گذرا، تعلیم بنگال میں پائی، اپنی جوانی کے بہترین ایام یوپی میں گذارے، ملازمت بمبئی میں کی اور یہیں سپرد خاک بھی ہوئے، ان پانچوں صوبوں میں رہنے کی وجہ

سے ان میں بیچ شیل بے تعصبی، رواداری، فراخدلی، سیر چشمی اور حقیقت پسندی آگئی تھی۔"[2]

نجیب اشرف ندوی کے علمی کارناموں میں مقدمہ رقعات عالمگیر 1926 اور رقعات عالمگیر 1926 کی تالیف کے ساتھ لغات گجری 1962 کی تدوین اور مضامین و تراجم شامل ہیں، ابتدائی مضامین میں 'شیر شاہ سوری' اور 'پان کی کہانی' اہم ہیں جو بقول ریاست علی تاج زمانہ کانپور 1916 اور پردہ نشین آگرہ 1920 میں شائع ہوئے[3] عہد ماقبل جوانی یعنی محض سولہ سے بیس سال کی عمر میں تحریر کیے گئے یہ اور اس طرح کے دیگر مضامین نجیب اشرف ندوی کی دارالمصنفین آمد کا سبب بنے، جس کا اندازہ صباح الدین عبدالرحمٰن کے درج ذیل جملوں سے لگایا جا سکتا ہے:

"استاذی المحترم نے ان کے جوہر کو اچھی طرح پرکھ لیا تھا اور اپنی محبت میں ان کو اپنا چھوٹا بھائی کہتے تھے گو وہ سگے بھائی نہ تھے، انھوں نے ان کو دارالمصنفین اعظم گڑھ بلا لیا۔"[4]

دارالمصنفین کی آمد سے لے کر زندگی کے آخری پڑاؤ تک کے دورانیہ کو، علمی کارناموں کے اعتبار سے ریاست علی تاج نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور: 1921 تا 1930 رفیق دارالمصنفین کی حیثیت سے۔

دوسرا دور: 1930 تا 1950 پروفیسر اردو کی حیثیت سے

تیسرا دور: 1950 تا دم آخر، اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے۔

مذکورہ تینوں ادوار میں پہلے دس سالہ دور کو نجیب اشرف ندوی کے علمی اور تحقیقی کارناموں کے دور زریں سے موسوم کیا جا سکتا ہے، دوسرے بیس سالہ دور میں وہ ایک کامیاب استاذ کی حیثیت سے تو نمایاں نظر آتے ہیں لیکن بحیثیت محقق اور مورخ اس سطح پر نظر نہیں آتے جس سطح پر ماقبل کے تناظر میں ان سے امید کی جا سکتی تھی، اس دور میں انہوں نے اہم لیکچرز کے ساتھ ساتھ مضامین و مقالات بھی قلمبند کیے لیکن ایک آدھ کو چھوڑ کر یہ مضامین معیار کے اعتبار سے ان کی علمی زندگی کا شناخت نامہ نہیں بن سکے، جن کی طرف صباح الدین عبدالرحمٰن کے مبنی بر شکوہ جملے کچھ اس طرح اشارہ کرتے ہیں:

"ہندوستان کے علمی ماحول کا یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ یونیورسٹی میں آکر کوئی ٹھوس علمی کام کرنا بھی چاہتا ہے تو نہیں کر پاتا، اسی لیے علمی اداروں کے بوریہ نشین اپنی بے سروسامانیوں اور مالی پریشانیوں کے باوجود جو کام کر جاتے ہیں وہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بڑے آرام دہ ایوانوں میں نہیں ہو پاتے....اس کے یہی معنی ہیں کہ علمی قوت حیدری کا بھی مدار نان شعیری پر ہے۔"[5]

صباح الدین عبدالرحمٰن کے مذکورہ جملوں میں بلا شبہ اختلاف کی گنجائش ممکن ہو سکتی ہے تاہم بحیثیت مجموعی یہ جملے سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کے متقاضی بھی ہیں۔ البتہ نجیب اشرف ندوی کے علمی کارناموں کے تیسرے دور کو بالمقابل دوسرے دور کے اس اعتبار سے بہتر کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ان کی علمی زندگی کا رخ دوبارہ تحقیقی کاوش کی طرف مڑتا نظر آتا ہے، جس کی عملی شکل کے بطور، لغات گجری، کی تدوین کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

ھندوستان کے علمی ماحول کا یہ ایک بڑا المیہ ھے کہ یونیورسٹی میں آکر کوئی ٹھوس علمی کام کرنا بھی چاھتا ھے تو نہیں کر پاتا۔اسی لیے علمی اداروں کے بوریہ نشین اپنی بے سرو سامانیوں اور مالی پریشانیوں کے باوجود جو کام کر جاتے ھیں وہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بڑے آرام دہ ایوانوں میں نہیں ھو پاتے۔۔۔۔اس کے یہی معنیٰ ھیں کہ علمی قوت حیدری کا بھی مدار نان شعیر ھی پر ھے۔

علمی کارناموں کے تینوں ادوار کی روشنی میں چند قابل غور پہلو بھی سامنے آتے ہیں وہ اس طور پر کہ انھوں نے تدریسی دور کے ماقبل اور مابعد کے ادوار کو ہی علمی کاوش اور تحقیقی جد و جہد کے لیے مختص کیا، اس کی درج ذیل وجوہات ہو سکتی ہیں۔

1. وہ تحقیقی کاوش اور تدریسی عمل کے اشتراک کو بہتر نہ تسلیم کرتے ہوں
2. دونوں کے ساتھ انصاف نہ کر پانے کے ڈر سے خود کو اس کا متحمل نہ سمجھتے ہوں
3. یا پھر انھیں یہ لگتا ہو کہ دونوں پر وقت صرف کرنے کی وجہ سے اختصاص کی عمارت میں شگاف پڑ سکتا ہے۔

مندرجہ بالا توجیہات اس لیے بھی بہت حد تک مناسب معلوم ہوتی ہیں کہ نجیب اشرف ندوی کا ایک نظریہ زود نویسی کی ناپسندیدگی کا بھی ہے، جس کو عبدالستار دلوی کے ان جملوں سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے:

"وہ اپنے طالب علموں سے یہی چاہتے تھے کہ وہ کوئی ایک پائیدار اور ٹھوس کام کریں انتقال سے تقریباً دو سال قبل مجھ سے انہوں نے کہا تھا، بیٹے! زود نویسی اچھی بات نہیں ہے، کوئی ایک کتاب لکھ کے پھینک دو، یہی بڑی خدمت ہوگی۔"[6]

محولہ بالا جملوں سے کسی حد تک اختلاف کیا جا سکتا ہے تاہم بہت حد تک اتفاق اس طور پر موزوں متصور ہوتا ہے کہ زود نویسی میں بیشتر تخلیق کاروں اور محققین کا اپنی تمام تر تخلیقات اور تصانیف کے ساتھ مکمل انصاف ممکن نہیں ہو پاتا ہے، جس کی وجہ سے بعض دفعہ فن کا قتل بھی ہوتا ہے، خیالات بھی تکرار کی منزل کو پہنچتے ہیں اور تحقیق کی دقت نظری میں کمی بھی آتی ہے، ہاں! البتہ مستثنیات تو ہر صورت حال کا لازمہ ہیں۔

زود نویسی کی ناپسندیدگی پر مبنی نجیب اشرف ندوی کے یہ جملے خود ان کی تحقیقی کاوش کے لیے موزوں ہیں، وہ عملی طور پر زود نویس نظر نہیں آتے، یہی وجہ ہے کہ تصنیف و تالیف کی دنیا میں ان کے یہاں لفظ کثرت کے بجائے قلت کی حکمرانی نظر آتی ہے لیکن اس قلت میں تحقیقی اور تاریخی کثرت اپنے تمام تر عناصر کے ساتھ اس طرح موجود ہیں کہ ان کی تصانیف کئی اہم اور ضخیم تصانیف کو اپنے اندر جذب کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، نتیجتاً اس بات کا بہت حد تک امکان ہے کہ قلت کو کثرت سے مبدل کرنے کی سوچ سے بالاتر ہو کر نجیب اشرف ندوی نے ایک وقت میں ایک ہی عمل کی انجام دہی کو اپنے لیے بہتر سمجھا ہو۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ نجیب اشرف ندوی کے علمی کارناموں کا دور زریں دارالمصنفین کا دس سالہ دور ہے۔

اس دور کے مضامین بھی تحقیقی اعتبار سے اہم ہیں جن میں تاریخ الدولتین (1922)، کیا دارا شکوہ مسیحی مرا۔؟ (معارف، اپریل 1928)، ایک تاریخی معمہ (معارف، ستمبر 1928)، دو اہم تاریخی دستاویز (معارف، مارچ 1928)، اردو اور ہندو (معارف، اپریل 1928)، اختیارات بدیعی (معارف، مارچ 1928)، اور تنقید پنجاب میں اردو (معارف، اگست 1928) وغیرہ شامل ہیں۔

حافظ محمود شیرانی کی معروف کتاب 'پنجاب میں اردو' پر نجیب اشرف ندوی کا بہت ہی اہم، تحقیقی اور معلوماتی مضمون ہے، یہ جولائی 1928 کے معارف میں ذیلی عنوان 'مقالات' کے تحت شائع ہوا، اس میں علمیت، دقت نظری، تحقیق کی گیرائی اور لسانی نقطہ نظر کا بھی بہترین ثبوت دیا گیا ہے۔

اس مضمون کی خاص بات مضمون نگار کی سنجیدگی، متانت، اور معتدل مزاجی جیسی صفات ہیں، اس کو اس

پہلو سے بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ پنجاب میں اردو 1928 میں منظر عام پر آئی یہ وہ وقت ہے جب مصنف کی اس سے قبل کی تصنیف 'تنقید شعر العجم' عروج کی منزل پر تھی، جس میں شبلی کی شاہکار پر تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے اہم بحث کی گئی تھی، ایسے میں فطری تھا کہ اپنے محسن اور مربی کے شاہکار پر تنقید کی وجہ سے نجیب اشرف ندوی کے اندر ایک قسم کی جذباتیت اور ردعمل کی کیفیت بھی پیدا ہوسکتی تھی، اس کی ایک وجہ تو 'تنقید شعر العجم' ہی ہوسکتی تھی لیکن دوسری ایک اور وجہ جو جذباتیت کا سبب بن سکتی تھی وہ عمر کے اعتبار سے عین جوانی کی منزل ہے۔ واضح رہے کہ اس مضمون کی اشاعت کے وقت بقول صباح الدین عبدالرحمٰن ''نجیب اشرف ندوی اپنی عمر کے 28 ویں پڑاؤ میں تھے''، ایسے میں جذباتیت سے قطع نظر مضبوط استدلالات اور قطعیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مضمون کو آگے بڑھانا تحقیق کی بلندتر منزل کو واضح کرنا ہے۔

اس مضمون میں لفظ اردو کے اولین استعمال، زبان کے معنی میں باقاعدہ مستعمل اور پنجابی گرامر کے الفاظ کی دلیل کارد جیسی چیزوں کو لے کر جس طرح سوالات قائم کیے گئے ہیں یا بعض خامیوں کی جس انداز میں نشاندہی کی گئی ہے ساتھ ہی کچھ اضافی چیزیں بھی جس طرز پر شامل کی گئی ہیں، ان سب کے پیش نظر ڈاکٹر مسعود حسین خان کی 'مقدمہ تاریخ زبان اردو'، بہت حد تک اس مضمون کی توسیع نظر آتی ہے گو کہ مقدمے کی تفصیلات، استدلالات اور سائنٹفک انداز کافی مضبوط، ترقی یافتہ اور Updated ہیں، اس کی وجہ ڈاکٹر مسعود حسین خان کی اسی موضوع پر باقاعدہ تحقیق ہے لیکن نجیب اشرف ندوی نے صرف ایک کتاب کو سامنے رکھتے ہوئے وہ بھی ایسی جو کہ پہلی مرتبہ نئے انداز میں اردو کے لسانی مباحث کو کسی قدر سائنٹفک انداز میں پیش کر رہی تھی، اس پر صرف ذاتی مطالعے کی روشنی میں گفتگو اور محاکمہ کیا جو بہت ہی قابل قدر بات ہے جس سے اس مضمون کی تحقیقی اور لسانی حیثیت مسلم ہوجاتی ہے۔

بلاشبہ اردو زبان کے تاریخی اور لسانی مباحث کے ذیل میں دیگر اہم تصانیف کے ساتھ قدامت اور عمدگی کی وجہ سے اس مضمون کی بھی اپنی خاص اہمیت ہے، اس کے ساتھ نجیب اشرف ندوی کی تحقیقی کاوشوں کا اہم ترین مظہر، لغات گجری، کی تدوین بھی ہے، اس کا مواد انہوں نے پنجاب میں اردو پر مضمون تحریر کرنے کے دوران ہی اکٹھا کیا تھا جس کی مزید توسیع 1962 میں ہوسکی جس کا تذکرہ لغات گجری کے دیباچے میں درج ذیل الفاظ کے ذریعے کیا گیا ہے:

''1928 میں جب محمود شیرانی مرحوم کی تاریخ آفریں کتاب، پنجاب میں اردو شائع ہوئی تو میں دارالمصنفین کے رفیق کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، یہ کتاب مجھے تبصرے کے لیے دی گئی۔ میں نے اس کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کیا اس میں امیر خسرو سے منسوب جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا انہوں نے مجھ میں قدیم اردو الفاظ و زبان کے مطالعہ کا شوق پیدا کر دیا۔''[7]

'لغات گجری' دراصل نصاب نامہ کی طرز پر ایک نامعلوم مصنف کا قدیم مخطوطہ تھا، جس کی دستیابی کے بعد داخلی شہادتوں، تاریخی تناظر، باریک بینی پر مبنی تحقیقی مطالعہ اور علم لغت (Lixiography) کی مدد سے پروفیسر نجیب اشرف ندوی نتیجے کی اس منزل پر پہنچے کہ 'لغات گجری' کی حیثیت نصاب نامہ سے زیادہ اردو کی قدیم لغت کی ہے، اس طرح کئی برسوں کی تحقیقی کاوش، علمی و عملی جدو جہد اور معاونین کے عملی تعاون سے 232 صفحات پر مشتمل اس کے متن کی ترتیب پایۂ تکمیل کو پہنچی، جس پر 50 صفحات پر مشتمل عالمانہ مقدمہ لکھ کر نجیب اشرف ندوی نے قدر و قیمت میں اضافے کے ساتھ متن کو تاریخی اعتبار سے استناد کا درجہ اس طور پر عطا کر دیا کہ اس سلسلے یا اس طرز پر کام کو توسیع بخشنے کے ضمن میں یہ معتبر حوالہ تسلیم کیا جاسکتا ہے، مقدمہ کے مشتملات کی جزئیات کے ذیل میں نجیب اشرف ندوی نے 'لغات گجری' کی اہمیت وضرورت، اردو کے ابتدائی نصاب ناموں کی تفصیلات اور موجود متن کے تاریخی مباحث، لسانی خصوصیات اور جغرافیائی تناظرات پر تجزیہ نگاری کے ساتھ جملے صرف کرنے کی کوشش کی ہے، ساتھ ہی اردو کے حوالے سے گجرات کی اولیت کو بھی مرکز نگاہ بنانے پر انھوں نے کافی توجہ صرف کی ہے، مجموعی حیثیت سے 'لغات گجری' کی تدوین نجیب اشرف ندوی کا اہم علمی کارنامہ ہے، جس کا اعترافیہ شاہ معین الدین احمد ندوی کے یہ الفاظ بھی ہیں:

''گجری لغات کی تصحیح و اشاعت، خصوصاً اس کا فاضلانہ مقدمہ ان کا ایک علمی کارنامہ ہے۔''[8]

مضامین کے ذیل میں 'تنقید پنجاب میں اردو' کے علاوہ دیگر مضامین بھی اہم ہیں، تحقیقی اشتراک کے باوجود ان تمام کی نوعیتیں مختلف ہیں اور براہ راست اردو کے تحقیقی ولسانی مشتملات سے علاقہ بھی نہیں رکھتے جبکہ مضمون 'تنقید پنجاب میں اردو' اردو کے تاریخی، مذہبی، تہذیبی اور لسانی مضمرات سے مملو ہے، مذکورہ کارناموں کے تدریجی ارتقا اور باہم ادغام واشتراک کی توجیہ یوں بھی موزوں متصور ہوتی ہے۔ 'تنقید پنجاب میں اردو' میں ایجاز کے لبادہ ہے میں اس طرح ملبوس ہوا کہ قرات کے دورانیے میں ایسا محسوس ہوتا ہے فاضل مضمون نگار نے متعلقہ مضمون کی کسی کتاب کو Minimize کر کے مضمون کا پیرایہ عطا کر دیا ہو، اس کی وجہ غیر معمولی مواد کا تمام تر Dimensions کے ساتھ مضمون میں آمیز ہونا ہے، اسی مضمون کے لیے حاصل شدہ مواد پر 'لغات گجری' کی تدوینی تعمیر اس بات کی غماز نظر آرہی ہے کہ یہ ایجاز پھر سے تدریجی طور پر اطناب کی طرف منتقل ہوگیا یعنی اس مضمون کے مواد کو Maximize کر کے ایک اہم کتاب کی منزل پر پہنچا دیا گیا ہے جس کا اشارہ ذکر کردہ دیباچے کے اقتباس میں بھی پنہاں نظر آرہا ہے

خلاصہ، یہ کہ نجیب اشرف ندوی کی تمامتر تصانیف اور بیشتر مضامین میں جو چیزیں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں ان میں علمی مباحث، تحقیقی متانت، طبیعت کی سنجیدگی، مدلل حوالے، زبان کی میانہ روی اور جذباتیت سے اجتناب جیسے اوصاف نمایاں ہیں، یہی وجہ ہے کہ ماضی کے علمی سرمایوں سے استفادہ کے ذیل میں نجیب اشرف ندوی کے سرمایوں سے استفادہ اور ان سب کو نئی قرات سے گذارنا بھی علمیت کے مراحل کے لیے ضروری متصور ہوتا ہے۔

حواشی

1. خورشید نعمانی ردولوی، پروفیسر، دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (اول) اعظم گڑھ، شبلی اکیڈمی، 2003، ص 37
2. صباح الدین عبدالرحمٰن سید، آہ! نجیب اشرف صاحب ندوی (مضمون) مشتملہ ممبئی، نوائے ادب، جنوری 1969، ص 17
3. ریاست علی تاج، نجیب اشرف ندوی شخصیت اور کارنامے، حیدرآباد، مکتبۂ شعر وحکمت، جنوری 1981، ص 101
4. صباح الدین عبدالرحمٰن سید، آہ! نجیب اشرف صاحب ندوی (مضمون) مشتملہ ممبئی، نوائے ادب، جنوری 1969 ص 7
5. ایضاً
6. عبد الستار دلوی، پروفیسر، مقالات پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ممبئی، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مارچ 2013، ص 19
7. ندوی، نجیب اشرف، لغات گجری، ممبئی، ادبی پبلشرز، شیفرڈ روڈ، 1962، ماخوذ از دیباچہ صفحہ اول
8. ماہنامہ شاعر، ممبئی، نومبر 1968 ص 55، بحوالہ سید نجیب اشرف ندوی، شمیم طارق، ساہتیہ اکادمی 2006 ص 56

■

Md. Furquan Alam
E-2/4, Okhla Vihar, Jamia Nagar
New Delhi- 110025
Mob.: 8800514745

کتبوں سے کتاب تک

عاقل زیاد

اگر یہ کہا جائے کہ کتب بینی دانشوروں کا ایک امتیاز ہے تو پہلے یہ سوال ضروری ہے کہ دانشوری کے لیے وسیلہ کیا ہے؟ ضروری نہیں کہ دانائی کے لیے کتابوں کی ضرورت ہو مگر ایک دانشور کو کتابوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اسی سے انھیں توانائی ملتی ہے اور اسی سے ان کی دانائی پروان چڑھتی ہے۔ ماقبل تاریخ سے انسانوں نے عقل وخرد کے جو منازل طے کیے اس کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ تب کتابیں موجود نہیں تھیں پھر بھی انسانی ذہنوں نے ترقی کی۔ یقیناً ان کی لغزشیں اور ان کی کوتاہیاں ان کے لیے وسیلۂ ترغیب ثابت ہوئیں اور وہ ہر دن اپنی ہی لغزشوں سے محتاط رہ کر اپنے ذہنوں کو روشنی بخشتے رہے۔ یقیناً وہ اپنے عمل کو بہتر طور پر انجام دینے کے لیے گزشتہ کمیوں سے اجتناب کر کے عصری تقاضوں کو پورا کرنے میں دن رات لگے رہے۔ اس سے انکار نہیں کہ اس وقت کسی عمل کو تکمیل دینے میں مرحلہ وار تجربوں اور مشاہدوں کو محفوظ رکھنے کی خاطر ان کے پاس کوئی آلہ نہ تھا۔ آخر کار ان کے افکار اور ان کے فطری تجسسات نے انھیں اشاراتی نشانات کی طرف مائل کیا، پھر اس کے بعد انھوں نے حرفوں کی ایجاد پر فتح حاصل کی۔ حروف وجود میں آئے تو کتبوں کی روایت شروع ہوئی اور اسی طرح جیسے جیسے ان کے اذہان روشن ہوئے انھوں نے 'پے پیرس' (ایک درخت کی چھال) دریافت کر لی اور پھر 'پیپر' یعنی کاغذ بنانے میں وہ کامیاب ہوئے۔ ظاہر ہے ان تمام کوششوں کے پس پردہ آنے والی نسلوں کے لیے تجربات ومشاہدات کو محفوظ کرنے کی حکمت عملی کارفرما تھی اور یہی عمل آج بھی جاری ہے۔

انسانی تہذیب کے ارتقا کے ساتھ ساتھ انسانوں میں اپنے تجربات ومشاہدات کو محفوظ کرنے کی روایت شروع ہوئی جو کتبوں سے کتاب تک پہنچی۔ کتابوں کا چلن شروع ہوا تو ہر آنے والی نسل یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ آخر ان کے ورثا نے ان کے لیے کیا چھوڑا ہے اور اس طرح استفادے کا عمل بھی شروع ہوگیا۔ تہذیب نے سماج کی شکل لے لی اور سماج سے مذہب پھر مذہب سے سیاست اور سیاست سے اقتدار نے جنم لیا۔ بالآخر اقتدار سے اصول وضوابط کی بنیاد پڑی اور زندگی کا مکمل ڈھانچہ معرض وجود میں آیا۔ گویا انسانوں نے سماجی نظام کا ڈھانچہ تیار کر لیا اور اس عمل میں انھیں گزشتہ تا حال تمام تر تجربات و مشاہدات نیز مکاشفات کو بروئے کار لانا پڑا۔ انسانوں کی بڑھتی آبادی اور حصول معاش سے پیدا ہونے والے مسائل نے بلاشبہ انسان کو تقابل کی جانب مائل کر دیا۔ اس طرح چین نے سب سے پہلے کنفیوشش کی ہدایات اور ان کے اقوال کو ذہانت کا معیار تصور کیا اور ملازمت میں آنے والے آسامیوں سے ان ہدایات کی بابت سوالات پوچھے جانے لگے۔ گویا وہ لوگ ملک وریاست کی نمائندگی کے لیے اہل تسلیم ہوئے جنھوں نے کنفیوشش کے اقوال سے منسلک سوالات کے صحیح جوابات دینے میں زیادہ کامیابی دکھائی۔ میرا مطمح نظر اس حکایت کی جانب نہیں کہ حضرت انسان کے اشرف ہونے کا عمل کب اور کیسے شروع ہوا، تاہم آہستہ آہستہ باقی دنیا نے کتابوں کی اہمیت کو تسلیم کیا اور کتب بینی کو عقل وفہم کا پیمانہ تصور کر لیا۔ اسلامی تاریخ کے حوالے سے دیکھیں تو نبی کریمؐ جب بشکل وحی اللہ کا پیغام سنایا کرتے تو پڑھے لکھے صحابیوں کو ہدایت دیتے کہ وہ انھیں نقل کر لیں تا کہ محفوظ رہ سکے۔ عربی تہذیب جس طرح فن عمارت سازی میں ماہر تھی اسی طرح کتابت کے فن میں یکتا ویگانہ تھی۔ صحابہ کرام علیہم اجمعین میں ایسے ماہرین کی کمی نہیں تھی جو فرمودات نبوی کو زیادہ مرصع ومسجع انداز میں کھالوں یا درختوں کی چھالوں پر نقل کر لیتے تھے۔

کاغذ کی ایجاد انسانی تہذیب کا وہ انقلاب ہے جسے 'ام الایجاد' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اسی کے دم سے کتابیں وجود میں آئیں اور انسانی تہذیب وتاریخ کو نسل در نسل منتقل کرنے میں آسانی ہوئی۔ سماج کی رنگارنگی اور پھر ان کے الگ الگ تجربات ومشاہدات کے سبب لاتعداد افکار ونظریات وجود میں آئے جس کی وجہ سے زندگی کے متعدد شعبہ جات ظہور پذیر ہوئے۔ فلسفے، حکمت، ادبیات، تاریخ، لسانیات اور دیگر شعبہ جات۔ گویا کتاب آج ایک ایسی حقیقت کے بطور ہمارے سامنے ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنے دامن کو وسیع تر کرتی گئی اور جسے یہاں تک آنے میں سیکڑوں صدیاں لگیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو زیست سے وابستہ تمام شعبہ جات میں نئے نئے موضوعات شامل ہونے لگے اور اس طرح کتابیں انسانی تہذیبوں کا امین اور ہر نئی نسل وقوم کی بہتر رہنمائی اور ترقی کا سب سے معتبر وسیلہ ثابت ہوئیں۔

اسلامی تہذیب کے ورود نے تاریخ وجغرافیہ کے علاوہ فلسفے کو ایسا دوام بخشا کہ کتابیں ان کی زیست وبقا کا سامان بن گئیں۔ لہٰذا ہر دور میں اسے بلند مقام حاصل رہا۔ اس سے انکار نہیں کہ دنیا کی تمام تہذیبوں میں کتابوں کو بہتر دوست تصور کیا جاتا رہا ہے۔ دوست اس معنی میں کہ کتابوں کی وجہ سے اسلاف کے تجربوں سے نہ صرف آگہی ملتی ہے بلکہ اسلاف کے کارناموں اور ان کے مشاہدوں کی روشنی میں پیش آنے والی الجھنوں سے پار پانے کا سراغ بھی ملتا ہے۔ دراصل یہی وہ سراغ ہے جو نئے فلسفے اور نئے امکانات کو روشن کرتا ہے اور اسی سے ایجادات کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ورود اسلام نے کتابوں کی اہمیت کو بام عروج عطا کیا جہاں کتابیں ہر صاحب علم، بچوں، عورتوں، بوڑھوں کے سرہانے ہوا کرتی تھیں۔ لوگ کتابوں کو سینے سے لگایا کرتے تھے، کیونکہ انھیں اس بات کا علم تھا کہ کتابیں زیست کی سچی رہنما ہیں۔ اسلامی تاریخ میں سلاطین اور وزرا کی زندگیوں پر نظر ڈالیں تو آج بھی حیرت انگیز انکشافات سامنے آتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے اس کی بیشمار مثالیں دی جاسکتی ہیں، مگر صد حیف کہ تازہ کار نسلوں نے کتابوں کی اہمیت کو پس پشت رکھ دیا اور وہ تاریکیوں کے خوگر بن گئے۔ افسوس کا مقام ہے کہ کتابوں کی جگہ موبائل، لیپ ٹاپ اور سوشل نیٹ ورکنگ نے لے لی۔ ایسے میں لمحۂ فکریہ ہے کہ نوجوانوں میں کتب بینی کا ذوق عنقا ہوگیا۔ موجودہ نسل میں کتابوں سے دوری کا تناسب جس رفتار سے بڑھ رہا ہے اسی قدر ان کے اندر جہل پسندی، انسانی رواداری، اخلاقی اور سماجی قدروں کی عظمت مٹتی جارہی ہے۔ کیونکہ طلبا اپنے طے شدہ نصاب کے

علاوہ دوسری کتابیں پڑھنا گوارہ نہیں کرتے۔ وہ کتابیں جو انھیں زندگی اور شعور سے متعارف کراتی ہیں، ان سے وہ کٹتے جا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو فراموش کر کے خود اپنی شناخت بھی کھو رہے ہیں۔

موجودہ نسل اخلاقی قدروں سے بیگانی ہوتی جا رہی ہے اور وہ کم وقت اور کم محنت میں زیادہ پیسے کمانے کے فراق میں ہیں۔ ایک جانب فتوحات کا یہ عالم ہے کہ مطالعات کی بنا پر دنیا چاند سے آگے مریخ اور اس سے آگے پہنچ رہی ہے، لیکن دوسری جانب اسی تیزی سے سماج کے شیرازے بھی منتشر ہو رہے ہیں۔ گو کہ اس سے ہر کوئی واقف ہے کہ کتاب ایک ایسا دوست ہے جو کسی کی خوشامد و تعریف نہیں کرتا اور نہ کسی کو برائی کے راستے پر ڈالتا ہے۔ یہ تو ایسا دوست ہے جو تنہائی کا مداوا ہے، الجھنوں کا حل ہے اور اکتاہٹوں سے نجات کا باعث ہے۔ یہ ایک ایسا آلۂ حرب ہے جو کسی کو کبھی نقصان نہیں پہنچاتا۔ نئی تحقیق کے مطابق کتابیں انسانی ذہنوں کی خوراک ہیں جبکہ موبائل اور انٹرنیٹ وقت کے زیاں کرنے کا شیطانی آلہ ہے۔ نئی تحقیق تو یہ بھی بتاتی ہے کہ موبائل اور انٹرنیٹ قوت یادداشت کو کم کرتے ہیں جبکہ اس کے برعکس کتب بینی جھوٹ اور منافقت کے زہر سے انسانی ذہنوں کو پاک کر کے سماجی مساوات اور اخوت و عدم تشدد کی ماحول سازی میں ہر ممکن مدد پہنچاتی ہے۔ بلاشبہ کتب بینی انسانی ذہنوں کے لیے وہی اہمیت رکھتی ہے جس طرح ورزش بدن کی نشو و نما میں معاون ہے۔ کتب بینی کی اہمیت و ضرورت اور افادیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

علم و حکمت کے سمندر میں سفر کرنے کے لیے مطالعے کی ناؤ میں سوار ہونا لازمی ہے۔ اس سے دل و دماغ کے بند دریچے وا ہوتے ہیں۔ شعور پختہ ہوتا ہے، فکر کو وسعت ملتی ہے۔ اعلیٰ نظریات، تصورات و تخیلات مطالعے کی ہی دین ہیں۔ کتب بینی سے انسان میں وسعت قلبی، رواداری اور روشن خیالی پروان چڑھتی ہے، یہ روح کو تقویت دیتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم گھر بیٹھے دور دراز کے ممالک کی سیر کرتے ہیں۔ ہم ان ملکوں کے مذہبی، معاشی، اخلاقی اور سیاسی حالات سے آگہی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دلچسپ واقعات سے محظوظ ہوتے ہیں۔ مطالعے کا ذوق رکھنے والا فضول مجالس سے دور رہتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت وہی لوگ جانتے ہیں جو اس چمن رنگ و بو کے گل گشت ہیں اور جو اس جام شراب کے رسیا ہیں، کیونکہ اندھا کیا جانے بسنت کی بہار اور بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔ مطالعے میں جو لطف و سرور اور مٹھاس ہے اس کے سامنے دنیا کی بڑی بڑی نعمتیں ہیچ ہیں۔

چینی کہاوت ہے کہ ''جب تم پہلی بار کتاب پڑھتے ہو تو کسی سے پہلی بار ملاقات کرتے ہو لیکن جب اسی کتاب کو دوسری بار پڑھتے ہو تو جیسے پرانے دوست سے ملاقات کرتے ہو۔'' مہاتما گاندھی کا قول ہے کہ ''دنیا میں جتنی بھی تبدیلی رونما ہو رہی ہے سب کتابوں کی بدولت ہے۔'' مغربی مفکر تھامس جیفرسن نے کہا کہ ''میں کتابوں کے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں۔'' اسٹیو جابز کا قول ہے کہ ''ہمیشہ علم کے پیاسے رہو'' ایک نامعلوم مفکر کا قول تو یہاں تک ہے کہ ''اگر دو دن تک کسی کتاب کا مطالعہ نہ کیا جائے تو تیسرے دن گفتگو میں وہ شیرینی باقی نہیں رہتی، یعنی انداز تکلم تبدیل ہو جاتا ہے۔'' یقیناً ایسی تمام باتیں محض ذوق طبع کے لیے نہیں بلکہ کتب بینی کی افادیت کو مشاہدوں کی روشنی میں کہی گئی ہیں۔ اگر ہم دنیا کے عظیم انسانوں کی سوانح حیات کو اٹھا کر دیکھیں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی کامیابی کا ایک بڑا راز کتب بینی ہی تھا۔ ہمارے سلفا و صالحین کی زندگیاں علم و عمل سے عبارت تھیں۔ ان کی کتاب زیست کے اوراق اٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمہ تن پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں مصروف رہتے تھے اور یہی ان کا وطیرۂ حیات تھا۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور مطالعہ کتب میں صرف ہوتا تھا۔ وہ اپنے قیمتی اوقات کو فضول گوئیوں اور دوسری فضولیات میں ضائع نہیں کرتے تھے۔ ان میں چند کی مثالیں درج ذیل ہیں:

1 کوفے کے مشہور مصنف جاحظ کتب فروشوں کی دکانیں کرائے پر لے کر ساری ساری رات کتابیں پڑھا کرتے تھے۔

2 اسماعیل بن الحاق القاضی کے گھر جب کوئی جاتا تو انھیں پڑھنے میں مصروف پاتا۔

3 خلیفہ عباسی المتوکل کے وزیر فتح بن خاقان اپنی آستین میں کوئی نہ کوئی کتاب رکھتے تھے جب انھیں سرکاری کاموں سے ذرا بھی فرصت ملتی تو کتاب نکال کر پڑھنے لگتے۔

4 امام فخر الدین رازی کو اس بات کا افسوس ہوتا تھا کہ کھانے کا وقت مطالعے کے بغیر گزر جاتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں، ''اللہ کی قسم مجھے کھانے کے وقت علمی مشاغل کے چھوٹ جانے پر افسوس ہوتا ہے، کیوں کہ وقت بہت عزیز چیز ہے۔

5 امام شافعی کے جلیل القدر شاگرد امام مزنی فرماتے ہیں، ''میں نے اپنے استاد کی ایک کتاب کا پچاس برس تک مطالعہ کیا اور ہر مرتبہ مطالعے میں مجھے فوائد حاصل ہوئے۔

6 شیخ الحدیث مولانا زکریا بھی مطالعے سے عشق رکھتے تھے۔ آپ کو رات کے وقت دو بجے بھی مطالعہ کرتے پایا گیا۔

7 دیوبند کے ممتاز عالم دین مولانا اعزاز علی کو کتب بینی کا اس قدر شوق تھا کہ جب بیمار ہوتے تب بھی سرہانے کتابوں کا انبار لگا رہتا اور فرمایا کرتے کہ میری بیماری کا علاج کتب بینی ہے۔

ماہر نفسیات ولیم جیمز کے الفاظ ہر کسی کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس نے کہا تھا: ''کوئی نوجوان خواہ کسی قسم کی تعلیم حاصل کرے اگر وہ ہر روز ایمانداری سے کچھ وقت مطالعے میں صرف کرے تو اسے بالکل متفکر نہیں ہونا چاہیے۔ ایک سہانی صبح جب وہ بیدار ہوگا تو پتہ چلے گا کہ اسے پرخلوص کوششوں کا صلہ مل چکا ہے اور وہ خود کو ایک ممتاز حیثیت کا مالک پائے گا۔'' یونانی ڈرامہ نگار یوال ہیڈس ایک جگہ لکھتا ہے، ''جو نوجوان مطالعے سے گریز کرے وہ ماضی سے بے خبر اور مستقبل کے لیے مردہ ہوتا ہے۔''

پڑھنے کے کئی فائدے ہیں:

1 پڑھنے سے غم اور بے چینی دور ہوتی ہے۔

2 پڑھنے والا دوسروں کے تجربات سے مستفید ہوتا ہے اور بلند پایہ مصنفین کا ذہنی طور پر ہمسر بن جاتا ہے۔

3 پڑھنے والا اوقات کی ضیاع سے محفوظ رہتا ہے۔

4 پڑھنے سے علم میں اضافہ، یادداشت میں وسعت اور معاملہ فہمی میں تیزی آتی ہے۔

5 پڑھنے سے ذہن کھلتا ہے اور خیالات میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جس قوم نے علم و تحقیق کا دامن چھوڑ دیا وہ پستی میں گر گئی۔ مسلمانوں کا زوال اس کی واضح مثال ہے۔ ساتویں صدی تک بغداد علم و ادب کا گہوارہ رہا۔ سقوط بغداد نے قوم کے عظیم کتب خانے فرات میں بہا دیے۔ یہ اس قدر ضخیم ذخیرہ تھا کہ دریا کا پانی سیاہ ہو گیا۔ آج دنیا کے 28 ممالک ایسے ہیں جہاں کتابوں کی خریداری اور وہاں کے عوام میں مطالعے کے ذوق کی شرح سب سے زیادہ ہے کہ ان ممالک میں ایک بھی مسلم ملک نہیں ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

■

Aquil Ziyad
B-37, Rekhta Foundation
Sector-1
Noida 201301 UP

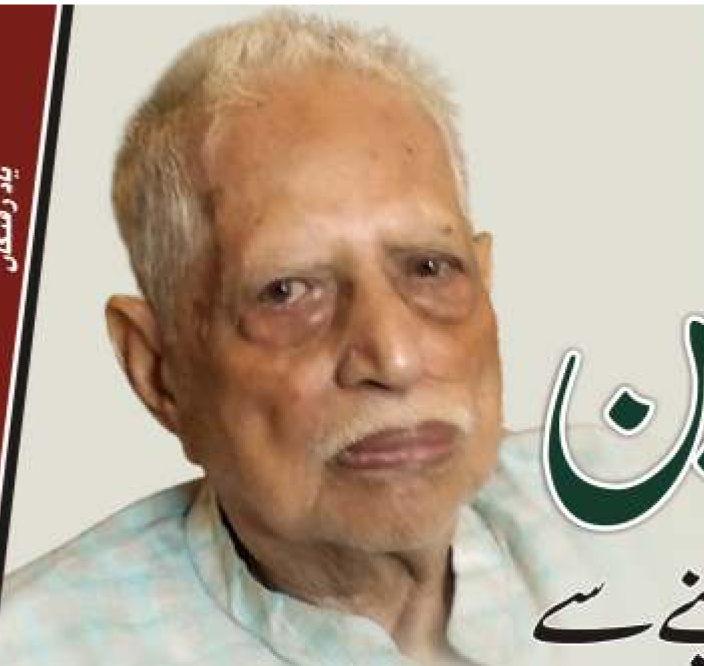

اسلم جاوداں

شہباز حسین

یادوں کے خزینے سے

مشہور و معتمد شخصیت، ماہنامہ 'آجکل'، دلی کے سابق مدیر شہباز حسین، بہار میں اردو تحریک کے بنیاد گزاروں میں تھے۔ تحریکی وانقلابی اخبار روزنامہ 'سنگم' سے بھی عملی طور پر وابستہ تھے۔

شہباز حسین 10 جنوری 1930 کو دانا پور سے مغرب کی طرف پانچ کلومیٹر کی دوری پر جمسوت نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ یہ پٹنہ ضلع کی عملداری میں ہے۔ 1946 کے فرقہ وارانہ فساد میں ان کے والدین گاؤں چھوڑ کر دانا پور میں اپنے ایک رشتے دار کے ہاں آگئے اور کچھ دنوں بعد ایک کرائے کا مکان لے کر یہیں بس گئے۔

شہباز حسین نے بلدیہ ہائی اسکول دانا پور پٹنہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر ایس ڈی جین کالج، آرا سے بی اے کیا۔ اس کے بعد پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور 1951 میں اردو سے ایم اے کیا۔ 1953 میں قانون کی ڈگری بھی حاصل کرلی۔ 1955 سے جولائی 1958 تک دانا پور کے بی ایس کالج میں لکچرر رہے، لیکن اگست 1958 میں جب حکومت ہند کی وزارت اطلاعات ونشریات میں اسسٹنٹ ایڈیٹر (اردو) کے عہدے پر ان کی بحالی ہوگئی تو وہ باقاعدہ دلی منتقل ہوگئے اور پھر وہیں کے ہوکر رہ گئے۔

جس وقت شہباز صاحب نے وزارت اطلاعات و نشریات کے اردو ماہنامے 'آجکل' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کا عہدہ سنبھالا، اس وقت اس کے مدیر عرش ملسیانی تھے۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے انھوں نے ستمبر 1968 سے نومبر 1969 تک خدمات انجام دیں۔ جب عرش صاحب 1967 میں سبکدوش ہوئے تو شہباز صاحب مدیر ہوگئے۔ ان کے رفقائے کار میں نند کشور وکرم، عادل صدیقی وغیرہ بھی تھے۔ 1972 تک وہ 'آجکل' کے مدیر رہے۔ ان کے بعد راج نرائن راز اس رسالے کے مدیر بنے۔ جب وزارت تعلیم کا ترقی اردو بورڈ بنا تو وہ اس کے انچارج بنا دیے گئے۔ یہاں اردو اصطلاح سازی کا بہت کام ہوا۔ ترقی اردو بیورو میں 1975 سے 1978 تک رہے، پھر 'آجکل' میں واپس آگئے۔ دو سال کے بعد انھیں پروموشن ملا تو ڈپٹی ڈائرکٹر ہوئے اور ریسرچ اینڈ ریفرنس ڈویژن میں آگئے۔ 1987 میں ان کو پروموشن دے کر ڈائرکٹر آف فیلڈ پبلسٹی بنا دیا گیا۔ 1989 میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوگئے اور 33 سال سبکدوشی کی زندگی گزارنے کے بعد 25 اگست 2023 میں وہ 93 سال 7 مہینے اور 18 دن کی عمر میں ہم لوگوں سے ہمیشہ ہمیش کے لیے رخصت ہوگئے۔

شہباز حسین نے دلی میں کئی جہتوں سے عزت اور سربلندی حاصل کی، کئی ذی قدر عہدوں کو زینت بخشی اور 'آجکل' کو ادبی آہنگ دے کر پورے ملک کے اردو دانشوروں اور قارئین میں شہرت ومقبولیت حاصل کی۔ انھوں نے اپنی ادارت کے زمانے میں ماہنامہ 'آجکل' کے کئی خصوصی شمارے شائع کیے جن میں فن تعمیر نمبر، موسیقی نمبر، جنگلی جانور نمبر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ اردو رسائل کی عمومی روش کے برعکس ایک الگ تجربہ تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح کے موضوعات پر بھی اردو والوں کو توجہ دینی چاہیے اور اردو رسائل صرف شاعری اور فکشن تک ہی مرکوز نہ رہیں۔ انھوں نے اپنے زمانۂ ادارت میں 'آجکل' میں کچھ اچھے تجربے بھی کیے۔ 'غبار کارواں' کے عنوان سے خود نوشت سوانحی سلسلے کا آغاز انھوں نے ہی کیا تھا اور یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا۔ انھوں نے قارئین سے رابطے کے لیے ایک سوالنامہ بھی مرتب کیا تھا جس کے بہت اچھے نتائج سامنے آئے۔ انھوں نے اسی زمانے میں پبلی کیشن ڈویژن کے لیے 'رنگ برنگے پھول' کے عنوان سے بچوں کی نظموں کا ایک خوبصورت انتخاب شائع کیا تھا جس میں ان کے شریک مرتب نند کشور وکرم تھے۔ اس میں تقریباً مشاہیر ادب کی 75 نظمیں شامل ہیں۔ 'عرض مرتب' کے تحت انھوں نے یہ لکھا تھا ''بچوں کی نظموں کے مجموعے اکثر چھپتے رہتے ہیں مگر ان کا مقصد بچوں کی نصابی ضرورتوں کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں ہم نے مختلف عنوانات کے تحت ایسی نظمیں شامل کی ہیں جو سبق آموز ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی ہوں۔''

شہباز حسین ایک بالغ نظر مدیر تو تھے ہی ترجمہ نگاری میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے ایم این سری نواس کی ایک کتاب کا ترجمہ 'جدید ہندوستان میں ذات پات' اور دوسرے مضامین کے عنوان سے کیا تھا۔ اس میں جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا تھا وہ آج کے تناظر میں بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ مندرج عناوین پر مضامین شامل تھے۔ (1) جدید ہندوستان میں ذات پات (2) سنسکرت تہذیب اور مغربی تہذیب کا مطالعہ (3) ورن اور ذات (4) چار ذاتیں (5) دیہی علاقوں میں صنعت وشہریت (6) مساوات کا ہندوستانی راستہ (7) ہندوستان کے اتحاد کے مسئلے کی نوعیت (8) ایک ہندوستانی گاؤں کے تازے (9) دیہی زندگی کا مطالعہ اور اس کی اہمیت (10) سماجی علم اور دیہی وشہری سماج کا مطالعہ (12) ہندو دھرم۔ یہ کتاب ترقی اردو بیورو سے شائع ہوئی اور بہت مقبول بھی ہوئی۔

شہباز حسین نے اپنی مثبت فکر ونظر اور تعمیری طرز عمل کے ذریعے ملک وملت اور اردو زبان وادب کی قابل لحاظ خدمات انجام دی ہیں۔

اپریل 2020 کی بات ہے، جب میں اردو ڈائرکٹوریٹ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار میں اردو پروگرام انچارج تھا، تو اس کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی جو بڑے اردو دوست ہیں، ان سے مشورہ کرکے ہم نے 'بہار میں اردو تحریک کی تاریخ' پر ایک بڑا پروگرام مرتب کیا۔ جس کے تحت ڈائرکٹوریٹ کے ترجمان رسالے 'بھاشا سنگم' کا 'بہار میں اردو تحریک نمبر' شائع کرنا اور اس موضوع پر دو

روزہ سیمینار کرانا شامل تھا۔ اس ضمن میں ہم نے بہار میں اردو تحریک پر ایک مضمون کی فرمائش کی۔ انھوں نے ایک ہفتے کے اندر اپنی یادداشت کو سمیٹتے ہوئے ایک بہترین مضمون بذریعہ ڈاک بھیج دیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اردو تحریک سے متعلق کئی اہم دستاویزی کاغذات بھی بھیجے نیز ہم لوگوں کے اس فیصلے کو بہت سراہا اور کہا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کا یہ پروگرام اس کا منصبی فریضہ ہے، کیونکہ وہ اردو تحریک کی ہی دین ہے۔ اگر اردو تحریک نہیں ہوتی تو آج اردو ڈائرکٹوریٹ بھی نہیں ہوتا۔ جس کے ذریعے پورے بہار میں ضلع سے لے کر بلاک سطح تک اردو ملازمین بحال کیے گئے۔ شہباز صاحب نے یہ بھی کہا کہ یہ تحریک اتنی بڑی اور مستحکم تحریک تھی کہ اس کا اثر ملک کی کئی ریاستوں پر پڑا۔ جس اردو تحریک کی اتنی بڑی حصولیابی ہے، اس کی زریں اور روشن تاریخ یقینی طور پر مرتب کی جانی چاہیے۔ شہباز صاحب کی ان باتوں سے ہم لوگوں کو بڑی تقویت ملی۔

12 جون 2022 کی بات ہے، اردو کونسل ہند کے زیر اہتمام پروفیسر علیم اللہ حالی صاحب کے وسیع و عریض مردان خانے میں مرحوم پروفیسر اسلم آزاد (متوفی 8 جون 2022) کی یاد میں ایک تعزیتی نشست ہو رہی تھی، جس میں اردو ادب کی نہایت سرکردہ شخصیتیں شامل تھیں۔ اسی دوران میرے موبائل کی گھنٹی بجی اور اسکرین پر شہباز حسین صاحب کا نام چمکا۔ اس اہم نام کو دیکھ کر از راہ احترام میں نے صدر نشست شفیع مشہدی صاحب سے اجازت لے کر ان سے کہا کہ ابھی میں ایک پروگرام میں ہوں شام کو آپ سے بات کرلوں گا۔ شام کو جب ان سے بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ میں پٹنے آیا ہوا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ سے ملاقات ہو جاتی۔

دوسرے دن 13 جون 2022 کو میں امتیاز احمد کریمی صاحب کے ساتھ ان کے دوسرے بیٹے بریگیڈیر آصف حسین کی رہائش گاہ (پاٹلی پترا پٹنہ) پہنچا۔ آصف حسین استقبال کے لیے دروازے پر موجود تھے اور مردان خانے میں ایک پرتکلف کرسی پر شہباز حسین تشریف فرما تھے۔ میں نے سلام کیا اور زہے نصیب کہتا ہوا مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ انھوں نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا اور پاس کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ امتیاز کریمی صاحب کا تعارف ہوا کہ یہ بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہیں۔ اس سے قبل یہ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر اور حکومت بہار کے جوائنٹ سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ جب یہ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر تھے تو انھوں نے بہت سارے تاریخی کام انجام دیے اور درجنوں یادگار پروگرام منعقد کرا کے ہندوستان گیر شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ شہباز صاحب کے چہرے پر ایک خاص چمک سی ہوئی اور انھوں نے کہا ”اردو ڈائرکٹوریٹ کی کئی بہترین مطبوعات مجھے حاصل ہوئی ہیں، میں ان کے معیار اور مواد سے بڑا متاثر ہوا۔“

پھر شہباز صاحب سے ہم لوگوں کی گفتگو شروع ہوئی۔ انھوں نے پرانی یادوں کا خزانہ کھول دیا۔ بہار میں اردو تحریک سے وابستگی، روزنامہ اخبار 'ساتھی' اور 'سنگم' کا اجرا، اردو صحافت اور اردو تحریک میں غلام سرور کی تاریخ ساز مثالی جدوجہد، ان کی تقریری صلاحیت اور سیاسی بصیرت وغیرہ وغیرہ۔ شہباز صاحب تمام واقعات کو دن تاریخ اور سنہ کے ساتھ اس روانی اور اعتماد کے ساتھ بیان کر رہے تھے کہ ان کی یادداشت پر رشک ہونے لگا۔ انھوں نے بتایا کہ جب ملک کی آزادی کے بعد مسلمان مسلسل پاکستان ہجرت کرنے لگے تو غلام سرور نے اس کی سخت مخالفت کی۔ انھوں نے ہم لوگوں سے حلف اٹھوایا کہ ہم میں سے کوئی بھی پاکستان نہیں جائے گا اور نہ اپنے نام کے آگے یا پیچھے ذات کا طرہ لگائے گا۔ ہم تمام دوستوں نے اس کی پاسداری کی اور اس کے بہتر نتائج برآمد ہوئے۔ میرے خیال میں غلام صاحب کا یہ قدم بھی بڑا تاریخی اور دور اندیشانہ تھا۔

اب امتیاز احمد کریمی صاحب نے پہلو بدلا اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔ پھر انھوں نے شہباز صاحب سے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔ ”ہم مسلمان اردو کیوں پڑھیں؟“

یہ سوال سن کر شہباز حسین صاحب کی آنکھوں میں ایک چمک سی آئی۔ انھوں نے امتیاز احمد کریمی صاحب کو نظر بھر کے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں متانت اور ذہانت دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ یہ حضرت اردو کے حامی و طرفدار ہیں، مگر مجھ سے سوال اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ اس کی توثیق چاہتے ہیں۔

شہباز صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔ تھوڑے توقف کے بعد کہنے لگے ہم اردو اس لیے پڑھیں کہ اس میں ہمارے لیے سب کچھ ہے۔ اس میں ہماری زبان ہے، ہماری تہذیب ہے اور ہماری پہچان بھی ہے۔ اس میں اعلیٰ پائے کا ادب اور بہترین شاعری ہے۔ اردو زبان میں جیسا حسن اور جیسی شیرینی ہے اس کا کیا کہنا۔ ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں جو اردو الفاظ سننے کو ملتے ہیں وہ تو اردو کی دلکشی اور حسن کی وجہ سے ہی ہے۔ اگر ہم اردو کو چھوڑ دیں گے تو ہمارے پاس کیا بچے گا؟

انھوں نے بتایا کہ ان کے بچے مشنری اسکول میں پڑھتے تھے، لیکن وہاں اردو کی تعلیم کا نظم نہیں تھا، لہٰذا وہ بہت فکرمند ہوئے اور اسکول کے پرنسپل سے جا کر ملے اور ان سے اردو کی تعلیم کا نظم کرنے کو کہا۔ شہباز صاحب نے کہا کہ ہمیں اردو کی تعلیم کا نظم کرنے کے لیے بیدار اور کوشاں رہنے کی ضرورت ہے۔ ہم اپنے بچوں کو اردو ضرور پڑھائیں۔ ورنہ ہمارے بچے اپنی تہذیب اور اپنی زبان سے دور ہو جائیں گے۔ جب ہمارے پاس ہماری زبان نہیں رہے گی، تہذیب نہیں رہے گی، تو ہمارے پاس کیا بچے گا؟ یہ بڑے خسارے کی بات ہے۔

میں نے سوال کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟ انھوں نے بڑی متانت کے ساتھ کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اب تعلیم اور معاش پر خوب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کسی قوم کی ترقی میں یہ دونوں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اب انگریزی کا زمانہ آیا، لہٰذا مسلمانوں کو یہ زبان مضبوطی کے ساتھ پکڑ لینی چاہیے۔ سب سے پہلے بنگالیوں نے انگریزی پڑھنا قبول کرلیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں سے لے کر پشاور تک ڈاکٹر بنگالی ہیڈ ماسٹر بنگالی وکیل بنگالی گویا سارے اہم عہدوں پر بنگالی۔ یہاں تک کہ بلدیو اہائی اسکول جس میں میں نے تعلیم حاصل کی تھی، اس کے ہیڈ ماسٹر بھی بنگالی تھے۔ حالانکہ سرسید نے انگریزی پڑھنے کی زبردست وکالت کی، مگر مسلمان پیچھے رہ گئے۔ لیکن اب مسلمانوں میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ وہ تعلیم کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ ان کی لڑکیاں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور اچھے عہدوں پر فائز ہو رہی ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے زمانے میں سماج بڑا جامد تھا۔ وہ جلد تبدیلی قبول نہیں کرتا تھا، لیکن شکر ہے کہ اب وہ بات نہیں رہی۔ سماج اچھی تبدیلیاں قبول کر رہا ہے۔

درازیِ عمر اور کمزور صحت کے سبب شہباز صاحب اب تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ ہم لوگوں نے ان کو ایک بار بڑے غور سے احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان سے اجازت چاہی تو انھوں نے مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لیے

اور پھر ہم اس یگانہ شخصیت سے جدا ہو گئے، جو ہندوستان کی تقریباً ایک صدی کا چشم دید گواہ تھا۔ جس کے سینے میں ہندوستان کی تقریباً سو سالہ تاریخ روشن تھی۔

■

Dr. Aslam Jawedan
Darul Gheyas, Near Hotel Blue Diamond
Jamun Gali, Sabzi Bagh
Patna-800004 (Bihar)

محمد زبیر

پروفیسر صاحب علی
ایک ہمہ جہت شخصیت

عروس البلاد ممبئی روزِ اول سے ہی اردو زبان وادب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں ادیبوں اور قلم کاروں کا ایک بڑا حلقہ ہر دور میں اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں کوشاں رہا ہے۔ یہ ادیب اور اہلِ قلم کسی ادبی تحریک یا ادارے سے منسلک ہوتے اور اپنی ادبی وشعری کاوشوں سے اردو زبان وادب کو ثروت مند بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ ممبئی میں اردو زبان کی ترویج وترقی میں ادبی تحریکوں کے علاوہ جن تعلیمی اداروں نے اہم رول ادا کیا ہے، ان میں انجمن اسلام، اسماعیل یوسف کالج، سینٹ زیویرس کالج، مہاراشٹرا کالج، رضوی کالج، برہانی کالج اور شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ یہاں پر اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی اعلیٰ تعلیم کے علاوہ دیگر پیشہ ورانہ کورسیز کا معقول انتظام ہے۔ اس شعبے کو ابتدائی دنوں سے ہی ایسے اساتذہ ملے ہیں جن کی علمی وادبی صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف رہا ہے۔ ان اساتذہ میں پروفیسر عبدالستار دلوی کا نام سرِ فہرست ہے۔ 1982 میں جب شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو پروفیسر عبدالستار دلوی صدرِ شعبہ مقرر ہوئے۔ علاوہ ازیں پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، پروفیسر یونس آگاسکر، ڈاکٹر خورشید نعمانی، پروفیسر جینا بڑے اور پروفیسر صاحب علی جیسی علمی وادبی شخصیات کا تعلق اسی شعبے سے رہا ہے۔ ان میں پروفیسر صاحب علی بحیثیت ادیب اور ناظم طلبا خاص وعام میں بڑے مقبول ومعروف ہوئے۔

پروفیسر صاحب علی ضلع بستی اتر پردیش کے ایک زمین دار خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ ان کے والد کا نام فتح محمد تھا جن کی کل چھ اولادیں تھیں جن میں صرف صاحب علی ہی اولادِ نرینہ تھے۔ صاحب علی کے والد فتح محمد ادبی ذوق رکھتے تھے اور بطورِ خاص شاعری کے دلدادہ تھے۔ 'بے چین بستوی' تخلص فرماتے تھے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ (نعتیہ کلام) بھی شائع ہو چکا ہے۔ صاحب علی کی پیدائش یکم فروری 1963 ضلع بستی (موجودہ ضلع سدھارتھ نگر) کے ایک قصبہ یوسف جوت میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم یوسف جوت سے متصل ٹنڈواں نامی قصبے کے ایک مدرسے میں پائی۔ اس کے بعد بی آئی سی انٹر کالج ڈومریا گنج سے انٹرمیڈیٹ اور اے پی این ڈگری کالج بستی سے بی اے آنرز میں ڈگری حاصل کی۔ مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے سرسید کے خوابوں کی دانش گاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے۔ یہاں ایم۔اے کے دوران صاحب علی نے قرۃ العین حیدر، شہریار، ثریا حسین، قاضی عبدالستار، نورالحسن نقوی، انصار اللہ نظر، منظر عباس، اصغر عباس، قاضی افضال حسین اور قاضی جمال حسین جیسے اساتذۂ فن سے نہ صرف کسبِ فیض کیا بلکہ علی گڑھ کی علمی وادبی فضا اور خوشگوار ماحول نے ان کی مثبت کردار سازی میں اہم رول بھی ادا کیا۔

ایم اے اردو میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہونے کے بعد صاحب علی نے اردو صحافت کے نامور محقق اور ممتاز مبلغ پروفیسر نادر علی خاں کی نگرانی میں 'گلدستۂ پیام یار' پر ایم فل اور 'ریاض خیرآبادی کی صحافت' پر ڈاکٹریٹ کا نہایت وقیع مقالہ لکھا، یہ دونوں مقالے شائع ہو کر علمی وادبی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ صاحب علی کی یہ کتابیں حوالہ جاتی حیثیت رکھتی ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد پروفیسر صاحب علی، درس وتدریس جیسے مقدس پیشے سے وابستہ ہو گئے اور ممبئی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ ممبئی جیسے شہر میں مختصر اور محدود آمدنی کے باوجود ڈاکٹر صاحب علی کا اس عظمت وتقدس کے پیشے کو برقرار رکھنا ان کی تعمیری اور صالح فکر کا غماز ہے۔ طلبا اور خاص وعام کے لیے وہ ایک شفیق استاد اور سلیم الطبع انسان تھے۔ درس وتدریس کے ساتھ طلبا کی رہنمائی اور ہمہ جہت ترقی کے لیے بھی کوشاں رہتے تھے۔ وہ اپنے طلبا کو تعلیم کے ساتھ زندگی جینے کا سلیقہ بھی سکھاتے تھے۔ علی گڑھ کے علمی وادبی ماحول نے ڈاکٹر صاحب علی کی کردار سازی میں اگرچہ بنیادی رول ادا کیا ہے لیکن ان کی تدریسی صلاحیتوں کو جلا ممبئی نے بخشا ہے۔ اس شہر نے انھیں نہ صرف عزت اور شہرت سے نوازا بلکہ ان کی فنکارانہ، پیشہ ورانہ اور ذاتی زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ گویا شہر ممبئی پروفیسر صاحب کے لیے فالِ نیک کی حیثیت رکھتا ہے۔

پروفیسر صاحب علی ابتدا میں برہانی کالج سے وابستہ ہوئے۔ بعد ازاں 1996 میں ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے پہلے ریڈر، پھر پروفیسر بنے۔ کرشن چندر کے نام سے منسوب پروفیسر چیئر پر بحیثیت پروفیسر تاحیات برقرار رہے۔ یہاں انھوں نے اپنی زندگی کے اہم ترین چوبیس برس گزارے۔ جن میں تقریباً نو سال صدرِ شعبہ بھی رہے۔ پروفیسر صاحب علی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے انھوں میں اپنے تحقیقی وتنقیدی جوہر دکھانے کے ساتھ ساتھ اپنی عملی زندگی میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ چونکہ ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل اسی نہج پر ہوئی تھی جس میں تعمیری رجحانات کو فوقیت حاصل تھی اس لیے اس کا اظہار ان کی پیشہ ورانہ زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔ انھوں نے شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرایا۔ سمپوزیم، مذاکرے، مباحثے اور چھوٹی موٹی نشستوں کے علاوہ ہر سال کم از کم دو قومی سمینار برپا کرتے تھے۔ مخطوطہ شناسی پر دو اہم ورکشاپ کا انعقاد بھی اہم کارنامہ ہے۔ سال 2013 میں 'منٹو' اور 2018 میں 'اکیسویں صدی میں اردو فکشن' پر دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد بھی کیا، جس میں ہندوستان کی نامور یونیورسٹیوں کے علاوہ ڈھاکہ، جرمنی، موریشس اور نیپال کے مندوبین شامل تھے۔ پروفیسر صاحب علی نے اردو اور غیر اردو کی اہم

اور بڑی شخصیات کو شعبے میں مدعو کیا۔ ان کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی، لہٰذا انھوں نے جب بھی کسی اہم شخصیت کو شعبۂ اردو میں مدعو کیا، اس نے ان کی دعوت کو قبول کیا۔

شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی سے وابستگی کے دورانیے میں صاحب علی نے جس اہم کارنامے کو انجام دیے ہیں۔ ان میں شعبے کی ترقی اور مختلف النوع سرگرمیوں کے علاوہ ان کی قلمی خدمات بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس دور میں ان کی تقریباً درجن بھر کتابیں معرضِ وجود میں آئیں، جو ان کا علمی و ادبی شناخت نامہ بھی ہیں۔ 'مبادیاتِ عروض' (1996) ان کی اولین کتاب ہے، جس میں علم عروض کو آسان اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'گلدستہ پیام یار' ایم فل کے لیے لکھا گیا تحقیقی مقالہ ہے، 'اردو فکشن ایک مطالعہ' (2004)، 'پھول اور بچے' (2005) (مراٹھی سے اردو ترجمہ)، 'کوؤں کا اسکول' (2006) (مراٹھی سے اردو ترجمہ)، 'قرۃ العین حیدر شخصیت اور فن' (2008)، 'اردو افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ'، 'ترقی پسند تحریک اور بمبئی' (2010)، 'رانی کیتکی کی کہانی' (2011)، 'بمبئی کے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتگان' (2013)، 'عربی اور اردو کے لسانی و ادبی روابط' (2013)، اردو تنقید مقصود و منہاج (2018)، 'ریاض خیرآبادی کی صحافت' (2020) وغیرہ۔

پروفیسر صاحب علی نے شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کے تمام کاموں کو بخوبی انجام دیتے ہوئے اپنی دیگر ادبی سرگرمیوں کو تاحیات جاری رکھا۔ سلیکشن کمیٹی، بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ اور دوسرے ادبی پروگرام میں جذبۂ بے نیازی کے ساتھ شامل ہوتے رہے اور اپنے منصفانہ و معتدل رویے کے سبب باشعور اور تعلیم یافتہ لوگوں میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ پروفیسر صاحب علی کا یہ معتدل رویہ ان کی زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی سے شائع ہونے والا اکیڈمک ریسرچ اینڈ ریفریڈ جرنل 'اردو نامہ' پروفیسر صاحب علی کی سعی بلیغ کا نادر کارنامہ ہے۔ یہ اپنی علمی و فکری ترجیحات کے سبب ایک معیاری اور معتبر جریدے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر صاحب علی رقم طراز ہیں:

'اردو نامہ' کسی فردِ واحد کی ترجیحات کا ترجمان نہیں بلکہ یہ اردو زبان و ادب میں جاری و ساری فکری و علمی ترجیحات و رویوں کا نمائندہ ہے۔ ہمیں کسی تحریک، ادبی رویے یا مباحث سے پرہیز نہیں۔ البتہ ہم یہ ضرور خیال کرتے ہیں بحث کی سطح بلند، پیرایۂ اظہار معیاری اور گفتگو عالمانہ ہو۔ اسی طرح 'اردو نامہ' میں ہم ہر اس تحریر کے استقبال کو تیار ہیں جو علم کی وسعت اور سلیقۂ اظہار سے عبارت ہو۔"

(اداریہ 'اردو نامہ' از پروفیسر صاحب علی، اپریل 2013 ص 7،8)

پروفیسر صاحب علی ہندوستان کی کئی اہم یونیورسٹیوں کے علاوہ این سی ای آر ٹی، این سی پی یو ایل اور یو جی سی کی کئی اہم کمیٹیوں کے ممبر بھی تھے۔ علاوہ ازیں وہ ہندوستان کے بڑے ادبی ایوارڈ 'سرسوتی سمان' اور مدھیہ پردیش کے سب سے بڑے ایوارڈ 'اقبال سمان' کے جیوری ممبران میں بھی شامل تھے۔ سرسوتی سمان ابھی تک اردو میں صرف شمس الرحمٰن فاروقی اور نیر مسعود کے حصے میں آیا ہے۔ صاحب علی ہندوستان کی چوبیس زبانوں کے سب سے بڑے ادارے ساہتیہ اکیڈمی منسٹری آف کلچر دہلی، اردو بورڈ کے ممبر بھی تھے۔

پروفیسر صاحب علی کا حلقۂ احباب انتہائی وسیع تھا۔ جب تک وہ ممبئی میں تھے ہر کس و ناکس سے، چاہے وہ طالب علم ہو، یا ان کا ہم عصر یا کوئی عام انسان ہو، خوش اخلاقی کے ساتھ ملتے تھے۔ جہاں تک میرے مشاہدے کا تعلق ہے میں نے انھیں علم دوست، غریب پرور اور نادار طلبا پر زیادہ مہربان پایا۔ ان کے اندر صلہ رحمی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

پروفیسر صاحب علی کو ہم سے جدا ہوئے تقریباً ساڑھے تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن ابھی بھی ان کی باتیں ذہن و دل پر اس طرح اثر انداز ہیں، گویا وہ ہم سے ہم کلام ہیں۔ دراصل ان کی شخصیت اس قدر دل نشیں تھی کہ ان سے بچھڑنے کا تصور بھی تکلیف دہ تھا۔ باپ جیسے مشفق اور مہربان استاد کم ہی شاگردوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ پروفیسر صاحب علی سے میری اولین ملاقات ایم فل میں داخلے کی نسبت سے اکتوبر 2010 میں ہوئی تھی۔ ایم فل میں داخلے کے بعد میں شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی سے وابستہ ہوگیا اور میری یہ وابستگی ایک عرصے تک قائم رہی۔ پروفیسر صاحب علی کی نگرانی میں ایک پوسٹ ڈاکٹریٹ، بیس پی ایچ ڈی کی تھیسس اور تقریباً پینتالیس ایم فل کے مقالے لکھے گئے۔ جن میں مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے ان کی نگرانی میں تین مقالے تحریر کیے۔ اول 'اثر انصاری شخصیت اور شاعری' (ایم فل ڈگری کے لیے لکھا گیا Dissertation ہے)۔ دوم 'ممبئی میں اردو تحقیق ابتدا تا 1960 تحقیقی و تنقیدی جائزہ' اس پر ممبئی یونیورسٹی نے ناچیز کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ بعد ازاں ایک یو جی سی میجر ریسرچ پروجیکٹ (Development of Urdu Language Historical and Critical and Literature in Maharashtra: A Study) پر کام کیا۔ یہ مقالہ ان کی وفات کے چند مہینے قبل ہی مکمل کر کے جمع کیا تھا۔

پروفیسر صاحب علی کی زندگی جہد و عمل کا نمونہ تھی۔ وہ اپنے کلیگ اور ساتھیوں سے شعبے کی ترقی اور اپنے منصوبوں پر تبادلۂ خیال کیا کرتے اور مشورے کے بعد ہی اسے عملی جامہ پہناتے۔ یوں تو شعبۂ اردو ابتدا سے ہی ایک فعال اور متحرک شعبہ رہا ہے لیکن پروفیسر صاحب علی کے زمانے میں شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی نے جس قدر ترقی کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شعبۂ اردو میں جدید ترین وسائل سے آراستہ کمپیوٹر لیب انھی کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے شعبے کو کئی اہم کورسیز فراہم کرائے۔ ان میں پی جی ڈپلوما ان ماس کمیونی کیشن اینڈ اردو جرنلزم اور ڈپلوما ان اردو کمپیوٹر اپلی کیشن ملٹی لینگول ڈی ٹی پی وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاسکتے ہیں۔ یہ روزگار اساس کورسیز طلبا کے لیے بڑے کارآمد اور سودمند ثابت ہوئے۔ شاہد لطیف (ایڈیٹر انقلاب ممبئی)، شکیل رشید (ایڈیٹر ممبئی اردو نیوز) اور سرفراز آرزو (روزنامہ ہندوستان، ممبئی) جیسے ماہر صحافی کی رہنمائی کے سبب شعبے نے جرنلزم کے میدان میں خاصی ترقی کی۔ شعبۂ اردو کی لائبریری کو مستحکم اور منفرد بنانے میں استاد محترم کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہاں اردو ادب کی ہزاروں کتابیں دستیاب ہیں جن سے طلبا فیض یاب ہو رہے ہیں۔ شعبۂ اردو کو ممتاز اور معیاری بنانے کے لیے انھوں نے ہر ممکن کوششیں کیں۔ ایک علاحدہ اور پرشکوہ شعبہ جو اساتذہ اور طلبا کی تمام ضروریات کا احاطہ کرتا ہو، ان کی اس تجویز کو 'اردو بھون' کے نام سے یونیورسٹی انتظامیہ نے منظوری بھی دے دی اور حکومت مہاراشٹر نے اردو بھون کے لیے پانچ کروڑ روپے دینے کا اعلان بھی کر دیا لیکن بہ وجوہ پروفیسر صاحب علی کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کے فروغ میں پروفیسر صاحب علی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مستقبل قریب میں جب بھی شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کی تاریخ مرتب ہوگی، اس میں پروفیسر صاحب علی کا نام نمایاں ہوگا۔ مجموعی طور پر اگر ہم دیکھیں تو صاحب علی کی پوری حیات اردو کے لیے وقف تھی۔ انھوں نے اردو کے فروغ کے لیے جو کارنامے انجام دیے ہیں اور طلبا کی رہنمائی میں جس طرح دلچسپی لی ہے وہ صرف انھی کا حصہ ہے۔ لہٰذا ان کی شخصیت کو مینارۂ نور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

■

Dr. Mohammad Zubair
Coordinator MANUU
LSC. MS College of Arts,Comm,
Science & BMS, Kausa Mumbra
Thane-400612 (Maharashtra)
Mob:9022951081

محمد اویس سنبھلی

عرفان عباسی
کی یاد میں

نامور محقق، مشہور مصنف و مؤلف، ممتاز تذکرہ نگار اور مبصر عرفان عباسی 13 اگست 1924 کو گڑھی بھلول، ضلع بارہ بنکی کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے پردادا مولانا عبدالرزاق صاحب، دادا مولانا عبدالرحمٰن مرحوم اور والد مولانا نعمان صاحب کا شمار علوم دینیہ پر عبور رکھنے والی شخصیات میں ہوتا تھا۔ مولانا نعمان صاحب شعر و ادب کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے اور سوز تخلص کرتے تھے۔ عرفان عباسی کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی اور تکمیل پنجاب یونیورسٹی سے۔ اس کے بعد انھوں نے 'ہومیوپیتھک طریقہ علاج' میں ڈپلوما کیا۔ 1947 کے آس پاس یوپی سول سکریٹریٹ میں ملازمت اختیار کی۔ 1984 میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ 4 جنوری 2012 کو آخری سانس لی۔ 5 جنوری کی صبح 10 بجے کے قریب عیش باغ قبرستان میں تدفین ہوئی۔ ان کا قلم اور کاغذ سے جو رشتہ تھا، وہ تارِ نفس ٹوٹنے تک قائم رہا اور اپنے نامۂ اعمال میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ کم و بیش 75 کتابیں درج کرائیں، جن میں آپ، آپ تھے، آپ ہیں، انتخاب کلام سلام مچھلی شہری، انتخاب کلام ناطق لکھنوی، تذکرہ شعرائے اتر پردیش، تذکرہ شعرائے ریختی، جنگ آزادی اور قومی یک جہتی، دبستان امیر مینائی، نثر نگاران اردو، ہمارے بزرگ اور قومی یک جہتی، اتر پردیش کے شاگردان آرزو لکھنوی، اردو ادب میں کون کیا؟، اردو شاعری میں بھارتیتا، اردو شاعری میں ہندوستانیت، اردو کے ان پڑھ شاعر، اشاریہ شعرائے لکھنؤ، انتخاب کلام شوق بہرائچی، تذکرہ سخن وران اتر پردیش، تذکرہ شاعرات لکھنؤ، دبستان لکھنؤ کے ہندو

شاعر، سخن وران اتر پردیش، طنز و مزاح کے منتخب شعرا، لکھنؤ کی ادبی و ثقافتی انجمنیں شامل ہیں۔ ان میں بعض کتابیں دو جلدوں پر مشتمل ہیں تو بعض 33 جلدوں پر، یہ تعداد محمد اطہر مسعود خاں نے گنوائی ہے، کچھ اور کی خبر عرفان عباسی کے مسودوں کو کمپوز کرنے والے منیر صاحب دے سکتے ہیں۔

اپریل 2008 کی کوئی تاریخ تھی کہ میرا ایک مضمون حق سنبھلی صاحب کے تعلق سے لکھنؤ کے کئی اخبارات میں ایک دو روز کے وقفے سے شائع ہوا۔ یہ حق سنبھلی کے انتقال پر لکھا گیا محض ایک تاثراتی مضمون تھا۔ روزنامہ آگ، لکھنؤ کے علاوہ بھی اخبارات نے مکمل مضمون شائع کیا تھا۔ آگ کے ایڈیٹر محترم احمد ابراہیم علوی نے مضمون کو ایڈٹ کر کے مراسلہ بنا دیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دیگر اخبارات کے مقابلے یہ مراسلہ زیادہ پڑھا گیا اور اسی کے حوالے سے کئی فون بھی آئے۔ جناب عرفان عباسی نے بھی اس مراسلے کے حوالے سے فون کیا تھا یہ ان سے میری پہلی علیک سلیک تھی۔ اس سے قبل میں ان کے نام اور کام، دونوں سے بالکل ناواقف تھا۔ فون پر ہوئی گفتگو میں چند رسمی باتوں کے علاوہ، سب سے زیادہ زور اس بات پر تھا کہ کسی وقت گھر تشریف لائیں، تفصیل سے گفتگو تبھی ہو سکے گی۔ اس واقعے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد منوباغ، نیا گاؤں، لکھنؤ میں واقع ان کے در دولت پر پہنچا۔ دروازے پر اردو میں 'عرفان عباسی' نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ گھنٹی بجائی،

> تذکرہ نگاری کے حوالے سے عرفان عباسی کا نام لائق تحسین ہے لیکن افسوس عرفان عباسی کی تذکرہ نگاری اور 'تذکرہ شعرائے اتر پردیش' کی ادبی حلقوں میں جس طرح پذیرائی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی۔ یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق میں ابھی تک شاید کسی نے اس کو موضوع تحقیق نہیں بنایا ہے۔

ایک خاتون [بعد میں معلوم ہوا کہ عرفان صاحب کی صاحب زادی محترمہ اسما رفعت حسین تھیں] نے دروازہ کھولا، میں نے عرفان عباسی صاحب سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ انھوں نے نام پوچھا اور دروازہ بند کر کے اندر چلی گئیں۔ دو منٹ بعد ایک دوسرا دروازہ کھلا اور انتہائی کمزور سی ایک آواز آئی۔ ''اِدھر آجائیں'' میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ دروازے پر کھڑے ہیں، ضعیف و لاغر، چہرے پر نقاہت کے آثار، سر کے بال، داڑھی بالکل سفید، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، الغرض بڑھاپا تھا کہ بہر طور نمایاں تھا۔ یہ عرفان عباسی سے میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ باہری کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف جانے لگے تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا چاروں طرف کتابوں کا انبار ہے۔ اس انبار کے بیچ میں ایک تخت اور اس کے قریب دو صوفے آمنے سامنے پڑے ہیں۔ عرفان صاحب اپنے تخت پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور میں ان کے تخت کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے اپنے سرہانے رکھی چند کتابوں کے درمیان سے مذکورہ بالا مراسلے کی کٹنگ نکالی۔ حق صاحب سے متعلق کچھ اور باتیں مجھ سے دریافت کرکے اخبار کی اسی کٹنگ پر لکھ لیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے بہت سے مکمل اور نامکمل کام گنوانا شروع کیے۔ اس ملاقات میں ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم کے تعلق سے بھی بہت سی باتیں ہوئیں۔ ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت ان کے پاس گزارنے کے بعد میں نے وہاں سے رخصت لی۔

کل ملا کر اس ملاقات کا مجھ پر اچھا تاثر پڑا، لہٰذا اس کے بعد ہر اتوار کو ان سے ملاقات کی ایک پابندی سی ہوگئی۔ بہت سے دوسرے لوگوں سے ان کے یہاں ملاقاتیں ہوئیں۔ اسرار قریشی اور ان کے والد بزرگوار محترم معراج ساحل سے بھی پہلی مرتبہ وہیں ملاقات ہوئی۔ اسرار قریشی اس زمانے میں 'اردو شعر و ادب کے ارتقا میں لکھنؤ کے ہندو شعرا کا حصہ' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ عرفان عباسی کے پاس کتابوں کے علاوہ اہم رسائل و جرائد کا بڑا ذخیرہ تھا۔ 1955 سے 2000 تک کی ماہنامہ نیا دور کی فائلیں ان کے پاس محفوظ تھیں۔ وہ کتابوں کو بہت سلیقے سے رکھتے تھے۔ کون سی کتاب کہاں رکھی ہے، یہ ان کو معلوم رہتا تھا۔ اسی کمرے میں بیٹھ کر 1960 میں انھوں نے تذکرہ نگاری کا آغاز کیا۔ جب کہ اس سے قبل ان کی ایک کتاب 'جنگ آزادی اور قومی یکجہتی' کے نام سے 1959 میں شائع ہو چکی تھی۔ اس سلسلے کی دوسری کتاب 'ہمارے بزرگ اور قومی یکجہتی'

> **جسمانی طور پر عرفان عباسی صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ نظر آتے تھے، لیکن اپنی تمام بیماریوں کے باوجود انھوں نے 'تذکرہ شعرائے اتر پردیش' کی 27 جلدیں شائع کی اور 28 تا 32 جلدیں مکمل ہونے کے باوجود غیر مطبوعہ تھیں۔**

کے نام سے 1963 میں شائع ہوئی۔ لکھنؤ اسکول سے متعلق 50 مرحوم شعرا کے خاکے و تذکرے 1978 میں 'آپ' عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ 1981 میں 'آپ ہیں' اور 'آپ تھے' کے عنوان سے دو کتابیں منظر عام پر آئیں۔ 1982 میں تذکرہ شعرائے اتر پردیش کا سلسلہ اشاعت شروع ہوا۔ یہ 1930 کے بعد وفات پانے والے شعرا کا ایک طویل تذکرہ ہے، جس کی ہر جلد میں 50 شعرا کا تذکرہ بڑے اہتمام سے کیا گیا ہے۔ تذکرہ شعرائے اتر پردیش عرفان عباسی کا بڑا کارنامہ ہے۔ بقول ڈاکٹر اطہر مسعود خاں:

''اتر پردیش میں شروع سے اب تک ہزاروں شاعر گزر چکے ہیں اور ہزاروں اب بھی موجود ہیں لیکن ان سب شاعروں کے حالات زندگی جمع کر کے عرفان عباسی صاحب نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ وہ عظیم کام تھا، جو کئی اداروں اور ادبی انجمنوں کے کرنے کا تھا لیکن عباسی صاحب نے تن تنہا اس بارِ عظیم کو اٹھایا اور فن تذکرہ نگاری کو نہایت خوش اسلوبی سے ایک بلند اور باعزت مقام تک پہنچا دیا۔''

(بحوالہ: مضمون 'تذکرہ نگاری اور عرفان عباسی' از ڈاکٹر اطہر مسعود خاں، روزنامہ آگ، لکھنؤ ص 4، 4 جنوری 2018)

تذکرہ شرائے اتر پردیش کی چھٹی جلد میں عرفان عباسی کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے علی جواد زیدی نے لکھا کہ ''عرفان عباسی کا یہ تحقیقی کارنامہ دور حاضر کی ادبی تاریخ کا باوقار مواد ہے''۔

تذکرہ نگاری کے حوالے سے عرفان عباسی کا نام لائق تحسین ہے لیکن افسوس عرفان عباسی کی تذکرہ نگاری اور 'تذکرہ شعرائے اتر پردیش' کی ادبی حلقوں میں جس طرح پذیرائی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی۔ یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق میں ابھی تک شاید کسی نے اس کو موضوع تحقیق نہیں بنایا ہے۔

عرفان عباسی سکریٹریٹ میں تھے، تیز دم تھے۔ 'تذکرہ شعرائے اتر پردیش' انہیں حکومت کی جانب سے ملا ہوا ایک پروجیکٹ تھا۔ جس کو بعد میں انہوں نے ذاتی طور پر چھپوانا شروع کر دیا۔ اتر پردیش اردو اکادمی، فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جیسے اداروں نے اس کی اشاعت میں مالی تعاون دیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی نے عرفان عباسی کی صحت کا خیال کرتے ہوئے دو-دو مسودات ایک سال میں منظور کیے۔

جسمانی طور پر عرفان عباسی صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ نظر آتے تھے، لیکن اپنی تمام بیماریوں کے باوجود انھوں نے 'تذکرہ شعرائے اتر پردیش' کی 27 جلدیں شائع کی اور 28 تا 32 جلدیں مکمل ہونے کے باوجود غیر مطبوعہ تھیں۔ حالانکہ تذکرے کو ایک صوبے تک محدود رکھنے کے باوجود یہ کام تنہا کسی ایک شخص کے بس کا نہیں تھا۔ بقول پروفیسر شارب ردولوی:

''ایسے کاموں کو تنہا انجام دینے کا بیڑا اٹھانے کے لیے جس دیوانگی کی ضرورت ہے وہ بلا شبہ عرفان عباسی صاحب میں موجود ہے۔ انھوں نے اب تک جس لگن، محنت اور تندہی سے اس کام کو انجام دیا ہے وہ یقیناً انھیں کا حصہ ہے۔''

'تذکرہ شعرائے اتر پردیش' کا اشاریہ ڈاکٹر اطہر مسعود خاں نے تیار کیا ہے۔ اس اشاریے میں عرفان عباسی کی کل 70 تصنیفات کے نام مع سنہ اشاعت درج ہیں۔ عرفان صاحب کی کتابوں کی کمپوزنگ منیر صاحب کیا کرتے تھے۔ منیر صاحب نے خود بتایا کہ ان کے کئی مسودات کمپوز شدہ آج بھی ان کے کمپیوٹر میں موجود ہیں۔ میں نے بارہا ان سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ کمپوزنگ کے پیسے لے لیں اور مسودات ہمیں دے دیں، تاکہ ان کی یہ کتابیں بھی، جو قوم کی امانت ہیں، چھپ سکیں، انہوں نے وعدہ تو بارہا کیا لیکن اب تک وعدہ وفا نہ کیا، کہ شاید اس میں ان کے اپنے اصول آڑے آتے ہوں۔ خدا کرے یہ مسودات ان کے پاس اب بھی محفوظ ہوں اور مستقبل میں کسی وقت عرفان عباسی کے نام سے ہی شائع ہو کر منظر عام پر آئیں۔

کسی بھی شخصیت کو سمجھنے، جانچنے یا محسوس کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ اس شخص سے قربت، میل

ملاقات، گزرتے وقت کے ساتھ اس کا عمل اور رویہ ایسی چیزیں ہیں، جن کی بنیاد پر شخصیت کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

میرے ساتھ طویل عرصے تک عرفان عباسی کا رویہ مشفقانہ ہی رہا۔ میں جب بھی سنبھل جانے کا ذکر ان سے کرتا تو موصوف شعرا کے ناموں کی ایک فہرست تھما دیا کرتے کہ ان شاعروں کے بارے میں کچھ معلومات اگر حاصل ہوسکے تو اچھا ہے۔ یہ معاملہ صرف میرے ساتھ نہیں تھا، بلکہ ہر آنے والے کو وہ اس طرح کی ایک 'پرچی' پکڑا دیا کرتے تھے نیز اس سلسلے میں وہ پوسٹ کارڈ کے ذریعے بھی لوگوں سے معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔ لوگ بھی ان سے خوب تعاون کرتے تھے۔

میرا اپنا پرنٹنگ پریس ہونے کی وجہ سے ان سے ایک رشتہ کاروباری بھی ہوگیا تھا۔ حالانکہ اس کاروباری رشتے کی عمر بہت کم رہی۔ 'تذکرہ شعرائے اترپردیش' کی کئی جلدیں میرے پریس میں چھپیں۔ لیکن عرفان عباسی کا مزاج تھا کہ بہت دنوں تک کسی سے خوش یا مطمئن نہیں

> **عرفان عباسی کی شخصیت میں بہت سی خوبیاں اور ہنر مندیاں تھیں۔ ہر کسی سے شفقت و شائستگی سے پیش آنا ان کا خاص وصف تھا۔ کم گو تھے اور انتہائی شائستہ انداز سے گفتگو کیا کرتے تھے۔**

رہ سکتے تھے۔ مخمور کاکوروی سے وہ تعلق خاطر کا اظہار کیا کرتے تھے۔ مخمور صاحب بھی اردو اکادمی کے ان کے کام بہت دلچسپی سے کرایا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مخمور کاکوروی نے کتابوں کی طباعت کا کام اس طرح شروع کردیا کہ وہ اردو اکادمی یا فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ سے منظور ہونے والی کتابوں کی طباعت کی ذمے داری لے لیا کرتے تھے اور کتاب کمپوز کراکے کسی پریس میں چھپوا کر تیار کرالیتے۔ اردو اکادمی کے شعبہ نشر و اشاعت کی ذمے داری چونکہ ان کے سپرد تھی، اس لیے پریس والوں سے ان کے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے۔ عرفان عباسی کی کئی کتابیں انھوں نے الگ الگ پریس میں چھپوائیں۔ کچھ دن تک تو عرفان عباسی ان کی محنت، لگن اور کتابوں کی طباعت میں ان کی دلچسپی کے گن گاتے رہے، لیکن بہت جلد ان کی یہ رائے تبدیل ہوگئی اور پھر تو وہ ان کے تعلق سے ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے تھے کہ بات ذاتیات تک پہنچ جاتی تھی۔ اس سلسلے کے کئی تجربات سے مجھے بھی گزرنا پڑا۔ ڈاکٹر اسرار قریشی جس زمانے میں پی ایچ ڈی کررہے تھے، عرفان عباسی صاحب نے اپنے ذخیرۂ کتب سے ان کا بہت تعاون کیا، اسرار قریشی نے شکریہ کے طور پر ان کے خاکوں کا ایک انتخاب مرتب کرکے شائع کردیا۔ کچھ عرصہ گزرا کہ اسرار قریشی اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر میں کسی پروجیکٹ کے تحت کام کرنے لگے اور اس مصروفیت کے سبب عرفان صاحب سے ملاقات کا سلسلہ ختم سا گیا۔ بس عرفان صاحب نے ہر آنے والے سے انھیں 'احسان فراموش' کہنا شروع کردیا۔

ڈاکٹر محمد حیات الدین نے عرفان عباسی کی تحریروں کا ایک انتخاب 'لکھنؤ کی ادبی انجمنیں' کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب کی کافی پذیرائی ہوئی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے ڈاکٹر حیات الدین نے یہ کتاب 2008 میں شائع کی۔ اس کتاب پر بحیثیت مرتب انھیں کا نام درج ہے۔ ان سب معاملات میں ہمارے دوست رضوان احمد فاروقی پیش پیش تھے۔ کتاب چھپی، پسند بھی کی گئی لیکن ڈاکٹر حیات الدین کو اس کا انعام جن 'جملوں' کا استعمال کرکے دیا گیا، وہ ہرگز مناسب نہیں تھے۔ یہ عرفان عباسی کا عمل تھا، جس پر میں نے اپنا اختلاف بھی درج کرادیا تھا اور ایک عمل ڈاکٹر حیات الدین کا تھا کہ ان سب باتوں کے باوجود وہ جب بھی لکھنؤ آتے تو عرفان عباسی صاحب سے ضرور ملاقات کرتے تھے۔ حیات الدین بھائی انتہائی شریف النفس انسان ہیں اور ایک شریف النفس انسان کو اپنی حدود و قیود کا علم ہوتا ہے کہ کون سی بات کب، کہاں اور کیسے کہنی ہے۔

اس واقعے کے بعد میں اپنے بارے میں بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہا۔ جو انسان میرے سامنے اپنے ایک محسن کو اچھے الفاظ میں یاد نہ کرتا ہو، وہ میرے بارے میں کیوں کر کوئی اچھی رائے پیش کرے گا۔ مجھے ان کی یہ اور اس طرح چند دوسری باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ یہی سبب رہا کہ میں نے بھی اس کے بعد وہاں جانا آنا کم کردیا، نتیجتاً انھوں نے میرے بارے میں بھی حسب عادت رضوان فاروقی سے بہت کچھ کہا۔ لیکن مجھے برا اس لیے نہیں لگا کہ یہ ان کا خاص مزاج تھا، جسے میں نے ان کی بشری کمزوری سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔

مجھے ان کی صحبت میں وقت گزارنے کی وجہ سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے اپنی ذاتی لائبریری کے دروازے میرے لیے کھول دیے تھے۔ کبھی کسی کتاب کے لیے انکار نہیں کیا۔ 'تذکرہ شعرائے اترپردیش' کی ابتدائی چند جلدیں انھوں نے مجھے عنایت کی تھیں، دو میرے پریس میں چھپی تھیں اور دو مخمور کاکوروی صاحب نے مجھے دیں۔

عرفان عباسی صاحب دل کے پرانے مریض تھے۔ اس بیمار دل پر غم کے پہاڑ بھی ٹوٹ چکے تھے۔ چھوٹے بھائی سلمان عباسی اور اکلوتے بیٹے شعیب عباسی کی جدائی کا غم ہمیشہ تازہ ہی رہا۔ سلمان عباسی کو وہ بہت یاد کرتے تھے۔ بیمار دل کی کہانی ہر ایک کو سنا کر شاید اپنا غم ہلکا کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے کی سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ دل کا ایک دورہ ایسا پڑا کہ اس کے اثر کو کم کرنے کے لیے ڈاکٹر نے بہت ہارڈ انجکشن دیا۔ اس انجکشن کے بعد سے رات کی نیند ہمیشہ کے لیے اڑ گئی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ میں نے کبھی انھیں آرام کرتے نہیں دیکھا۔ 'تذکرہ شعرائے اترپردیش' ان کا جنون تھا۔ پوری توانائی سے وہ اس کام میں لگے رہتے تھے۔ ابتدائی 5-6 جلدوں میں انھوں نے بڑی محنت سے خاکے لکھے ہیں، لیکن اس کے بعد کی جلدوں میں وہ محنت نظر نہیں آتی اور تحقیق میں کئی آنچ کی کمی کو ان کا قاری بھی محسوس کرتا ہے۔ بایں ہمہ ان کی دیوانگی نے ہزاروں کی تعداد میں شعرا کے احوال اور منتخب شعری نگارشات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا ہے، جو ایک بڑا کارنامہ ہے۔

عرفان عباسی کی شخصیت میں بہت سی خوبیاں اور ہنر مندیاں تھیں۔ ہر کسی سے شفقت و شائستگی سے پیش آنا ان کا خاص وصف تھا۔ کم گو تھے اور انتہائی شائستہ انداز سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ ہاں! خوبیوں کے ساتھ ان میں خامیاں اور کوتاہیاں بھی تھیں۔ انسان مجسم اچھا ہی اچھا نہیں ہوسکتا، کچھ بشری الجھنیں بھی رہتی ہیں۔ وہ اپنے بیمار دل کے ساتھ اترپردیش کے شاعروں کے احوال و آثار صفحۂ قرطاس پر پوری توانائی کے ساتھ رقم کرتے رہے۔ دماغ تو آخری وقت تک توانا رہا لیکن دل نے ساتھ چھوڑ دیا۔ آج وہ بھی تذکرے کا حصہ بن گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور ان کی علمی و ادبی خدمات کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین۔

■

Mohd Ovais Sambhli
178/157 Barood Khana,
Opp. Noorul Islam School, Golaganj,
Lucknow - 226 018 (UP)
Mob.:9794593055/7905636448

رؤف خیر

منظور احمد منظور

دلچسپ نثر نگار، باکمال شاعر

پورے ایک سو سال پہلے 10/مارچ 1923 کو حیدرآباد دکن کی سرزمین پر آنکھ کھولنے والے جناب منظور احمد منظور کو ادبی دنیا نے تقریباً بھلا ہی دیا۔ دکن کی مایہ ناز شخصیات کو منظور صاحب نے بڑے قریب سے دیکھا ان کے ساتھ کام کیا ان سے باضابطہ انٹرویو لیے اور اُن پر سیر حاصل مضامین لکھے جو حیدرآباد کے مشہور و ممتاز رسائل میں شائع ہوئے جیسے سب رس، شاداب، پونم، ہمسر، روزنامہ منصف، روزنامہ ملاپ، روزنامہ سیاست، ماہ نامہ رفتار زمانہ، ماہ نامہ صبا، ماہ نامہ آندھرا پردیش وغیرہ بیشتر مضامین آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر بھی لکھے گئے تھے۔ دکن کا نام روشن کرنے والی بیشتر شخصیات سے منظور احمد منظور کے قریبی تعلقات رہے، اس طرح انھوں نے ان شخصیات کے بارے میں جو کچھ لکھا تجربات و مشاہدات کی روشنی میں لکھا۔ ان پر یہ مصرع گویا ہر اعتبار سے صادق آتا ہے۔

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی

ہم اگر منظور احمد منظور سے ملتے ہیں تو گویا اُن تمام نامور ہستیوں سے ملتے ہیں جن سے منظور صاحب مل چکے ہیں اور ان کے حوالے سے ایک دور کی تہذیب اور ایک دور کے نابغۂ روزگار ادیبوں، شاعروں سے ہمیں تعارف حاصل ہوتا ہے۔ منظور صاحب نے ماشاء اللہ کیسی کیسی جلیل القدر ہستیوں کی آنکھیں دیکھی ہیں جیسے نازش دکن امجد حیدرآبادی، مہاراجا کشن پرشاد، صفی اورنگ آبادی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر سید علی اکبر، ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، معمار دکن جناب ولی قادری، پروفیسر تقی علی مرزا، پروفیسر عبدالعظیم اور پروفیسر اکبرالدین صدیقی۔

جن مشہور و ممتاز شخصیات کے بارے میں ہم نے صرف سن رکھا ہے انھیں منظور صاحب نے ہماری آنکھوں کے سامنے لاکھڑا کر دیا اور ان کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈال کر بتایا کہ کیسی کیسی بے پناہ شخصیات سے ان کا رابطہ رہا۔ اس طرح ہمیں منظور احمد منظور کی آنکھوں میں ان تمام ہستیوں کی شبیہ دکھائی دیتی ہے۔

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اپنے دور کے ہر قابل ذکر ادیب و شاعر سے منظور صاحب واقف تھے اور اردو کے بیشتر اہل ذوق منظور صاحب کی ادبی تگ و دو کی داد دیا کرتے تھے۔

فرماں روائے دکن نظام سابع میر عثمان علی خان کے استاد فصاحت جنگ جلیل نور خاں بازار میں جلیل منزل میں سکونت پذیر تھے انہی کے ہم سائے جناب منظور احمد تھے۔ گھر کے بالکل روبرو بڑی دل نواز شخصیت حسن الدین احمد آئی اے ایس کا عزیز ولا ہے۔

سید سلیمان ندوی نے اپنے رسالہ معارف (فروری 1933) میں امجد حیدرآبادی کو حکیم الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ جوش ملیح آبادی جیسے خود پرست شاعر نے بھی رباعیات کے فن میں امجد حیدرآبادی کی انفرادیت کو تسلیم کیا۔ بقول منظور صاحب نواب بہادر یار جنگ کی اچانک موت پر ایک ٹاکیز میں تعزیتی جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں امجد حیدرآبادی نے ایک دردناک رباعی سنا کر حاضرین کو متاثر کیا۔

دل شاد نہیں تو ناشاد سہی
لب پہ نغمہ نہیں تو فریاد سہی
ہم سے دامن چھڑا کے جانے والے
جاجا تو نہیں تو تری یاد سہی

منظور صاحب نے لکھا کہ انھیں قوالی کی کئی ایسی محفلیں یاد ہیں جن میں قوالوں نے امجد حیدرآبادی کی موجودگی ہی میں امجد کا کلام سنا کر سماں باندھ دیا تھا۔ 29/مارچ 1961 کو اس دار فانی سے کوچ کر جانے والے قلندر مزاج امجد حیدرآبادی کا کلام منظور صاحب نے ان کی زبانی کئی بار سنا۔

مارچ 1953 میں گورنمنٹ ہائی سکول چوک حیدرآباد کے طلبہ کے ترجمان 'نورس' کے لیے منظور صاحب نے امجد کا کلام حاصل کر کے شائع کیا جو نورس کے لیے اعزاز تھا۔ منظور صاحب نے لکھا کہ امجد نے انھیں دو رباعیاں عنایت کی تھیں۔

کچھ کیے جاؤ لے کے نام خدا
کچھ نہ کرنا بڑی خرابی ہے
کامیابی کچھ اور چیز نہیں
کام کرنا ہی کامیابی ہے
لب پر کس شخص کے دم سرد نہیں
کس کا چہرہ ہے آج جو زرد نہیں
ہر فرد ہے درد مند فرداً فرداً
لیکن کوئی کسی کا ہمدرد نہیں

(ہمارے خیال میں پہلا قطعہ ہے جو رباعی کے نام سے شائع ہو گیا۔)

منظور احمد منظور نے اپنے قلم سے امجد حیدرآبادی کا دل پذیر خاکہ بھی کھینچا ہے۔

مہاراجا کشن پرشاد شاد کو اپنی موٹر میں راستے سے گزرتے ہوئے 1938 میں سکے لٹاتے بھی منظور احمد منظور نے دیکھا جب وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ منظور صاحب نے کشن پرشاد شاد کی اردو فارسی شاعری کے علاوہ ان کے مکاتیب کے حوالے سے بھی داد تحقیق دی۔ کشن پرشاد شاد نے کچھ ناول بھی لکھے۔ ان کا پہلا ناول 'مطلع خورشید' تھا۔ اس کے علاوہ سفرنامے بھی لکھے۔

حیدرآباد کے مشہور و معروف شاعر صفی اورنگ آبادی کو بھی منظور صاحب نے قریب سے دیکھا اور ان کا ایک

حسب حال شعر بھی درج کیا۔

ہوا ہوں جب سے مفلس اپنے آنسو آپ پیتا ہوں
کروں کیا اے صفی عادت بری ہوتی ہے پینے کی

صفی کی شاعری کے حوالے سے لکھا ہوا منظور صاحب کا مضمون 'یادگار صفی' مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد میں شامل ہے، جو 1956 میں منظر عام پر آیا تھا جسے اس کتاب میں بھی شامل کرلیا گیا ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے ساتھ منظور احمد منظور کو گہرا لگاؤ تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کے دوران 1944 سے 1947 تک ان کے طالب علم رہے پھر جب درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے تو ڈاکٹر زور سے تعلقات مزید استوار ہوئے۔ منظور صاحب ایم اے تو تھے ہی بڑی آسانی سے پی ایچ ڈی بھی کرسکتے تھے مگر نہ تو ڈاکٹر زور نے رہنمائی کی اور نہ کسی اور ہستی نے ان کے ڈاکٹر بننے کی راہ ہموار کی حالانکہ اپنی تحقیقی کاوشوں میں اُن سے بے انتہا مدد لی۔ ایک محترمہ کے چشم کرم کے امیدوار بے چارے منظور احمد منظور رات دن ایک کرکے اس کے لیے کئی کتب خانے چھان کر قیمتی ادبی و تاریخی مواد و مسالہ جمع کرکے پیش کیا کرتے تھے جو موصوفہ کے نام سے کتابی صورت میں آتا رہا۔ ایک اور ادبی ہستی کی محبت کا چراغ منظور صاحب کے دل کے طاق کی 'زینت' بنا رہا مگر موصوف کی زبان پر کبھی 'حرف شوق' نہ آسکا تا آں کہ انھوں نے اپنے شعری سرمایے کا نام ہی 'حرف شوق' رکھا جو مکتبہ 'شعر و حکمت' کے زیر اہتمام دسمبر 1971 میں منظر عام پر آیا اس پر ہم آگے گفتگو کریں گے۔ فی الحال 'مضامین محمد منظور احمد' کا جائزہ مقصود ہے جو منظور صاحب کے چند ایک مضامین، انٹرویوز اور ان کی مختصر سوانح پر مشتمل ہے۔ جس میں امریکہ کا یادگار سفرنامہ بھی شامل ہے۔

آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے لیے بھی منظور صاحب نے مضامین لکھے جیسے معاشرے میں ادیب کی ذمہ داریاں، کہاوتیں، ہندوستانی قومیت کے رہبر ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، زندگی غالب کی نظر میں۔

راجندر پرشاد ملک کے پہلے صدر 1950 سے 1957 تک رہے۔ وہ گاندھی جی کے بے حد قریب تھے۔ منظور صاحب نے راجندر پرشاد کے بارے میں وہی لکھا جو ریڈیو نشریے کے لیے مناسب تھا۔ اس کے علاوہ چمپارن ضلع میں دورے کے موقع پر انگریز آفیسر ارون Irwin نے 1917 میں ایک سازش کے تحت گاندھی جی کی دعوت کی تھی اور اپنے خانساماں بطخ میاں انصاری کو حکم دے رکھا تھا کہ گاندھی جی کو زہر ملا ہوا دودھ پیش کرے مگر بطخ میاں نے گاندھی جی کے ساتھ دعوت میں شریک راجندر پرشاد کو بتادیا کہ دودھ میں زہر ملا ہوا ہے اس طرح بطخ میاں انصاری نے مہاتما گاندھی کی جان بچائی جس کے عینی گواہ راجندر پرشاد تھے۔ انگریز آفیسر نے نتیجتاً بطخ میاں کو سخت سزا دی Siswa Ajgari میں ان کا مکان قرق کیا اور ان کو شہر بدر کردیا۔ صدر جمہوریہ بننے کے بعد اُسی چمپارن میں جب راجندر پرشاد نے بطخ میاں انصاری کو کس مپرسی کی حالت میں دیکھا تو فوری وہاں کے کلکٹر کو ہدایات دیں کہ گاندھی جی کی جان بچانے والے بطخ میاں انصاری کو کچھ زمین الاٹ کی جائے تاکہ وہ چین سے زندگی گزار سکیں۔ مگر افسوس راجندر پرشاد کی ہمدردانہ ہدایات پر عمل کبھی نہیں ہوا اور بطخ میاں بے یارو مددگار ہی دنیا سے چل بسے۔

> منظور احمد منظور کی شاعری پوری فضا کو اپنی میں سموئے ہوئے ہے۔ پھر ان کے یہاں محبت بھی خالص 'افلاطونی' ہے جو محبوب کے 'قرب' سے نہیں 'محبوب کے 'خیال' سے وجود میں آتی ہے چنانچہ ان کے کلام میں تجربے کی گہرائی اور احساس کی گرمی کم ہے۔

انجینئرنگ میں اعلی قابلیت اور ممتاز حیثیت والے ولی قادری ایگزیکٹیو انجینئر سے منظور صاحب نے 1979 میں انٹرویو لیا جنھوں نے قبل از وقت وظیفہ حاصل کرکے قوم اور ملت کی خدمت کے جذبے کے تحت خانگی طور پر اپنا ادارہ قائم کیا جس کے تحت کئی تعمیراتی پروجیکٹ روبہ عمل لائے گئے۔ سول انجینئرنگ کنسل ٹینسی ولی قادری اینڈ اسوسیٹس کے نام سے قائم کردہ ادارے کے تحت کئی سینئر انجینئرس، جونیر انجینئرس، ڈرافٹس مین، ٹریسر، بلو پرنٹ آپریٹرس، کمپیوٹر پروگرامرس، کلرکس، منیجر وغیرہ کام کرتے تھے۔ ولی قادری نے کئی انگریزی شعرا کی نظموں کا منظوم اردو ترجمہ بھی کیا جن میں سے چند حسن الدین احمد کی کتاب 'سازِ مغرب' میں شامل بھی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ طبع زاد نظمیں غزلیں بھی ولی قادری صاحب کہتے تھے۔ ان کا مشورہ تھا: ''نام کی خاطر نہیں بلکہ کام کی خاطر کام کرو''۔

'پروفیسر تقی علی مرزا سے ایک ملاقات' کے تحت جناب منظور نے ان سے سیر حاصل مصاحبہ کیا۔ اس مصاحبے میں طلبہ کی انگریزی میں صلاحیتوں کے فروغ کے تعلق سے گفتگو کی گئی۔ تقی علی مرزا نے یہ انکشاف بھی فرمایا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں جرنلزم میں ڈپلوما کی تعلیم کا انتظام 1956 میں شروع کیا گیا تھا۔ تقی علی مرزا نے کئی مشاہیر کا ذکر کیا اس طرح منظور صاحب کے توسط سے کئی علمی ادبی شاہ کاروں اور قلم کاروں سے قاری کا تعارف ہوجاتا ہے۔ انگریزی میں تقی علی مرزا کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

(ناچیز رؤف خیر اور اعظم راہی نے بھی مشترکہ طور پر پروفیسر تقی علی مرزا سے عزیز احمد کے حوالے سے انٹرویو کیا تھا جو ان کے استاد رہے۔ یہ انٹرویو ناچیز کی کتاب 'حق گوئی و بے باکی' میں شامل ہے)۔

ادارۂ ادبیات اردو کے روح رواں پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی صاحب سے بھی منظور صاحب نے بھرپور انٹرویو کیا جو بجائے خود ان کے تمام کارناموں کی دستاویز ہے۔ اس انٹرویو کے ذریعے اکبر الدین صدیقی کی بے لوث خدمات پر روشنی پڑتی ہے۔ پتہ چلا کہ منظور صاحب آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے تو گورنمنٹ سٹی ہائی اسکول حیدرآباد میں اکبر الدین صدیقی ان کے استاد تھے۔ اکبر الدین صدیقی نے کئی کتابیں مرتب کیں۔ ان کی مرتبہ کتابیں ادارۂ ادبیات اردو کے تحت ہونے والے امتحانات کے نصاب میں شامل رہے ہیں۔

حیدرآباد کی سڑکوں پر پیدل چلنے والے، نظام ٹرسٹ کے رسالہ 'مبصر' کے مدیر، اردو مجلس کے رسالہ 'مجلس' کے ایڈیٹر، 'اقبال ریویو' اور 'شگوفہ' کے معاون کی حیثیت سے بے لوث خدمات انجام دینے والے جناب منظور احمد منظور کو ہم نے بار ہا دیکھا ہے۔ بڑے زندہ دل اور بذلہ سنج منظور صاحب کی گفتگو بہت دل چسپ ہوا کرتی تھی۔ آندھرا (تلنگانہ) کے ادیبوں، شاعروں کی ڈائرکٹری کے لیے بھی وہ سرگرداں رہے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ 31/ مارچ 1978 کو وہ ڈگری کالج سے لکچرر کی حیثیت سے وظیفے پر علاحدہ ہوئے جس کی وجہ سے وظیفے میں کافی نقصان ہوا۔ پھر پچپن سال کی بجائے اٹھاون سال وظیفے کی عمر قرار دیے جانے کی وجہ سے جان میں جان آئی۔ تاہم ان کے وظیفے کی رقم معقول نہیں کبھی

جا سکتی تھی۔ اپنی شیروانی کے دونوں جیبوں میں مختلف روشنائیوں کے چار چار قلم لگائے میلوں پیدل سفر کرنے والے صاحب قلم منظور احمد کی بے لوث و بے انتہا خدمات کے جاننے والے کم کم ہی رہ گئے ہیں۔

منظور صاحب نے انٹرویو لیتے ہوئے بیشتر ہستیوں سے دریافت کیا کہ آیا وہ اپنی سوانح لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، سبھوں نے نفی میں جواب دیا۔ خود منظور صاحب نے اتنے کارنامے انجام دیے کہ سوانح کے لیے اچھا خاصا مواد جمع ہو سکتا تھا، مگر انہوں نے اپنی کتاب 'مضامین منظور احمد' کے آخری چھے صفحات میں اپنی زندگی کی پوری روداد بیان کردی۔ پیدائش 10/ مارچ 1923 پھر تعلیم، تعلیم کے بعد پیشہ درس وتدریس کا انتخاب، مختلف اداروں میں خدمات، وظیفے پر سبک دوشی رسائل وجرائد میں تخلیقات کی اشاعت اور آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر بعض مضامین کا لکھنا۔ منظور صاحب کی ایک غزل کا محترمہ بلقیس علاء الدین نے انگریزی میں ترجمہ کیا جو مدراس کے ماہ نامہ Poet میں تعارف کے ساتھ نومبر 1971 میں شائع ہوا۔

1978 میں سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے فوراً بعد اپنے بھائی ڈاکٹر مظفر حسین اور ان کی بیوی ڈاکٹر ثریا حسین کی دعوت پر انہی کے ساتھ حیدرآباد سے 30/ اگست 1978 کو وہ امریکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ منظور صاحب نے 'میرا ایک یادگار سفر' کے عنوان سے اس سفر کی دلچسپ روداد تحریر فرمائی جو ان کے مضامین کا 'بیت الغزل' ہے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اسے لفظوں کا پیرہن عطا کیا۔ لکھتے ہیں:

''امریکہ پر قدرت واقعی بے حد مہربان ہے۔ یہاں اگر ایک طرف دل کش قدرتی مناظر کی فراوانی ہے تو دوسری طرف سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں امریکی قوم کی حیرت انگیز ترقی سیاحوں کو دعوت غور وفکر دیتی ہے۔''

ہمارے لیے یہ ایک اعزاز کی بات ہی ہے کہ ہم نے مخدوم محی الدین، خورشید احمد جامی، سلیمان اریب، شاذ تمکنت جیسے ہندو پاک کے شہرت یافتہ شاعروں کے ساتھ جناب منظور احمد منظور کو مشاعروں میں داد وصول کرتے دیکھا۔ منظور صاحب کم گو تھے مشاعروں میں دو دو چار چار اشعار پر مشتمل دو چار غزلیں ہی سنایا کرتے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ 'حرف شوق' دسمبر 1971 میں مکتبہ شعر و حکمت کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کے پیش لفظ میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے تحریر فرمایا:

''ایسا اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگوں کی طبیعت کے شعر دیر میں آتے ہیں اور یہ دیر رس شعر بڑے خوش گوار ہوتے ہیں یہی واقعہ منظور صاحب کی صورت میں بھی پیش آیا۔ جب وہ شعر کہنے لگے تو پختہ کار شاعر بن کر ہمارے سامنے آئے اور نہ صرف مجھے بلکہ اکثر لوگوں کو اچنبھے میں ڈال دیا۔''

محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے منظور صاحب کے بارے میں جو 'رائے' دی وہ منظور صاحب کی شخصیت کی کامیاب عکاسی کرتی ہے۔ لکھتی ہیں:

وہ (منظور احمد) 'چاہنے' اور 'چاہے جانے' کی شدید خواہش کے باوجود اس کا کھل کر اظہار نہیں کر پاتے۔ منظور صاحب کا شعر۔

دل یہ کہتا ہے مرا کچھ تو کہو
مصلحت کہتی ہے خاموش رہو

ان کی شاعری پوری فضا کو اپنے میں سموئے ہوئے ہے۔ پھر ان کے یہاں محبت بھی خالص 'افلاطونی' ہے جو محبوب کے 'قرب' سے نہیں، محبوب کے 'خیال' سے وجود میں آتی ہے چنانچہ ان کے کلام میں تجربے کی گہرائی اور احساس کی گرمی کم ہے۔''

منظور صاحب کے 'حرف شوق' سے گزر کر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ جیسی صاحب نظر کی وقیع رائے پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔ انھوں نے دو جملوں میں ان کے شعر اور شخصیت کا جامع جائزہ پیش کردیا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے نکتہ پیدا کیا کہ ''منظور صاحب کی شاعری عشقیہ سے زیادہ عاشقانہ ہے۔''

جناب منظور احمد نے 'حرف شوق سے پہلے' کے عنوان کے تحت لکھا کہ اس مجموعے کی ساری غزلیں سات سال کے عرصے میں ہوئی ہیں۔ گویا 1964 سے 1971 کے دورانیے میں کہی ہوئی غزلوں پر 'حرف شوق' مشتمل ہے، جس میں جملہ 72 غزلیں ہی ہیں۔

منظور صاحب نے نظم ونثر میں خود کو منوانے کی کوشش کی۔ ان کے مضامین کے حوالے سے گفتگو ہو چکی اب چند اشعار کے ذریعے ان کے فکر وفن کا جائزہ پیش ہے۔ ان کی باخبری کی داد دیجیے۔

ہر دور میں انعام لیے بے بصری نے
موتی ہی لٹائے ہیں یہاں دیدہ وری نے
الزام کسی پر نہیں بربادی دل کا
وارفتہ کیا تھا ہمیں وحشت اثری نے

کہیں کہیں منظور صاحب نے بڑی فنی مہارت سے الفاظ برت کر چونکایا بھی ہے۔

بعد مدت نور کا تڑکا ہوا
ظلمتوں کا آج منہ کالا ہوا

اُس طرف ساقی کی خست تھی غضب
اس طرف تھا حوصلہ بڑھتا ہوا

منظور صاحب بیشتر محفلوں میں اپنی یہ پسندیدہ غزل سنا کر رنگ جماتے تھے اور جم کر پڑھتے تھے۔

دل یہ کہتا ہے مرا کچھ تو کہو
مصلحت کہتی ہے خاموش رہو
اُس بُت شوخ کے پتھر دل کو
پیار سے جیت سکو تو جیتو
یوں نہ اترے گا خمار ہستی
اور اک جامِ مئے تلخ پیو
نت نئے فتنوں میں جب گھرتا ہوں
خلق کہتی ہے جیو۔ اور۔ جیو
دیکھو پھر تم کو پکارے ہے کوئی
کہیں منظور کی آواز نہ ہو

منظور صاحب نے بعض مشہور فلمی گانوں کی 'طرح' میں بھی غزلیں کہی ہیں جو ان کی اپنی زندگی کی ترجمان ہیں۔

مجھ کو کسی کے پیار نے مارا ہے دوستو
وہ جس کا پیار جان سے پیارا ہے دوستو
رازِ دل ہم سے کہا جاتا نہیں
کچھ خیال اس کو بھی کیوں آتا نہیں
گھٹا جب آسماں پر گھر کے آئی، آپ کیوں روئے
سیاہی شب کی جب ہر سمت چھائی، آپ کیوں روئے

روایتی اسلوب کے علاوہ جدید انداز میں بھی منظور احمد منظور نے بعض شعر کہے جیسے ایک شعر ہے۔

سائے کی طرح جو مرے ہم راہ چلا ہے
وہ شخص بھی اب میرا پتہ پوچھ رہا ہے

مختصر یہ کہ نثر کے ساتھ ساتھ غزل کے ذریعے بھی منظور صاحب نے اہل ذوق سے داد پائی اور تقریباً نوے 90 برس کی عمر میں چپکے سے گزر گئے۔

ماخذ

1 مضامین محمد منظور احمد، ادبی مرکز، اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد، نومبر 1986
2 حرف شوق، مکتبہ شعر و حکمت حیدرآباد اشاعت دسمبر 1971
3 Saviour of Gandhi ji - Bataq Miyan Ansari (Telugu) by Syed Naseer Ahmad - English Translation by BVK Purna Nandam Azad House of publication- Undavalli- 522501

■

Dr. Raoof Khair
Moti Mahal, Golconda
Hyderabad-500008 (Telangana)
Cell : 9440945645
Email : raoofkhair@gmail.com

عمیر منظر

کرشن بہاری نور کا رنگ سخن

کرشن بہاری نور (1926-2003) کا شمار اردو کے مقبول شعرا میں کیا جاتا ہے۔ ان کے بہت سے اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ روانی اور برجستگی ان کے اشعار کی نمایاں خوبی ہے۔ لکھنؤ کے عام ادبی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔ بچپن سے ہی انھیں شعروادب سے گہرا لگاؤ تھا بلکہ ایک حد تک وارفتگی کا یہ جذبہ کبھی کبھی دیوانگی کی منزلوں تک پہنچ جاتا۔ جس طرح سے انھوں نے صاف اور سادہ شعر کہے ہیں اسی طرح انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی برسوں کی شعری سرگرمی کی کہانی بھی بیان کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کس قدر توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ بلکہ کسی قدر جانفشانی کے ساتھ شاعری کی مشق بہم پہنچائی۔ ان کو یہ تقویت اپنے گھر سے ہی ملی کیونکہ ان کے ماموں گوکرن پرشاد کرن لکھنوی شاعری کے دلدادہ تھے اور مشاعروں کا اہتمام کرتے تھے، جب کہ ان کی خالہ تو باقاعدہ شاعری کرتی تھیں اور اساتذۂ سخن کے رابطے میں رہتی تھیں۔ کرشن بہاری نور کے متعدد شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام 'دکھ سکھ' کے نام سے 1977 میں شائع ہوا۔ دوسرا 'حسینیت کی چھاؤں' 1980 میں۔ تیسرا 'تپسیا' کے نام سے 1982 میں منظر عام پر آیا۔ چوتھا مجموعہ کلام 'سمندر مری تلاش میں ہے' 1994 میں شائع ہوا۔ انھیں اتر پردیش اردو اکادمی نے ان کی ادبی خدمات پر بھی انعام سے سرفراز کیا تھا۔ واضح رہے کہ کرشن بہاری نور پوسٹل اینڈ ٹیلی گراف محکمہ میں ملازم تھے اور وہیں سے سبکدوش ہوئے۔

کرشن بہاری نور نے ابتدائی چند غزلوں تک بیدار صاحب سے مشورہ کیا، پھر انھیں کے کہنے پر فضل نقوی (1913-1991) سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ فضل نقوی کے بارے میں انھوں نے جس تفصیل سے اپنے رابطے اور تعلق کی کہانی کو بیان کیا ہے، اس سے اس زمانے کی عام استادی و شاگردی کی روایت پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز اساتذہ کا شاگردوں کے تئیں رویہ اور خود شاگرد کسی طرح اپنے اساتذہ سے رابطے میں رہتے تھے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مبتدی شعرا اپنے اساتذہ سے استفادے کا کوئی موقع نہیں جانے دیتے تھے کچھ یہی حال کرشن بہاری نور کا بھی تھا۔ انھوں نے اپنے استاد فضل نقوی سے شاعری اور اس کی فنی باریکیاں سیکھیں۔ فضل نقوی خود بڑے عالم اور شعروادب پر غیر معمولی دسترس رکھنے والے تھے۔ لکھنؤ کی ادبی بہار کے بالکل آخری دور میں جن لوگوں نے قدیم اساتذہ کی یاد تازہ کر رکھی تھی ان میں فضل نقوی کا شمار ہوتا تھا۔ فضل نقوی سے کسب فیض کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ فضل نقوی بے حد مصروف انسان تھے مگر اس کے باوجود وہ نہایت توجہ سے کرشن بہاری نور کا کلام دیکھتے۔ اصلاح دیتے اور فنی رموز سے انھیں آگاہ بھی کرتے رہتے۔ فضل نقوی کے بارے میں کرشن بہاری نور کا یہ دلچسپ بیان ملاحظہ کریں:

''دراصل بات یہ تھی کہ استاد اس زمانے میں بھی بے حد مشغول رہتے تھے میں تو روز ہی دیکھا کرتا تھا ایک انجمن والا نوحہ کہلا کے لے گیا تو دوسری انجمن کا صاحب بیاض کھڑا اپنا دکھڑا رو رہا ہے وہ گیا تو کاتب آجاتا یہ

مضمون نہیں ملا مراقبہ تو لکھ دیجیے فلاں کالم میں اتنی جگہ بچ گئی ہے اس کو کیسے پر کیا جائے اس صفحہ پر کیا ہو اُس صفحہ پر کیا ہوگا ان سے نجات ملتی تو نئے پرانے شاگردوں میں سے کوئی نہ کوئی آجاتا غزلوں پر اصلاح، نوحوں پر اصلاح، قصیدوں پر اصلاح، غرض ایک جاتا تو دوسرا آجاتا میں تو روز اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا کوئی دن ایسا نہ گزرتا جس دن وہ فرصت سے ہوتے موصوف 'نظارہ' کے آفس ہی میں بیٹھے بیٹھے تمام کام انجام دیتے رہتے جب بہت تھک جاتے تو چند لمحوں کے لیے اندر جا کر آرام فرما لیتے مگر یہ آرام بھی کبھی وہ اپنی مرضی کے مطابق نہ کر پاتے کبھی کوئی راجہ صاحب یاد فرما رہے ہیں تو کبھی کوئی مجتہد اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ کبھی مذہبی بحث میں الجھے رہتے تو کبھی سیاسی گفتگو میں منہمک پائے جاتے کبھی ادبی سرگرمیوں میں ڈوب جاتے تو کبھی یادِ ایام گزشتہ گھیر لیتی۔ کبھی گھر والوں کی سنتے کبھی باہر والوں سے بات کرتے۔ میں اکثر سوچا کرتا کہ یہ دماغ جو بیک وقت کئی کئی سمتوں میں بٹ جاتا ہے اگر صرف ایک طرف مائل ہو جاتا تو شاید وہ دنیا کے ان لوگوں میں ہوتے جن کا شمار انگلیوں پر کیا جاتا ہے۔

(دکھ سکھ، کرشن بہاری، اسرار کریمی پریس الہ آباد 1983، ص 13)

اس اقتباس سے فضل نقوی کی استادانہ صلاحیتوں کا ہی اعتراف نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کرشن بہاری نور نے شاعری کی دنیا میں جو مقبولیت حاصل کی اور ان کے بعض اشعار کی جو آج تک گونج ہے ان میں استاد کی تربیت کا غیر معمولی کردار ہے۔ کرشن بہاری نور نے اس کا اعتراف اپنے پہلے شعری مجموعہ 'دکھ سکھ' میں کیا ہے۔

کرشن بہاری مشاعروں کے بے حد مقبول شاعر تھے۔ مشاعروں میں وہ بہت اعتماد اور اہتمام سے کلام پڑھتے تھے۔ اگرچہ تحت میں پڑھتے تھے مگر اپنے ایک مخصوص انداز کی وجہ سے جب وہ اپنا کلام پڑھتے تو ایک سماں بندھ جاتا۔ ان کے اساتذہ کا فیض اور لکھنؤ کے عام ادبی ماحول کا اثر ہی تھا کہ ان کے بہت سے اشعار اردو کے مشہور اشعار میں شمار کیے جاتے ہیں بلکہ ان میں بعض کی حیثیت زبان زد خاص و عام کی ہوگئی ہے۔ اس نوع کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

میں تو غزل سنا کے اکیلے کھڑا رہا
سب اپنے اپنے چاہنے والوں میں کھو گئے
میں جس کے ہاتھوں میں اک پھول دے کے آیا تھا
اسی کے ہاتھ کا پتھر میری تلاش میں ہے
اتنے حصوں میں بٹ گیا ہوں میں
میرے حصے میں کچھ بچا ہی نہیں

ہوس نے توڑ دی برسوں کی سادھنا میری
گناہ کیا ہے یہ جانا مگر گناہ کے بعد
بچھڑ کے تجھ سے نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں
عجیب طرح کے بس حادثے گزرتے ہیں

بنیادی طور پر کرشن بہاری نور عام فہم اور سادہ انداز میں شاعری کرتے تھے۔ درج بالا اشعار کی روانی اور ایک خاص کیفیت سننے والے کو زیادہ متاثر کرتی ہے۔ مشاعروں میں جب وہ پڑھتے تو بسا اوقات ان کے اشعار جادو کا اثر رکھتے۔ کیفیت اور روانی کے علاوہ یہ اشعار سہل ممتنع کے حامل ہیں۔ یعنی نہ ان میں کوئی مشکل لفظ ہے اور نہ کوئی مرکب لفظ بلکہ سیدھے سیدھے انداز میں شعر کہہ دیا ہے مگر شعر کی بنت اور لفظوں کی نشست برخاست اس فنکاری سے کی گئی ہے ان کی معنویت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ پہلا

کرشن بہاری نور کی شاعری سچ کی ایک ایسی اکائی ہے جس میں ایک جوگی کا بیراگ، ایک صوفی کا عرفان، ایک محبت کرنے والے دل کی وسعت اور ایک دردمند انسان کا گداز حل ہو کر ان کا ہنر بنا ہے۔ ان کی شاعری اس حقیقت کی سب سے بڑی اور سب سے سچی گواہ ہے کہ شاعر نے اپنے لفظوں کے حسن اور اپنے جذبے کے گداز کا مول اپنے خوابوں اور اپنی امیدوں اور اپنے تجربوں سے چکایا ہے۔

شعر تو اردو کے مشہور ترین اشعار میں ہے۔ کون ہوگا جسے یہ شعر یاد نہ ہو۔ دوسرے شعر میں بے وفائی یا احسان ناشناسی کا مضمون ہے۔ مگر اس کے لیے جس انداز کو اختیار کیا گیا ہے وہ قابل ذکر ہے۔ بقیہ اشعار کو بھی اسی ذیل میں دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح کرشن بہاری نور نے زندگی کے عام تجربوں کو شاعری کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ ان اشعار کا سادہ انداز اور فن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے شاعری کا جادو جگایا ہے۔

کرشن بہاری نور کی شاعری میں زندگی کا حسن اپنی تمام تر جمالیات کے ساتھ موجود ہے۔ انھوں نے ایک طرف جہاں عشقیہ مضامین کو برتا ہے وہیں زندگی اور اس کی نیرنگیوں کو بھی شاعری کا لباس عطا کیا ہے۔ انھیں اپنے زمانے اور حالات کا نہ صرف علم ہے بلکہ اس سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ زندگی کو کسی ایک رخ سے دیکھنے کے بجائے اس کے تمام پہلوؤں پر نظر ہے۔

اس سزا سے تو طبیعت ہی نہیں بھرتی ہے
زندگی کیسے گناہوں کی سزا ہے یارو
زندگی ٹھوکریں کھاتی ہے بچھڑ کر تجھ سے
تیرے پازیب کے ٹوٹے ہوئے گھنگھرو کی طرح
جہاں تک زندگی اور موت کے طوفان و ساحل تھے
وہیں تک ناخدائے کشتی عمر رواں ہم تھے
نشہ کا یہ عالم ہے بچ ہی بچ گئے سب کچھ
زندگی کی صہبا ہے میکدہ ہے خوابوں کا
زندگی پھر زندگی پھر زندگی
کچھ نہیں بس تہہ بہ تہہ تنہائیاں

اس سلسلے کا مشہور ترین شعر تو یہ ہے

زندگی سے بڑی سزا ہی نہیں
اور کیا جرم ہے پتا ہی نہیں

ان اشعار کا غالب پہلو امکانات کی تلاش ہے۔ زندگی سے فرار ممکن نہیں یہ ایک حقیقت ہے۔ سزا، گناہ، ٹھوکر، طوفان اور تہہ بہ تہہ تنہائیاں زندگی کی مختلف شکلوں کو ان اشعار میں پیش کیا گیا ہے۔ زندگی کی ان مختلف شکلوں سے اس کے تنوع اور بے شمار تجربوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تجربہ کہیں نظریہ، کہیں مشاہدہ تو کہیں کسی اور پہلو سے ظاہر ہو کر غزل کے مضامین کا حصہ بنتا رہا ہے۔ صدیوں پرانی اس روایت اور غزل کے روشن تجربے کو کرشن بہاری نور نے بھی درج بالا اشعار میں برتنے کی کوشش کی ہے۔

کرشن بہاری نور کی غزلوں میں گیان دھیان بھی ہے۔ یعنی وہ صرف محبت نہیں بلکہ عرفان محبت کے قائل ہیں۔ زندگی کو اسی رخ سے دیکھتے ہیں اور اسی وجہ سے کسی اکتاہٹ یا بے چینی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ تہہ بہ تہہ تنہائیاں سمیٹ رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں تلاش خیر کا پہلو نمایاں ہے۔ ہم اسے تعمیری فکر سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں وہ کہتے ہیں۔

زندہ رہنے کی ہوس تو ہے ضرور
اے مرے پروردگار اچھائیاں

وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

ہوس نے توڑ دی برسوں کی سادھنا میری
گناہ کیا ہے یہ جانا مگر گناہ کے بعد

تو دراصل ان کے اسی جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ عرفان صدیقی نے ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کرشن بہاری نور کی شاعری سچ کی ایک ایسی اکائی

ہے جس میں ایک جوگی کا بیراگ، ایک صوفی کا عرفان، ایک محبت کرنے والے دل کی وسعت اور ایک دردمند انسان کا گداز حل ہوکر ان کا ہنر بنا ہے۔ ان کی شاعری اس حقیقت کی سب سے بڑی اور سب سے سچی گواہ ہے کہ شاعر نے اپنے لفظوں کے حسن اور اپنے جذبے کے گداز کا مول اپنے خوابوں اور اپنی امیدوں اور اپنے تجربوں سے چکایا ہے۔ ہم عصر آوازوں کے شور میں نور کی آواز کا پہرا ہماری سماعت کے وسیلے سے ہمارے احساس کو متحرک اور ہماری فکر کو متوجہ کرتا ہے اپنی نرمی اور لطافت کے باوجود یا انھیں خصوصیات کی بنا پر انھوں نے زندگی کے دکھ سکھ سچ مچ جھیلے ہیں اور اپنے تجربوں کی روشنی اور گرمی سے اپنے شعر کا چہرا دمکایا ہے دنیا کے اتھاہ سمندر میں اپنے وجود کی دریافت اور پھر اس کی حفاظت بڑی جرأت اور بڑے ریاض کا تقاضا کرتی ہے وہ خود اس اگنی پریکشا سے گزرنے کے بعد ہی یہ کہنے کے قابل ہوئے ہیں۔ (تپیاس، کرشن بہاری، نور ص 122)

اردو کی غزلیہ شاعری میں زندگی تنہائی کے حسن سے عبارت ہے۔ جدید فکر و خیال کے شعرا کے یہاں تنہائی کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ تنہائی صرف تنہائی نہیں ہے بلکہ بے بسی اور بیکسی کا استعارہ بھی ہے جسے شہری زندگی نے جنم دیا ہے۔ اسی وجہ سے تنہائی جدید معاشرے میں فرد کی بے سمتی اور بے گھری قرار دی گئی۔ تنہائی اور تنہا ہونے پر جدید فکر و خیال کے حامل شاعروں نے خوب سے خوب پہلو نکالے ہیں اور شعری مضامین باندھے ہیں۔ کرشن بہاری نور نے بھی اس مضمون کو برتا ہے۔ کرشن بہاری نور روایت پسند شاعر ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ کی شعری روایت کے سانچے میں اپنی شاعری کو سجایا سنوارا تھا۔ اس لیے ان کے یہاں زبان و بیان کا لطف اور پہلے سے بیان کیے ہوئے مضامین نئے پیرہن میں ملتے ہیں۔ روایت سے استفادے کی خوب صورت مثالیں ان کے یہاں موجود ہے۔

کیا حسن ہے جمال ہے کیا رنگ و روپ ہے
وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تنہا دکھائی دے

اب یہاں تنہا دکھائی دینے کا کیا مطلب ہے۔ حسن و جمال نے اسے تنہا کیا ہے یا وہ اپنے رنگ و روپ کی وجہ سے یکہ و تنہا ہو گیا ہے کہ اس جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں دوسرے پہلو کو ہی ترجیح دی گئی ہے۔ یعنی کرشن بہاری نور نے اس مضمون کو ایک اور زاویہ دینے کی کوشش کی ہے۔ ایک شعر اور ملاحظہ کریں۔

ہر گھڑی تیرے خیالوں میں گھرا رہتا ہوں
ملنا چاہوں تو ملوں خود سے میں تنہا کیسے

محبوب کی محفل میں اسی کے حسن و جمال کا جادو رہتا ہے کسی دوسرے کی مجال نہیں کہ کچھ عرض کر سکے۔ اگر وہ نہ ہو تو محفل سونی سونی لگتی ہے۔ کلاسیکی شاعری کا یہ نہایت عمدہ مضمون ہے اور اس پر بے شمار بلکہ لاکھوں شعر کہے گئے ہیں اور آئندہ بھی کہے جائیں گے۔ کرشن بہاری نور کا شعر ہے۔

کہاں یہ ہوش باقی تھا کہ عرض مدعا کرتے
زباں رکھتے ہوئے محفل میں تیری بے زباں ہم تھے

محبوب کی جستجو اور طلب ہی عاشق کی معراج ہے مگر یہ منزل ملتی نہیں بلکہ جب بھی مدعا ہاتھ آتا ہے تو ہوش و حواس ہی نہیں بحال رہتے۔

جستجو میں تری یہ تماشا ہوا
ہوش جب کھو گئے مدعا مل گیا

محبوب کے بہت سے نام ہیں ان میں ایک نام کافر بھی ہے۔ یعنی وہ عاشق کی ہر خواہش کو ٹالتا رہتا ہے انکار کرتا رہتا ہے۔ دیوانے اس کے گرد چکر لگاتے رہتے تھے مگر انکار کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ کرشن بہاری نور نے اس کو بھی اس طرح نبھایا ہے کہ وہ انھیں کا حصہ کہا جا سکتا ہے۔

یوں ہی تو نہیں تجھ کو سب کہنے لگے کافر
کیا جانیے کتنوں کے ایمان گئے ہوں گے

اس طرح کے بے شمار پہلو ان کی شاعری میں ہیں۔ واضح رہے کہ غزلوں کے علاوہ قطعات اور نظمیں بھی ان کی شاعری کا حصہ ہیں۔ ان کی نعتیں ایک عجب احساس کی حامل ہیں جن پر الگ سے گفتگو کی جانی چاہیے۔ کرشن بہاری نور کو جن لوگوں نے مشاعروں میں سنا ہے اور جنھوں نے ان کو کتابوں میں پڑھا ہے دونوں اس بات کے قائل ہیں کہ ان کی شاعری میں اثر انگیزی کی ایک کیفیت ہے۔ کریم الاحسان نے اس بات کو زیادہ بہتر انداز میں لکھا ہے۔

یہ بات کم شعرا کو نصیب ہوتی ہے کہ ان کو سنا بھی جاتا ہو اور ان کے اشعار پر لگا کر سرحدوں کو پار بھی کر جاتے ہوں۔ یہی حال نور صاحب کے اشعار کا ہو رہا ہے، جب وہ مشاعرے میں آتے ہیں تو فرمائشوں کا ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان کے کلام میں جان ہے، ایک پیغام ہے۔ انفرادیت ہے۔ وہ لکھنؤ اور دلی کے روایتی گورکھ دھندوں کے پابند نظر نہیں آتے سیدھے سادے اشعار کہتے ہیں اور ان میں بلا کی کشش اور تاثیر ہوتی ہے میں نے ان کے اشعار نہ جانے کتنے لوگوں سے سنے ہیں اور یہ بات کچھ آسان نہیں ہوتی ایک مدت ایک عرصہ ایک محنت ایک ریاض کے بعد بھی کتنے ہی شعرا اس شہرت اور ہر دل عزیزی سے محروم ہی رہتے ہیں۔ (تپیاس ص 155)

اب یہاں چند اشعار کسی تبصرے کے بغیر نقل کیے جا رہے ہیں۔

نہ کوئی وعدہ تھا ان سے نہ کوئی پابندی
تمام عمر مگر ان کا انتظار کیا

یہی نہیں کہ ہمیں انتظار کرتے رہے
کبھی کبھی تو انھوں نے بھی انتظار کیا

اتنی توجہ اتنی عنایت
اب دھوکا ہونے والا ہے

ختم ہی ہے ہستی کا فسانہ
قرض ادا ہونے والا ہے

ان کو پا کر سوچتا ہوں
خواب تھا بہتر یا تعبیر

دل میں کوئی ارمان نہیں ہے
پھر بھی اطمینان نہیں ہے

فن کو سنوار دیں جو کہیں دل کی دھڑکنیں
پتھر بھی آئینوں کی طرح بولنے لگے

بظاہر ان اشعار میں ایسا کوئی بڑا مضمون نہیں باندھا گیا ہے اور نہ اس طرح سے شعر کہا ہی گیا ہے جس پر کسی بڑے رمز کا گمان ہو، لیکن ان اشعار کو پڑھتے ہوئے قاری ایک کیفیت سے ضرور گزرے گا۔ کس قدر سہل اور سادہ انداز میں شعر کہا گیا ہے۔ اور یہی سادگی ان اشعار کا حسن ہے۔

اس مختصر مطالعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کرشن بہاری نور کی شاعری ہماری شعری روایت کے گہرے شعور سے عبارت ہے۔ انھوں نے اپنے بزرگوں سے جو کچھ سیکھا تھا اسے سلیقے کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی اور ہمیشہ یہ سمجھتے رہے کہ شاعری زبان و بیان کے گہرے شعور کے بغیر ناممکن ہے۔ اسی لیے انھوں نے اس روایت سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور اساتذۂ سخن کے ساتھ ساتھ اپنے معاصرین اور احباب سے سرگرم شعری سلسلہ جاری رکھا۔ اس کا اندازہ ان کے مجموعہ کلام 'دکھ سکھ' سے ہوتا ہے۔ مجموعہ کلام کے آغاز میں 'شاہ راہِ ادب' کے نام سے ایک سفرنامہ لکھا ہے جو دراصل ان کی شعری زندگی کے ابتدائی احوال پر مشتمل ہے۔ اس سفرنامہ میں انھوں نے اپنے معاصرین کے اشعار کو کثرت سے نقل کیا ہے جو انھیں پسند تھے۔ شاعری کے لیے یہ خاص لگاؤ اور سرگرمی ہی دراصل کرشن بہاری نور کی مقبولیت اور محبوبیت کی علامت ہے۔

■

Omair Manzar
04/122 Tagore Marg, Near Shabab Market,
MANUU, Lucknow Campus, Maulana Azad
National Urdu University
Lucknow- 226020 (UP)

فروغ نقاش کا شاہکار مہابھارت

محمد اسرار

مہابھارت ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ ایک طویل جنگ ہے۔اس تاریخی واقعہ پر اردو ادب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔نظم میں بھی اور نثر میں بھی۔اس جنگ کے مختلف کرداروں کو اردو کے شاعروں نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ مثلاً کرشن، یدھشٹر، کرن، دروپدی وغیرہ۔ یہ لڑائی بھی حق و باطل کا معرکہ قرار پائی۔آخر فتح سچائی کی ہوئی اور جھوٹ ہار گیا۔اسی کہانی کو مکمل طور پر اردو شاعری میں ڈھالنے کا اہم کارنامہ انجام دیا ہے فروغ نقاش نے۔عبدالحفیظ فروغ نقاش شہر ناگپور کے ایک کلاسیک شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ترقی پسند تحریک کے عروج کے دور میں بھی ان کا رجحان اس جانب نہیں گیا۔وہ مکمل طور سے کلاسیک ہی رہے۔یہ ضرور ہے کہ ان کی شاعری میں بھی حسن و عشق کے علاوہ بہت کچھ ہے لیکن اگر جائزہ لیا جائے تو وہ ایک رومانی شاعر معلوم ہرتے ہیں۔

فروغ 1922 میں ناگپور میں پیدا ہوئے۔[1] وہ ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ناگپور میں جو مسلم خاندان مومن پورہ میں آباد ہیں۔ان میں سے اکثر کا پیشہ پارچہ بافی رہا ہے۔فروغ کے خاندان کا بھی یہی پیشہ تھا۔ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد نوجوانی کے ابتدائی زمانے میں ہی انھیں شاعری سے شغف ہوگیا۔وہ مصوری بھی کرتے تھے۔شاعری اور مصوری کے درمیان یوں بھی ایک رشتہ ہے۔اکثر شاعروں کے کلام پر مصوروں نے اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔غالب ان میں سے ایک ہیں۔فروغ نے شروع ہی سے رومانی لہجہ اختیار کیا اور آخر تک اس پر قائم رہے۔

اس بات سے فروغ کو ملک کی تاریخ رقم کرنے کا خیال دل میں آیا اور انھوں نے طویل نظم لکھنے کا ارادہ کرلیا۔اس نظم کا عنوان 'شاہنامۂ ہند' طے پایا۔اس میں ہزاروں سال کی تاریخ کو نظم کیا گیا ہے۔منظوم مہابھارت بھی اسی نظم کا ایک حصہ ہے۔

ناگپور میں ایک بہت مشہور تجارتی خاندان ہے۔بیدھ ناتھ فرم ان کی ملکیت ہے۔جو آیورویدک دواؤں کی بڑی فرم ہے۔اسی فرم کے مالکان نے شاہنامۂ ہند کے ایک حصے 'مہابھارت' کو شائع کرنے کے لیے ہونے والے اخراجات کی ذمے داری لی۔ یہ ضخیم نظم اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں 1997 میں شائع ہوئی۔دونوں رسم الخط میں شائع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اسے ہندی والے بھی پڑھ سکیں۔ اسی نظم کے شائع ہونے پر فروغ نقاش کو ملک کے کئی قلم کاروں اور سیاست دانوں نے مبارکباد کے خطوط لکھے یا ان سے مل کر انھیں مبارکباد پیش کی۔فروغ اپنی دھن میں مست رہنے والے انسان تھے۔انھوں نے کسی بھی گروپ یا گروہ سے وابستگی کا اظہار نہیں کیا۔وہ صرف اپنے فن پر توجہ رکھتے تھے۔

مہابھارت جیسی طویل نظم لکھنے کے لیے انھیں تاریخ کی کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کی ضرورت پڑی۔انھوں نے کئی کتابوں سے استفادہ کیا۔ان کی کوشش رہی کہ تمام واقعات کو تسلسل کے ساتھ پیش کریں۔اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے فروغ کے اس شاہکار کے متعلق لکھا ہے۔

''اب تک جو حصے مکمل ہو چکے ہیں ان میں اشعار کی مجموعی تعداد سات ہزار ہے۔ پہلا حصہ مہابھارت کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

عرض مصنف کے عنوان سے فروغ لکھتے ہیں

''شاہنامہ چالیس سال سے شاہنامۂ ہند کے نام سے قومی یک جہتی کے نقطۂ نگاہ سے لکھا جا رہا ہے جس میں جین دھرم، بدھ دھرم اور سناتن دھرم کے ساتھ ساتھ اسلام دھرم کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔اب تک اس کی سات جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔جن میں بیس ہزار اشعار مغل بادشاہ شاہجہاں تک لکھے جا چکے ہیں۔اس کا پہلا حصہ اردو مہابھارت ہے جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔میرے نزدیک اس کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ قدیم ہندوستان تہذیب وتمدن اور سناتن دھرم کی یہی داستان آئینہ دار ہے۔جس کو میں نے ہندی اور سنسکرت کے مشہور عالم پنڈت جواہر پرساد مشرا مرادآبادی کی مہابھارت بھاشا سے بڑی جانفشانی اور پوری دیانتداری سے نظم کیا ہے۔اس داستان کو ہند کی بڑی اکثریت پورے یقین اور دل کی گہرائیوں سے ساتھ سچ سمجھتی ہے۔تو مجھے یا کسی اور کو اسے فرضی داستان کہنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔''[2]

اس نظم میں فروغ نے واقعی شاعری کا حق ادا کیا ہے۔نہایت رواں اور آسان لفظوں کو برتا ہے۔کوئی بھی اس نظم کو بلا تکلیف پڑھ سکتا ہے۔اس میں ایک طرح کی نغمگی ہے۔پوری نظم میں مختلف عنوانات کے تحت واقعات نظم کیے گئے ہیں۔یدھشٹر کی گرفتاری کا منصوبہ کے عنوان سے لکھا ہے۔

اسی شب میں درونہ اور دریودھن نے اک ایسا
بنایا مل کے منصوبہ یدھشٹر کو پکڑنے کا
شریک مشورہ تھے ان میں کچھ ابلیس کے چیلے
فساد و فسق کے پیکر شکونی جیدرت جیسے
علاوہ اس کے ارجن کے لیے سوچی گئیں گھاتیں
محاذ جنگ سے اسکو ہٹانے کی ہوئیں باتیں
اس میں چکرویو کا مسئلہ بھی سامنے آیا
درونہ نے بڑی تفصیل سے اس فن کو سمجھایا
یہ ایک منصوبۂ سازش تھا جس کا مقصد حاصل
فقط یہ تھا نہ پانڈو رہ سکیں اب جنگ کے قابل
یدھشٹر چونکہ اپنے بھائیوں میں سب سے سربر ہے
متانت اور ذہانت میں بھی افضل اور برتر ہے

اسی اک وجہ سے ہے پانڈووں میں جوش اور ہمت
یہ ان کا عزم و پامردی یہ استقلال یہ جرأت
یدھشٹر کی گرفتاری سے جرأت آزمائی کا
اتر جائے گا نشہ پانڈووں کی خودستائی کا
یہ ایسی ضرب ہوگی تاب جس کی لا نہیں سکتے
وجے پانڈو ہمارے سامنے پھر پا نہیں سکتے
بالآخر مشورہ کے بعد کورووں سو گئے جا کر
عمل پیرا انھیں ہونا تھا کل میداں میں سازش پر [3]

اس طرح کی روانی اور تسلسل مکمل نظم میں موجود ہے۔ فروغ نے مہابھارت کے ہر چھوٹے بڑے کردار کو شامل کیا ہے۔ جہاں جہاں انھیں محسوس ہوا کہ زیادہ تفصیل سے بیان کرنا چاہیے وہاں انھوں نے تفصیل سے بھی کام لیا ہے۔ ضرورت کے مطابق فٹ نوٹ بھی لکھا ہے۔ ہندی رسم الخط میں یہ خیال رکھا کہ اگر کوئی مشکل لفظ ہے تو حاشیے میں اس کے معنی لکھ دیے ہیں۔ تاکہ ہندی میں پڑھنے والوں کو آسانی ہو جائے۔ اس جنگ کے ایک اہم کردار کرن کا شاعر نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ کرن کی خواہش کہ اسے ایسی جگہ جلایا جائے جہاں ابھی تک کسی کی بھی آخری رسم ادا نہ کی گئی ہو اس خواہش کو کرشن نے یوں پورا کیا کہ اپنی ہتھیلی پر کرن کی لاش کی آخری رسوم انجام دی۔ کرن کو مہابھارت کی تاریخ میں نہایت ہی اہم حیثیت حاصل ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ صرف دوستی نبھانے کی خاطر کورووں کے ساتھ تھے۔ یہ نظم فروغ کی شاعرانہ قدرت کا نمونہ ہے۔ افسوس کہ اس کتاب کو خاطر خواہ قبول عام حاصل نہیں ہوا۔ یہ کتاب ہندوستانی تہذیب اور قومی یک جہتی کی ایک مثال ہے۔

فروغ کو ادبی حلقوں میں وہ پذیرائی نہیں ملی، جس کے وہ مستحق تھے۔ اتنا بڑا کام کرنے کے باوجود مخصوص لوگوں تک محدود رہ گئے۔ اس کی وجہ شاید یہی رہی کہ وہ کسی خاص ادبی گروہ سے وابستہ نہیں تھے۔ اخبارات اور رسائل میں بھی وہ بہت شائع نہیں ہوئے۔ خود انھوں نے بھی اپنی تخلیقات کو شائع کروانے کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ حالانکہ ان کے بہی خواہوں نے انھیں کئی بار یہ مشورہ دیا کہ ان رسائل کو غزلیں اور نظمیں اشاعت کے لیے دیں جو کچھ معاوضہ دیتے ہیں یا نذرانہ دیتے ہیں۔ یہاں فروغ کی لاابالی طبیعت آڑے آجاتی اور وہ باتوں کو ٹال دیتے۔ کچھ ارباب اقتدار ایسے تھے جو ان سے ملاقات کی غرض سے آئے اور کسی بہانے ان کی مالی امداد کرنا چاہتے لیکن ان کی غیور طبیعت یہ گوارہ نہیں کرتی۔ فروغ تجارت کرتے تھے اور اس سے گزر بسر ہوتی تھی۔ ان کے تمام بچے صاحب روزگار ہیں۔

فروغ کی غزلیں بھی نہایت اعلیٰ معیار کی ہیں۔ غزلوں میں ان کا رجحان حسن و عشق کی جانب صاف معلوم ہوتا ہے۔ ان کے قلمی مخطوطہ میں جو غزلیں ہیں ان سے چند مثالیں پیش ہیں۔

مری عاشقی کے چرچے تجھے اب نہ ہوں گوارا
مرے عشق نے ہی ورنہ ترے حسن کو سنوارا
تری برق سے یہ سازش مرے آشیاں کی خاطر
تجھے ہاتھ تاپنا ہے میں سمجھ گیا اشارا
شب غم فروغ اپنی اسی کشمکش میں گزری
کبھی دل نے ہم کو مارا کبھی ہم نے دل کو مارا [4]

کلاسیکی شعرا کی غزلوں کا یہی انداز رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ فروغ کی نوجوانی کے عالم میں ناگپور میں کوئی ادبی تحریک یا رجحان نہیں تھا۔ ایسا بالکل نہیں۔ یہاں ترقی پسند تحریک کی پیروی بھی کی گئی۔ شاطر حکیمی اس کی مثال ہیں۔ جدید تحریک تو یہاں کے شاعروں اور ادیبوں کے لیے خوش آئند ثابت ہوئی۔ بیشتر شعرا و ادبا اس تحریک سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ اس رجحان کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ سید یونس، ضیا انصاری، شاہد کبیر، شریف احمد شریف، مدحت الاختر وغیرہ اس تحریک کے یہاں نمائندہ شاعر رہے۔ لیکن فروغ نقاش مزا جاً ہی کلاسیکی تھے۔ وہ ان تمام تحریکوں سے قطعی متاثر نہیں ہوئے۔ ہاں وطن پرستی کا عنصر ان کے کلام میں اکثر ملتا ہے۔ یہ ان کی نظموں میں ایک اہم خیال کے طور پر نظر آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام اردو شاعروں کی طرح ان کے دل میں بھی وطن سے بے پناہ محبت تھی۔

فروغ کی نظم مہابھارت زبان و بیان پر ان کی مہارت کا زندہ ثبوت ہے۔ دل نشیں انداز اور سلاست و روانی اس طویل نظم کی اہم خوبیوں میں سے ایک ہیں۔ مہابھارت کی تاریخ میں لکھا ہے کہ جب دوروپدی کو دربار میں بلایا جا رہا تھا تو انھوں نے سختی سے انکار کیا اور بھرے دربار میں جانے کو اپنی بے عزتی خیال کیا۔ اس بات کو فروغ نے یوں نظم کیا ہے۔

یہ باتیں سن کے پنچالی یہ بولی خیر کچھ بھی ہو
مگر میری طرف سے بھیشم سے تم جا کے یہ پوچھو
جہاں موجود ہوں اک بھیشم جیسے مرد فولادی
ہوا کرتی ہو جس نے خود گرو کی اپنی استادی
اب ان کے سامنے کیا لاج اک ابلا کی جائے گی
اور اس کے بعد بھی مطلق نہ غیرت ان کو آئے گی
علاوہ اس کے ان سے یہ بھی کہنا نیر تاباں
بجائے شرق، نکلے غرب سے باصد جلال و شاں
جو متھا دھرم ست بولے تو کہنا یہ بھی ہے ممکن
ڈھلے پاتک، نہ گنگا سے تو کہنا یہ بھی ہے ممکن

مگر پنچال کی دختر نہ اس محفل میں جائے گی
جبیں پر بے حیائی کا نہ ٹیکہ وہ لگائے گی [5]

فروغ نے بلا تکلف ہندی زبان کے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ یہ ہونا بھی تھا کیونکہ کہانی ہندوستان کے پس منظر کی ہے لہٰذا ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال بالکل جائز ٹھہرتا ہے۔ یہ تمام الفاظ قطعی غیر ضروری یا ٹھونسے ہوئے نہیں لگتے۔ اگر ایسا ہوتا تو روانی میں کمی آجاتی اور کہیں نہ کہیں سکتہ ضرور ہوتا۔ ایسا کچھ نہیں ہے بلکہ نظم بلا تکلف پڑھی جا سکتی ہے۔ ان باتوں سے شاعر کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ غزلوں میں بھی وہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ رواں الفاظ ہوں اور آسان بحر ہو تاکہ قاری کو آسانی ہو۔ ایک غزل کے تین اشعار پر غور کیجیے۔

یوں رخ تاباں پہ ان کے زلف لہرائی کہ بس
چاند چھپ کر رہ گیا ایسا گھٹا چھائی کہ بس
آئینے میں لے رہے تھے، اف وہ انگڑائی کہ بس
خود کو دیکھا، دیکھتے ہی، ایسی شرم آئی کہ بس
ایک اشارے پر تمھارے مثل پروانہ فروغ
جان دے دیتا ہے وہ، ہے ایسا شیدائی کہ بس [6]

فروغ خوب مطالعہ کرتے تھے۔ یہ عادت آخر عمر تک رہی۔ ریڈیو سننا اور پڑھنا یہ ان کی خاص عادت تھی۔ آخر میں جب آنکھیں کمزور ہو گئیں اور خود سے پڑھنے کے قابل نہیں رہے تو کسی کو کہتے تھے کہ پڑھ کر سنا دے۔ محدب عدسہ کا بھی استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے قلم سے جو کچھ لکھا وہ بڑے حرفوں میں ہے۔ ان کی شدید خواہش کے باوجود شاہنامے کے تمام حصے شائع نہیں ہو سکے اس بات کا رنج انھیں ہر حال میں رہا۔

بہر حال اتنی عظیم کتاب کا شاعر کی زندگی میں شائع ہونا ہی اہم ہے۔ فروغ نقاش کا انتقال 2002 میں ہوا۔ تب سے اب تک بقیہ حصے اشاعت کے انتظار میں ہیں۔

حواشی

1. ناگپور میں اردو: ڈاکٹر شرف الدین ساحل، 1993، ص 140
2. ہندی اردو مہابھارت، مہابھارت سے متعلق: فروغ نقاش
4. ایضاً، ص، 186
5. قلمی مخطوطہ: فروغ نقاش
6. ہندی اردو مہابھارت: فروغ نقاش، ص 131
7. قلمی مخطوطہ: فروغ نقاش

■

Mohammad Asrar
Assistant Professor, Urdu Department
S.K. Prowal College of Art, Science & Commerce, Kamptee,
Dist. Nagpur- (Maharashtra)
Mob.9822724276
Email : asrarmohammad1977@gmail.com

گلزار دہلوی

کا شعری انفراد

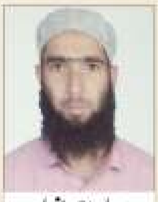

سجاد احمد نجار

پنڈت آنند کمار زتشی جو اردو دنیا، خاص کر اردو شعرو ادب، میں گلزار دہلوی کے قلمی نام سے معروف تھے 12 جون بہ روز جمعہ 94 سال کی طویل عمر پا کر ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ گلزار دہلوی کشمیری برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی ولادت دہلی میں 1926 میں ہوئی۔ گلزار دہلوی کے والد پنڈت تربھون ناتھ 'زتشی زار دہلوی' کے بارے میں یہ بات کتابوں میں درج ہے کہ وہ داغ دہلوی کے پہلے شاگرد رہے ہیں۔ اسی طرح ان کی والدہ اور ماموں بھی شعرو شاعری سے لگاؤ رکھتے تھے۔ جن کا خاندان شعرو شاعری کے رنگ میں ابتدا ہی سے رنگا ہوا ہو ایسے میں اس خاندان کی نئی نسل کیسے اپنے آپ کو شعر و شاعری سے دور رکھ سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ گلزار دہلوی کی زندگی اردو شعرو ادب کے لیے وقف ہوئی تھی اور اس کا ثبوت انھوں نے تادمِ مرگ دیا۔ گلزار دہلوی کی زندگی کی کہانی میں طرح طرح کے رنگ سمائے ہوئے ہیں۔ بچپن ہی سے محبِ وطن ثابت ہوئے اور وطن کے لیے نظمیں کہنے لگے۔

گلزار دہلوی نے شعر گوئی کا سفر 1933 کے آس پاس سے شروع کیا۔ شاعری میں انھیں پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی، نواب سراج الدین خان اور پنڈت امرناتھ مدن ساحر وغیرہ کی شاگردی کا شرف نصیب ہوا۔ انھوں نے اردو شاعری کو اس انداز سے برتا کہ ان کی شاعری گنگا جمنی تہذیب کی نمائندہ بن گئی۔ گلزار کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر کا ایک خوب صورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ حقیقتاً اردو شعر و ادب کے ایسے آخری بزرگ تھے جن کے یہاں تہذیبی تجربوں کے عمدہ نمونے جابجا نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مشترکہ تہذیب کے حسن و جمال اور خوبیوں کے اظہار کو ایک خاص مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ ان کے یہاں امن و شانتی، بھائی چارہ اور مساوات کا عمدہ میلان پایا جاتا ہے۔ وہ ہر ایک مذہب کی ناموس کا خاص خیال رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جب وہ عالمی امن کی بات کرتے ہیں تو تمام مذاہب کے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

خوابِ غفلت سے جوانوں کو جگانے کے لیے
جنگ کے فتنہ کو دنیا سے مٹانے کے لیے
حامیانِ امن کی اس بزمِ رنگا رنگ سے
ہر عدوئے امن کو آیا ہوں میں للکارنے

مذکورہ اشعار گلزار دہلوی کی ایک طویل نظم 'نغمۂ انسانیت' میں شامل ہیں۔ اس نظم میں وہ خدا، پیغمبر، اوتار، عیسیٰ، موسیٰ، قرآن، محمد صلعم، وید گیتا، رام، رحمان کے بعد باقی عظیم ہستیوں جیسے سوامی وِیر، گرو نانک، گاندھی وغیرہ کی قسمیں دے کر اتحاد و اتفاق کی بات کچھ اس طرح سے کرتے ہیں۔

دہر کو پھر جنگ کے شعلوں پہ گرنے سے بچاؤ
اب سفینہ آدمیت کا کنارے سے لگاؤ
متفق ہو جاؤ دنیا کو جگانے کے لیے
دہر میں امن و اماں کے گیت گانے کے لیے
جب کبھی یہ نغمہ انسانیت کا گاتا ہوں میں
ہر عدوئے امن کو گلزار شرماتا ہوں میں

ان کے یہاں ماضی کے تہذیبی اور ثقافتی نقوش کی جو تصویریں ملتی ہیں ان کی مثال لا مثال ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دہلی کی ٹھیٹھ اردو ان پر آ کے رکتی ہے۔ ان کے منفرد انداز اور فصاحت کے یہ نمونے دیکھیے۔

تہذیب اور تمدن ایمان اور عقیدت
قائم رہے گا سب کا امن و اماں رہے گا
یہ وہ گلزارِ ہستی ہے یہاں دریا تو ملتے ہیں
دلوں کی موج کا لیکن کہیں سنگم نہیں ملتا
ایک ہی نغمہ اذاں کا زمزمہ ناقوس کا
سرد مہری کی فضا میں گرمیاں پیدا کریں

گنگا جمنی تہذیب کے آخری سفیر تھے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے گفتار و کردار کے ساتھ ساتھ اپنے کلام کے ذریعے بھی قومی اتحاد اور بھائی چارے کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب کی بقا اور اس کے فروغ کی نمائندگی میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ کلیاتِ گلزار دہلوی میں ایسی بھی نظمیں ہیں جن میں عید، ہولی، دیپاولی، شب قدر، رمضان المبارک اور ہندوستانی موسموں کو اپنے خوب صورت اور دلکش اسلوب میں پیش کر کے اپنی انفرادی شان کا منہ بولتا ثبوت پیش کیا ہے۔ گلزار دہلوی کی شاعری میں حیدرآباد، لکھنؤ، علی گڑھ اور کشمیر وغیرہ جیسی جگہوں کی بھی عکاسی کی ہے۔ ان جگہوں کی تعریف میں یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

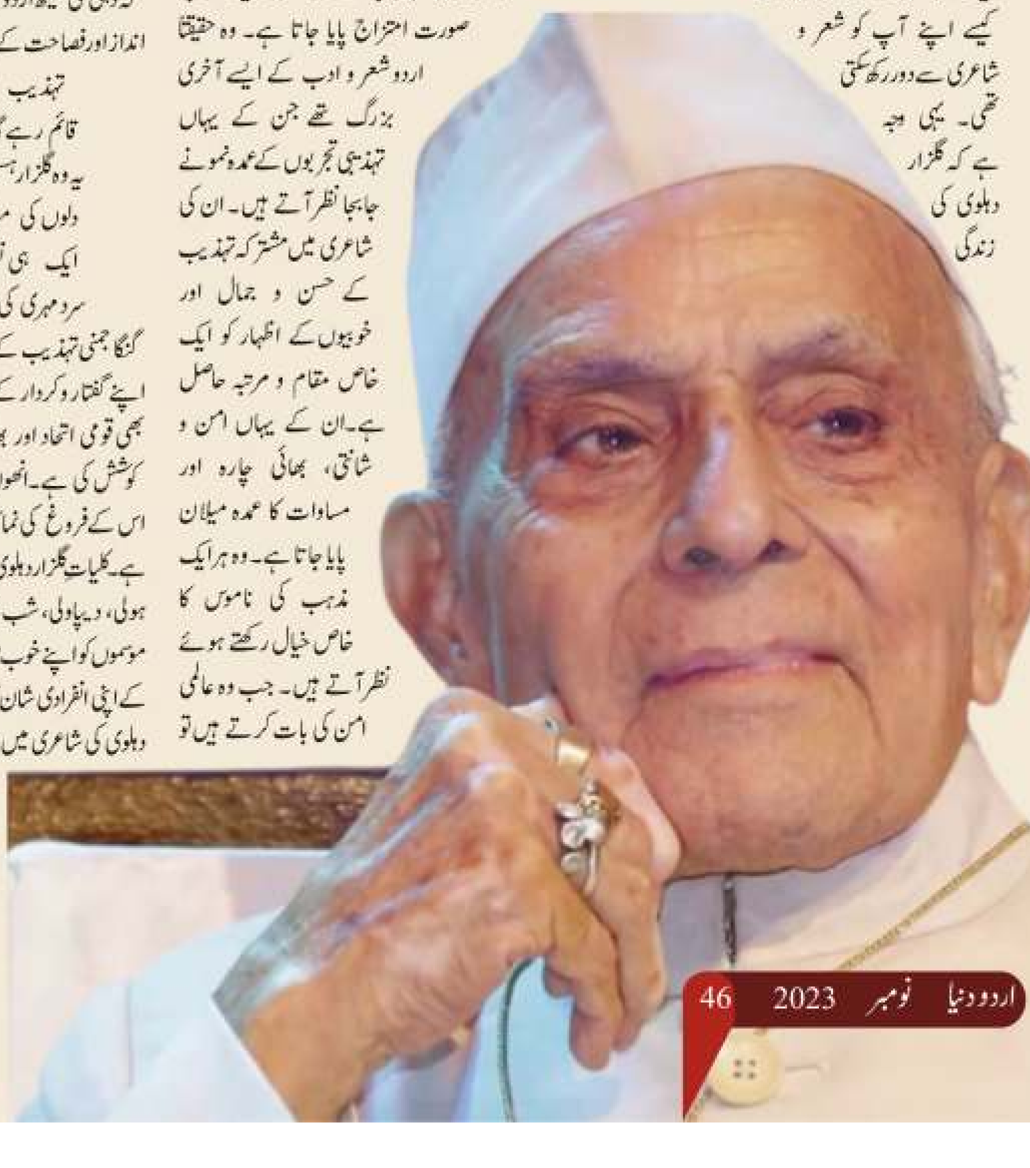

چشمِ نرگس کی طرح وہ عشق کا بیمار ہے
ہاں علی گڑھ دہر میں تہذیب کا گلزار ہے
دہر میں دائم رہیں اللہ اس کے رنگ و بو
لکھنؤ والو مبارک تم کو جشن لکھنؤ
چپہ چپہ گلشن کشمیر کا رنگین ہے
کان قدرت کا یہ لعل بے بہا رنگین ہے

گلزار دہلوی نے غزل، نظم، نعت، منقبت، رباعی اور قطعہ وغیرہ میں طبع آزمائی کر کے اپنے کمالات کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔ ان تمام شعری اصناف میں انھوں نے ایسے تجربے پیش کیے ہیں جو ان کی انفرادیت قائم رکھنے میں معاون ثابت ہوئے۔ گلزار ایک خاص لب و لہجے اور اندازِ فکر کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں جمالیات، فطرت کائنات، حب الوطنی، قومی یکجہتی، مذہبی مساوات، سیکولرازم، عشق و عاشقی، عصری حسیت، وغیرہ جیسے مضامین کا انوکھا اظہار ملتا ہے۔

گلزار دہلوی نے اردو غزل اور نظم میں جہاں ایک طرف اپنے احساسات و جذبات کا بے ساختہ اظہار کیا ہے وہیں دوسری جانب انھوں نے حمد، نعت، منقبت و مناجات کے علاوہ دوسرے مذاہب کی خوبیوں کو بھی پیش کر کے ہندستانی تہذیب کو پیش کیا ہے۔ کلیاتِ گلزار دہلوی میں قطعات و رباعیات بھی شامل ہیں اور ان کے موضوعات بھی وہی ہیں جو ان کی باقی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ یعنی ان کی رباعیات اور ان کے قطعات میں مذہبی، اصلاحی، جمالیاتی، سماجی، سیاسی، تہذیبی، ملی، اور اس طرح کے دوسرے جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ موصوف اردو کی شان اور اس کی عظمت کو کچھ اس طرح سے پیش کرتے ہیں۔

ادیان کے سنگم کا نشاں ہے اردو
یکجہتی عالم کی زباں ہے اردو
شائستہ تہذیب جو مرکز تھا کبھی
اس دلی مرحوم کی جاں ہے اردو

گلزار دہلوی کو امیر خسرو کی ذات وصفات اور ان کی شعری کائنات کے ساتھ ایک خاص لگاؤ تھا۔ وہ امر خسرو کے کلام کو حدیثِ خسرو کے عنوان سے پیش کرتے ہیں اور اس کی وضاحت تفسیرِ گلزار کے عنوان سے پیش کرتے ہیں۔ امیر خسرو کے علاوہ گلزار دہلوی کو حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ساتھ بھی گہری عقیدت تھی۔ اسی عقیدت کی وجہ سے وہ اپنے نام کے ساتھ نظامی و خسروی کا استعمال کیا کرتے تھے۔ گلزار دہلوی کے مراسم اردو کے بلند پایہ شعرا اور ادبا کے ساتھ ہے۔ ان فن کاروں میں قاضی عبدالغفار، خواجہ حسن نظامی، چکبست، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور ڈاکٹر جمیل جالبی وغیرہ شامل ہیں ان تمام ادبی شخصیات نے گلزار دہلوی کی شعری عظمتوں کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور بھی گلزار دہلوی کی انفرادیت کے قائل ہیں۔ وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں تو آپ کی ادب دوستی، ذہانت، شاعری اور فن تقریر کا 1946 جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی کے دور ہی سے قائل ہوں۔ آپ ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر ہی نہیں بلکہ اردو کے محسن ہیں۔ آپ اردو کے ممتاز اہل زبان کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے یہ فن آپ کا خاندانی ہے۔ علامہ زار زتشی دہلوی یادگار داغ اور نواب سائل نے آپ کی تربیت کی ہے۔ گلزار دہلوی بجا طور پر ان کے جانشین کہلانے کے حقدار ہیں۔''

(گلزار غزل، گلزار دہلوی، مکتبہ الیوم دہلی، 2000، ص،3)

گلزار دہلوی صحیح معنوں میں اردو شعروادب کے ایسے سالار تھے جنھوں نے تادمِ مرگ اس زبان کے ادب کا ساتھ دیوانہ وار نبھایا۔ گلزار دہلوی کی انتھک کوششوں کے صلے میں دلی سے کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ حکومتِ ہند نے سائنس کو عام فہم اور آسان بنانے کے ضمن میں ان کی ادارت میں ''سائنس کی دنیا'' کے نام سے ایک سہ ماہی مجلہ شائع کیا۔ یہ رسالہ برصغیر ہندو پاک کا واحد ایسا رسالہ تھا کہ جو کسی اردو شاعر کی نگرانی میں نکلتا تھا۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ گلزار ایک منجھے ہوئے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے ادیب، صحافی اور سائنس کے پاس دار بھی تھے۔

وہ اردو کے ایک سچے عاشق تھے۔ انھیں اس زبان سے بے پناہ محبت تھی اس کا اظہار ان کی اس رباعی سے خوب ہوتا ہے۔

دنیا میں تو اونچا ہے کلامِ اردو
عقبیٰ میں بھی اونچا ہے نامِ اردو
جب حشر میں ہو نام شماری آقا
منظور کہ کہلاؤں غلامِ اردو

میر مشتاق نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ گلزار کو 'علامہ اور بابائے سائنسی صحافت' کا مقام حاصل ہے۔ وہ انھیں دلی کی اور اردو کی آبرو بھی سمجھتے ہیں۔ تابش دہلوی انھیں 'نادر الوجودِ چمنستان' سے تعبیر کرتے ہیں۔ مولانا عتیق الرحمان عثمانی انھیں 'اردو اور اردو والوں کی امانت' قرار دیتے ہیں۔ مولانا احمد سعید اسیر دہلوی ان کو 'اردو کے شیدائی اور ادب کے فدائی' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ مولانا حفیظ الرحمن نے انھیں 'اردو کا مرد، مجاہد' کہا ہے۔ خواجہ نظامی ان کو 'چکبستِ ثانی' سے یاد کرتے ہیں۔ اس طرح کئی ایسی شخصیات ہیں جنھوں نے گلزار دہلوی کی اردو ادبی خدمات کے اعتراف میں لب کشائی کر کے انھیں خراج پیش کیا ہے۔ آفتاب عالم نائب ایڈیٹر روزنامہ ہندی ''نربھے پتھک'' گلزار کی شان میں کہتے ہیں:

''...اے مجاہد اردو تیری کیا تعریف کروں، سچ سچ ہم نے سپنے میں بھی کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک کشمیری پنڈت بےلوث بےغرض طور سے اردو زبان کو زندہ رکھنے اور اس کی ترقی کے لیے اتنا کام کرسکتا ہے جتنا کہ پنڈت آنند موہن زتشی گلزار نظامی دہلوی نے اپنی ذات سے اکیلے ہی کیا... گلزار دہلوی اردو کے درخت ہیں جو سوکھ تو سکتے ہیں لیکن کبھی مرجھا نہیں سکتے۔ مختصراً اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنے آپ میں اردو کی ایک انجمن ہیں تو کوئی غلط نہیں ہوگا۔''

(گلزار دہلوی، گلزار غزل، مکتبہ الیوم دہلی، 2000، ص، 39،40)

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو گلزار دہلوی ہر لحاظ سے منفرد رہے ہیں۔ ان کی صلاحیتیں اور ان کی کوششیں نہ صرف ملک وقوم کے لیے فیض رساں ہیں بلکہ وہ آنے والی نسل کے لیے راہِ عمل بھی ہیں۔ گلزار دہلوی کو اردو زبان و ادب کے ساتھ ایک عجیب تعلق تھا۔ وہ ہمیشہ اسی زبان کے گیت گاتے رہے اور ہمیشہ اس کے فروغ کے لیے منہمک رہے۔

آپ اردو سے اس قدر دیوانہ وار محبت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اس کے لیے ہر پل بےتاب نظر آتے ہیں۔ اردو کی شان میں جتنے اشعار گلزار دہلوی نے کہے ہیں، شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے اتنے اشعار پیش کیے ہوں۔ آپ انسانیت کے محبّ، قوم کے سپاہی، تہذیب وتمدن کے وارث، مذہبی رواداری کے عاشق اور اردو شعر و ادب کے شیدائی کے طور پر ادبی اور غیر ادبی حلقوں میں مشہور ہیں۔ گلزار نے اردو شعر و ادب میں ایسی چھاپ چھوڑی ہے جس کو ہمیشہ اردو شعروادب کی تاریخ میں رقم کیا جائے گا۔ انھوں نے کیا خوب کہا ہے؟

میں وہ ہندو ہوں کہ نازاں ہیں مسلمان جس پہ
دل میں کعبہ ہے مرے دل ہے صنم خانوں میں
جوش کا قول ہے اور اپنا عقیدہ گلزار
ہم سا کافر نہ اٹھا کوئی مسلمانوں میں

■

Sajad Ahmad Najar
R/O Azad Colony Washbugh
Pulwama-192301 (J&K)
Mob.: 9858667464

ام عمارہ ضیا

کرناٹک کی ادبی صحافت کا اجمالی جائزہ

کرناٹک کی ادبی صحافت کئی اعتبار سے ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔ روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں کے علاوہ ریاست کرناٹک اردو رسائل وجرائد کی بھی متنوع وروشن تاریخ رکھتی ہے۔ یہاں ان چند نمائندہ رسائل کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے جن رسائل نے ادبی فکر کی توسیع کے ساتھ سنجیدہ صحافت کو ارتقا بخشنے کی کوشش کی ہے۔

اس سلسلے میں پندرہ روزہ رسالہ 'محافظ بنگلور' کو نقش اول کا درجہ حاصل ہے عبدالمجیب کی زیر ادارت 1875 میں اس کا اجرا عمل میں آیا۔ محمد عبدالمجیب نے رسالہ 'محافظ' جاری کر کے کرناٹک میں اردو رسائل کی بنیاد ڈالی۔ یوں تو یہ آٹھ صفحات پر مشتمل اخباری صورت میں شائع ہوتا تھا لیکن مشمولات، ترتیب وتزئین اور تنوع کے اعتبار سے اس میں ایک رسالے کی تمام خوبیاں یکجا ہو گئی تھیں۔ جاذب نظر کتابت اور طباعت سے مزین 'محافظ' میں مضامین کے علاوہ مبسوط، مدلل اداریے کی اشاعت کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ اس زمانے میں اس رسالے کی مقبولیت کا یہ عالم رہا کہ اس کی تقلید میں اہم رسائل منظر عام پر آئے۔

عبدالحفیظ آرام کی زیر ادارت شائع ہونے والا عورتوں سے متعلق ماہنامہ 'ترغیب' بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ چونکہ عبدالحفیظ آرام ایک ممتاز عالم تھے لہٰذا اصلاح نسواں سے خاصی شغف رکھنے کے باعث خواتین میں سماجی، تعلیمی اور اخلاقی شعور پیدا کرنا چاہتے تھے اور اسی مقصد کی تکمیل کے لیے 'ترغیب' کا اجرا عمل میں آیا تھا۔

19 ویں صدی کی آخری دہائی کی ابتدا کے ساتھ بنگلور اور میسور کو ادبی محفلوں اور شعروسخن کے اہم مراکز کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی، لکھنؤ اور دلی کی طرح یہاں بھی طرحی مشاعروں کا رواج عام ہوا۔ اس زمانے کے رسائل واخبارات نے عوام میں اپنی جگہ بنانی شروع کی اور ادبی ذوق رکھنے والوں کے شعری ذوق کو پروان چڑھایا۔ جب یہ رسائل عوام کے ادبی ذوق کی آبیاری میں مصروف تھے اسی وقت بنگلور سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر عبدالحق تحقیق نے ایک گلدستے کی اشاعت کو ضروری محسوس کیا اور پھر ماہنامہ 'شمع سخن' کی صورت میں اس کمی کو پورا کیا۔ اسے کرناٹک کے اولین گلدستے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے ابتدائی صفحات پر جنوبی ہند کے ممتاز شعرا کی غزلیں اور طرحی مشاعروں کی تفصیلات پیش کی جاتیں، جب کہ دیگر صفحات منتخبہ کلام کے لیے وقف ہوتے تھے۔ یہ کلام ملک کے مختلف حصوں سے شائع ہونے والے گلدستوں سے نقل کیے جاتے تھے، جن کا مقصد قارئین کے علم میں اضافہ کرنا تھا۔ تاکہ قارئین مقامی شعرا کے کلام سے محظوظ ہونے کے ساتھ ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے تعلق رکھنے والے مقتدر شعرا کے کلام سے بھی فیض یاب ہوں۔

اس درمیان شعروادب سے متعلق رسائل کی اشاعت نے بعد میں منظر عام پر آنے والے رسائل کی راہ ہموار کی۔ مختلف موضوعات پر رسائل وجرائد کی اشاعت میں تیزی آئی اور ادبی فنون کے علاوہ علمی، مذہبی، اخلاقی، اصلاحی وسیاسی غرض مختلف نوعیت کے رسائل ملک کے گوشے گوشے سے شائع ہونے لگے، اور ایسے رسائل بھی منظر عام پر آئے جنھوں نے نئے لکھنے والوں کی راہ ہموار کی اور انھیں ایک پلیٹ فارم مہیا کیا جس سے ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی جو اپنے علمی وادبی وتحقیقی کاموں کے ساتھ اردو دنیا میں ادیب وشاعر کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔

اس ضمن میں ماہنامہ 'صبح بہار' کا نام خصوصیت کا حامل ہے۔ یہ رسالہ مشاہیر شعرا وادبا کی تخلیقات سے مزین ہوتا تھا۔ یہ خالص علمی وادبی نوعیت کا رسالہ تھا جو محمد علی آزاد کی نگرانی میں مئی 1906 میں بنگلور سے نکلنا شروع

ہوا۔ صبح بہار کے مشمولات کی انفرادیت، تنوع اور حسن ترتیب کے باعث اسے مقبول عام رسالہ بننے میں وقت نہیں لگا اور جلد ہی وہ اہل قلم بھی اس کا حصہ بنے اور اپنا قلمی تعاون پیش کیا جن کی تحریریں ادب کا گراں قدر حصہ سمجھی جاتی ہیں۔ جہاں ایک طرف مولوی محمد باقر، مولوی فاروق احمد، شمس اللہ قادری، عبدالحلیم شرر، حامد حسین قادری، رشید احمد صدیقی، مولوی سید علی بلگرامی، صفدر مرزا پوری، سید محی الدین اورنگ آبادی وغیرہ مستقل قلمی معاونین میں شامل رہے، وہیں دوسری طرف شعرا میں اختر مینائی، تلوک چند محروم، جلیل مانک پوری، شاد میرٹھی، افسر میرٹھی، جگر لکھنوی، محشر لکھنوی، نشتر لکھنوی، مضطر خیرآبادی، توفیق حیدرآبادی، حباب میسوری وغیرہ نے شعری ایوان کو سجایا اور حصہ نظم کو معیار و اعتبار بخشا۔

اسی زمانے میں بنگلور سے مزید دو ماہنامے جاری ہوئے۔ پہلا ماہنامہ ستارہ میسور (بنگلور) جس کے مدیر محمد سلیمان پرواز تھے اور دوسرا ماہنامہ کوثر (بنگلور) مدیر محمود خان محمود (مارشن) وغیرہ بنگلور کے رسائل و جرائد میں ایک اہم اضافہ ہیں، جو اپنی متنوع خصوصیات کی بنا پر قارئین کے حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے۔

اس طرح خالص علمی و ادبی رسائل کی روایت جو ماہنامہ 'صبح بہار' سے شروع ہوئی تھی، ماہنامہ 'فانوس' نے اسے جلا بخشی، اگست 1940 میں شہر بنگلور سے اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ مدیر ابوالفضا عزیز بنگلوری اور مدیر خصوصی فرید انصاری بھوپالی تھے۔ عزیز بنگلوری جو خود ایک صاحب طرز انشا پرداز اور اخبار نویسی کے ماہر تھے، ساتھ ہی ذوق شعری کا رچا ہوا شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی خلاقانہ صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے نہایت وقیع اداریے کے ساتھ رسالے کی ترتیب و تزئین میں جدت پیدا کی۔ بالخصوص 'فانوس خیال' کے عنوان سے تحریر کیے جانے والے وقیع اداریے، عزیز بنگلوری کی اعلیٰ مدیرانہ و صحافتی صلاحیتوں کا مظہر ہیں تقریباً ہر شمارے میں اہتمام سے لکھے گئے اداریوں میں ہم عصر مسائل پر گفتگو ہوتی اور نہایت ہی دانشورانہ اور مفکرانہ انداز میں ان کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں شعر و ادب کے مسائل کو بھی اپنے اداریوں میں جگہ دی۔ ان صفحات میں وہ موجودہ ادبی مسائل بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ دیگر مشمولات میں افسانوی ادب کے تحت مشاہیر افسانہ نگاروں کے افسانے شامل ہوتے، اور ایک گوشہ تراجم کے لیے مختص ہوتا جہاں دوسری زبانوں کے مقبول عام افسانوں کے تراجم پیش کیے جاتے۔ مثلاً جلد 1 شمارہ 6 جنوری 1941 میں بنگلہ زبان کے معروف ادیب رابندر ناتھ ٹیگور کے افسانے 'بینائی' کا اردو ترجمہ رسالے کی زینت بنا۔ اردو تراجم کے علاوہ اس رسالے میں ایک مستقل شعری کالم بھی ہوا کرتا تھا۔ جسے 'اصلاح سخن' نام دیا گیا۔ اس کالم میں مختلف شعرا کے کلام پر صحت مند گفتگو ہوتی اور کلام میں موجود محاسن و معائب کا پتہ لگانے کی کوشش کی جاتی، ساتھ ہی 'نقد و نظر' کے کالم میں نئی کتابوں پر تبصرے کیے جاتے تھے۔ مجموعی اعتبار سے 'فانوس ادب' نے ایک عرصے تک قارئین کو عصری ادب سے آگاہ کرنے کے علاوہ مختلف سیاسی، سماجی و معاشرتی حالات سے باخبر رکھا۔ نیز عام معلوماتی مضامین کے ذریعے تجزیہ اور تشریح و توضیح پیش کی۔ قارئین کی رہنمائی کے لیے مسائل اور ان کا حل بھی پیش کرنے

کی کوشش کی۔

شہر بنگلور سے جاری ہونے والے ادبی رسائل کی ایک لمبی فہرست ہے لیکن چند رسائل ایسے رہے جنھوں نے فکری و فنی اعتبار سے ادب پر گہرے نقوش مرتب کیے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی دو ماہی رسالہ 'نیا دور' ہے۔ اس کا پہلا شمارہ صمد شاہین اور ممتاز شیریں کی زیر ادارت اگست 1944 میں اقبال پریس سے شائع ہوا۔ پہلے شمارے میں مدیر نے اس کی اشاعت کے مقاصد کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

''نیا دور کے پیش نظر جو مقصد ہے، وہ معیاری ترقی پسند ادب کی اشاعت ہے۔ چوں کہ ادب کا زندگی سے تعلق ناگزیر ہے۔ اس لیے 'نیا دور' اس معاملے میں کبھی مصالحت نہیں کرے گا کہ مقصد کی خاطر فن بھینٹ چڑھ جائے یا بغیر مقصد کے فن ہی فن کا خول رہ جائے۔''

اس سے یہ واضح ہوا کہ یہ رسالہ بنیادی طور پر ترقی پسند مزاج کا حامل رہا، جیسا کہ اس کے مشمولات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ 'حرف آغاز' کے تحت صمد شاہین کا عصری ادب کی تشریح و توضیح کرتا ہوا اداریہ، ادب اور زندگی کے رشتے پر پرمغز گفتگو اور ترقی پسند تحریک کا مفصل جائزہ وغیرہ اس رسالے کو ترقی پسند تحریک کے علم برداری کی حیثیت سے پیش کرتے رہے۔ اس تحریک سے وابستہ قلم کاروں نے رسالہ 'نیا دور' کو اپنا تخلیقی تعاون پیش کیا اور ان کی تحریریں پابندی سے نیا دور کے مختلف شماروں میں شائع ہوتی رہیں۔ اس سلسلے میں وقار عظیم، کرشن چندر، اختر انصاری، قاضی عبدالغفار، رشید احمد صدیقی، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، عزیز احمد، سعادت حسن منٹو، شوکت صدیقی، اقبال متین، ممتاز شیریں، سہیل عظیم آبادی، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی، فیض احمد فیض، مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری، آل احمد سرور، خلیل الرحمٰن اعظمی، قتیل شفائی اور خورشید الاسلام وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ رسالے میں شامل اردو ادب کے مایہ ناز ادیبوں اور ممتاز ناقدین کی یہ شعری و نثری تخلیقات ترقی پسند نظریات کی حقیقی ترجمان ہیں۔ نیا دور نے ملکی زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ عالمی ادب کو بھی اپنے صفحات میں جگہ دی اور قارئین کو عالمی ادب سے روبرو کرایا تا کہ انھیں عالمی سطح پر ادبی رجحانات و رویے کا علم رہے۔ یہی سبب ہے کہ ملکی زبانیں ہندی، بنگالی، کنڑا، مرہٹی کے علاوہ روسی، چینی، انگریزی، امریکی، اطالوی وغیرہ زبان و ادب کی شاہکار تخلیقات کے اردو تراجم بھی ہمیں اس رسالے میں ملتے ہیں۔ اپنی متنوع خصوصیات کے ساتھ یہ رسالہ ترقی پسند تحریک کے ترجمان کی حیثیت سے تقریباً ایک دہے تک اعلیٰ شعری و ادبی ذوق کی آبیاری کرتا رہا۔ لیکن تقسیم ہند کا المناک حادثہ اس رسالے کی اشاعت پر بھی اثر انداز ہوا، صمد شاہین اور ممتاز شیریں کی پاکستان ہجرت کے ساتھ اس کا دور اول اختتام پذیر ہوا۔ بعد ازاں مدیران نے اسے دوبارہ زندگی عطا کی اور پاکستان کی سرزمین پر ایک بار پھر اس کی اشاعت شروع ہوئی۔ اس رسالے کی خوبی یہ رہی کہ اس نے ادب اور ادیب دونوں کو اہمیت دی، مغربی افکار و

نظریات سے متعارف کرانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ادبی مباحث کو توازن واعتدال سے ابھارا۔

آزادی کے بعد منظر عام پر آنے والے رسائل میں ماہنامہ 'رفیق' کا نام نمایاں ہے۔ یہ رسالہ ریاست کرناٹک کے تاریخی شہر بیجاپور سے نومبر 1953 میں شائع ہوا۔ شعر وادب کی مستحکم روایت سے عبارت شہر بیجاپور سے نکلنے والا یہ اولین ماہنامہ بیجاپوری صحافت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس رسالے کی اشاعت اردو زبان کے محسن سید سراج الدین قاضی کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ قاضی صاحب نے اس ماہنامے کے پہلے شمارے میں 'شذرات' کے زیر عنوان رسالے کے اجرائی مقاصد کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میرا یہ قدم اردو کی خدمت کا پہلا زینہ ہوگا، جس کے ذریعے کرناٹک کی عوام اردو کو نہ بھولیں اگر نیت میں خلوص ودیانت ہے تو مجھے یقین ہے کہ کچھ ہی عرصہ میں ہمارا رسالہ 'رفیق' حقیقی معنوں میں اردو داں طبقے کی فکر وادب کی نشو ونما کرتے ہوئے ہماری زبان کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔''

(سید سراج الدین قاضی، ماہنامہ رفیق، انجمن بلڈنگ بیجاپور، نومبر 1953، جلد 1، نمبر 1، ص 3،4)

بلاشبہ مدیر سید سراج الدین نے اسی بے لوث جذبے کے ساتھ عملی نمونہ رسالے کی صورت میں پیش کیا، اور چالیس صفحات پر مشتمل عمدہ کتابت وطباعت سے آراستہ رسالہ 'رفیق' اردو زبان کی توسیع واشاعت کا ذریعہ بنا۔ ہر مہینے کی 15 تاریخ کو مطبع ابراہیمیہ حیدرآباد میں طبع ہونے والا یہ رسالہ اپنے دفتر 'انجمن بلڈنگ' بیجاپور سے شائع ہو کر منظر عام پر آتا تھا۔ اس ماہنامہ میں علمی وادبی اور معلوماتی مضامین کثیر تعداد میں شائع ہوتے، دیگر مستقل مشمولات میں افسانے، طنزیہ ومزاحیہ مضامین، شعرا وادبا کا تعارف بیجاپور کے تعلیمی اداروں کا جائزہ، ادبی سرگرمیوں کی روئیداد، غزلیں اور ناصحانہ قسم کی نظمیں شامل ہوتیں۔ ماہنامہ رفیق میں ہر طبقے کی دلچسپی کے لحاظ سے مواد شامل کیے جاتے تھے۔ 'بچوں کی دنیا' کے عنوان سے چند صفحات مختص ہوتے، جہاں اخلاقی ومعلوماتی مضامین، نظمیں اور کہانیاں بچوں کی توجہ کا باعث ہوتیں۔ اس رسالے نے چار سال تک اردو زبان وادب کی قابل قدر خدمات انجام دیں، پھر نامساعد حالات کے سبب اس عمدہ ماہنامے کی اشاعت بند ہوگئی۔

شمالی کرناٹک کے شہر گلبرگہ سے 1956 میں اکرام صہبائی، قاضی حسام الدین اور عظیم یوسف زئی کی مشترکہ کوششوں سے رسالہ 'گلبرگ' اردو صحافت کے افق پر نمودار ہوا۔ گلبرگ نے خالص ادبی نوعیت کے رسالے کی حیثیت سے اپنی پہچان قائم کی۔ اس کے صفحات پر اردو افسانہ، نظمیں، غزلیں، تنقیدی وتحقیقی مقالات طنزیہ ومزاحیہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں دیگر زبانوں کے معروف شعرا کی تخلیقات کے مطالعے کا موقع بھی فراہم کیا۔ کرناٹک کے علاوہ برصغیر ہند وپاک کے معروف ادبا وشعرا کی تخلیقات بھی رسالے کی زینت بنیں۔ چنانچہ جاں نثار اختر، باقر مہدی، ساحر لدھیانوی، فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری، شاذ تمکنت، شاہد صدیقی، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، محی الدین قادری زور، حمید الماس وغیرہ کا قلمی تعاون گلبرگ کو حاصل رہا اور ایسے معتبر ومستند قلمکاروں کی نادر ونایاب تحریریں قارئین گلبرگ تک پہنچتی رہیں۔ چونکہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا تھا، اس لیے رسالے پر اس کے اثرات صاف دکھائی پڑتے ہیں۔ گلبرگ میں شامل تحریروں میں ترقی پسندوں کے افکار وتصورات کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ رسالہ ابتدا میں تو ماہنامہ رہا لیکن بعد میں ہفتہ وار ہوگیا۔ تحقیق کے مطابق ابتدائی چار شماروں کی اشاعت کے بعد یہ علمی وادبی ہفتہ وار کی صورت میں نکلنے لگا۔ آگے چل کر تقریباً دو سال تک اپنی خدمات انجام دینے کے بعد یہ ہفت روزہ بھی بند ہوگیا۔

> **جنوبی هند کی اردو صحافت نے ارتقا و زوال کے کئی دور دیکھے هیں بالخصوص ریاست کرناٹک کی ادبی صحافت کا تجزیه یه بتاتا هے که اس سرزمین سے نه صرف ادبی ذوق کے حامل علمی وفنی رسائل جاری هوئے بلکه قوم وسماج کی ترجمانی کرنے والے رسائل بھی نکالے گئے. سماج و قوم کی علمی ,تعلیمی, سیاسی, تجارتی, ادبی تاریخی ضروریات کو پورا کرتے هوئے یه رسائل وا خبارات روز وشب مصروف کار رهے.**

درج بالا رسائل کے علاوہ بھی اسی زمانے میں کئی ایسے ماہنامے منظر عام پر آئے جن کے حوالے مختلف کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان رسائل نے شعری ونثری تخلیقات کی مستقل اشاعت کے ذریعے علاقائی شعرا وادبا کو ادبی دنیا میں روشناس کرانے کا فریضہ انجام دیا۔ مثلاً ماہنامہ 'سحاب' ہبلی، اقبال سگری کی زیر ادارت، رسالہ 'حبیب' غلام محمد شوکت کی زیر ادارت، 'غزل' شہاب درانی کی زیر ادارت، 'انجمن' میسور سلیم تمنائی کی زیر ادارت اور 'جلوۂ سخن' شرف الدین سلیم کی زیر ادارت منظر عام پر آئے۔

رسالہ 'سوغات' کی اشاعت کو کرناٹک میں ادبی صحافت کے زریں دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سوغات محض ایک رسالے کا نام نہیں بلکہ ایک تحریک کا نام ہے جس سے وابستہ حضرات نے ادب میں بڑا مقام پیدا کیا۔ اردو کے ممتاز ناقد، شاعر اور صحافی محمود ایاز کا یادگار کارنامہ سہ ماہی 'سوغات' ہے۔ جنوری 1956 میں بنگلور سے اس کا اجرا عمل میں آیا۔ وقفے وقفے سے یہ شائع اور بند ہوتا رہا۔ طبع اول چار سال سے کچھ زیادہ عرصے تک پابندی سے شائع ہونے کے بعد 1963 میں بند ہوگیا اور اشاعت ثانی 1971 میں ہوئی۔ اس دور میں صرف 5 شمارے شائع ہوئے لیکن انداز وہی رہا، اداریے کی بلند آہنگی اور تخلیقات کے انتخاب میں غیر جانبدارانہ رویہ، اصول ومعیار کا خاص خیال، کسی بھی معاملے میں کوئی تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملتی، جو محمود ایاز کی گہری تنقیدی بصیرت اور وسیع النظری کا بہترین اظہار ہے۔ رسالے کی بڑی خوبی یہ رہی کہ یہ کبھی کسی تحریک، رجحان اور ادبی گروہ بندی کا حصہ نہیں رہا بلکہ تمام معاملات سے خود کو آزاد رکھتے ہوئے ایک منفرد پہچان قائم کی۔ حالانکہ دیگر رسائل کی طرح اس کے صفحات بھی مضامین، افسانوں، غزلوں، تبصروں اور خطوط سے آراستہ ہوتے تھے، لیکن ادب کے پیچیدہ مسائل پر کی جانے والی بحث، مختلف تخلیقات پر پیش کیے جانے والے تنقیدی مضامین، ادبی جستجو میں تحقیقی زاویہ نگاہ، سنجیدہ مزاج تبصرے وہ خوبیاں ہیں جو اس رسالے کی انفرادیت کا سبب بنیں۔ رسالہ 'سوغات' نے تخلیقی اور تنقیدی دونوں سطحوں پر اعلیٰ معیار کو قائم رکھا۔ اردو تراجم کے ذریعے مغربی شعر وادب کی تخلیقات کو اردو میں روشناس کیا بلکہ جدید تنقیدی اور فلسفیانہ افکار سے قارئین کو روبرو کرانے کا کام انجام دیا۔ ادبی سرپرستی میں اس رسالے نے جو منفرد رول ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ اختر الایمان، وحید اختر، احمد ندیم قاسمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، مجنوں گورکھپوری، شہریار، سہیل عظیم آبادی، کرشن چندر، محمد حسن، بلراج کومل، غیاث احمد گدی، ساقی فاروقی، مجید امجد، شفیق فاطمہ شعریٰ، محمود ایاز وغیرہ کی نایاب تحریریں اس جریدے کا حصہ رہیں۔ 'سوغات' کرناٹک ہی نہیں، بلکہ پورے ہندوستان کی ادبی صحافت میں ایک بہترین اور معیاری رسالہ ثابت ہوا۔

اس صحافتی سفر میں ان رسائل کا تذکرہ بھی ضروری ہے جنھوں نے نئے لکھنے والوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کا بیڑا اٹھایا۔ انھیں موقع فراہم کیا، نئے اذہان کی تربیت اور علاقائی شعروادب کی عکاسی میں جن رسائل کی کارکردگی نمایاں رہی، ان میں خالص ادبی رسالے کی حیثیت سے متعارف ہونے والا ماہنامہ 'افشاں' اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ماہنامہ 1967 میں شہر بلگام سے منظر عام پر آیا۔ 1962 میں یادگیر سے جاری ہونے والے دو ماہی 'چراغ نو' نے بھی شعروادب کے چراغ کو جلائے رکھا۔ علمی وادبی حلقوں میں اسے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ماہنامہ 'نجات' 1972 میں رائچور سے نکلنا شروع ہوا۔ اس کے مدیر اردو کے معروف افسانہ نگار اور شاعر وحید واجد تھے۔ واجد صاحب نے رائچور کی ادبی فضا کو رونق بخشنے اور اردو رسالے کی مقامی ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر اس رسالے کے ذریعے صحافتی میدان میں قدم رکھا۔ رسالے کے مشمولات میں نظم ونثر کے علاوہ 'سوال وجواب' اور 'بزم یاراں' مستقل کالم ہوا کرتے تھے۔ رائچور کی نمائندگی کرنے والا یہ اولین رسالہ چند اشاعتوں کے بعد بند ہو گیا۔

اسی طرح چند رسائل ایسے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جنھوں نے دنیائے صحافت میں فلمی میگزین کی حیثیت سے اپنی پہچان قائم کی لیکن ان میں شامل ہونے والا ادبی حصہ بھی کافی جاندار رہا۔ اس قسم کے نیم ادبی وفلمی ماہناموں میں مئی 1970 میں شکیل مظہری کی زیر نگرانی شائع ہونے والا رسالہ 'الفاظ'، اگست 1972 میں اے آر حمید کی زیر ادارت بنگلور سے جاری کردہ ماہنامہ 'گڈی' اور 1983 میں عظیم اللہ خاں کا پندرہ روزہ رسالہ 'خوبصورت' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ رسالہ 'الفاظ' میں فلمی دنیا کی مکمل تصویر کشی کے علاوہ گوشہ ادب کے لیے بھی چند صفحات مختص ہوتے تھے۔ اس کے ادبی صفحات جوگندر پال، جسٹی سرو، دیوندر اسر جیسے بلند پایہ افسانہ نگاروں کے افسانوں اور مظفر حنفی، فضا ابن فیضی، ندا فاضلی، زیب غوری، شہاب جعفری، حرمت الاکرام وغیرہ مقبول عام شاعروں کی نظموں اور غزلوں سے مزین ہوتے تھے۔ یہ رسائل بھی کچھ عرصہ جاری رہ کر بند ہو گئے۔

خالص ادبی رسائل کی روایت کو برقرار رکھنے میں جن رسائل نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں ایک نام ماہنامہ 'درماں' کا بھی آتا ہے۔ یہ ماہنامہ کرناٹک کی ادبی صحافت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا افتتاحی شمارہ سید ضیاء اللہ کی زیر ادارت 1974 میں منظر عام پر آیا، مشہور ومعروف ادبا وشعرا کی نظمیں، غزلیں، افسانے، طنزیہ ومزاحیہ مضامین، اصلاحی ومعلوماتی مقالات ادبی لطائف اور تبصرے وغیرہ اہتمام سے شائع کیے جاتے تھے۔ ریاستی قلمکاروں کے علاوہ بیرون ریاست کے معتبر قلم کاروں کی شاہکار تخلیقات بھی مختلف شماروں کا حصہ بنیں۔ یہ رسالہ 'کرناٹک کا واحد ادبی ماہنامہ' کے سرنامے کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ پرکشش سرورق کے ساتھ اس کے ابتدائی صفحات پر مشمولات کی فہرست بعنوان 'تخلیقات وتخلیق کار' کے شائع ہوتی تھی۔ اس کے اداریے بھی کافی معلومات افزا ہوتے جہاں اردو مسائل اور ان کے اسباب وعلل پر گفتگو ملتی ہے، علاوہ ازیں ایک انوکھے قسم کا کالم ہوا کرتا جسے 'نقطۂ نظر' کا نام دیا گیا تھا۔ یہاں پر وہ مراسلے شائع کیے جاتے جو علمی، ادبی، سماجی اور معاشرتی مسائل کو زیر بحث لاتے تھے اور اس قسم کے علمی ادبی سوالوں کے جواب کو 'جوابا نگارش ہے' کے عنوانات سے شائع کیا جاتا جہاں سیر حاصل بحث دیکھنے کو ملتی۔ ادب کا ترجمان یہ مفید عام رسالہ تقریباً تین سال کے بعد بند ہو گیا۔

ساتویں دہائی میں پے در پے رسائل وجرائد کی اشاعت کا سلسلہ قائم رہا اور کئی اچھے رسائل منظر عام پر آئے۔ شہر ہبلی کی علمی وادبی سرگرمیوں کا ترجمان ماہنامہ تحریک ادب 1971 اور پندرہ روزہ ہبلی ٹائمز 1975 کی اشاعت نے یہاں شعری وادبی ماحول پیدا کیا۔ ان کے مضامین معلوماتی نوعیت کے ہوتے تھے۔ مشمولات میں سماجی علمی وادبی موضوعات کا احاطہ کیا جاتا۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں شامل تحریریں شہر کی ادبی تہذیبی اور سماجی زندگی کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ انتظامی دشواریوں کے سبب اشاعت کے دوسرے سال ہی یہ رسائل بند ہو گئے۔

جنوبی ہند کی اردو صحافت نے ارتقا وزوال کے کئی دور دیکھے ہیں بالخصوص ریاست کرناٹک کی ادبی صحافت کا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ اس سرزمین سے نہ صرف ادبی ذوق کے حامل علمی وفنی رسائل جاری ہوئے بلکہ قوم وسماج کی ترجمانی کرنے والے رسائل بھی نکالے گئے، سماج وقوم کی علمی، تعلیمی، سیاسی، تجارتی، ادبی تاریخی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے یہ رسائل واخبارات روز وشب مصروف کار رہے۔ 'کرناٹک پنچ' دھارواڑ کچھ اسی قسم کا ماہنامہ ثابت ہوا، مدیر محبوب بڑائی کے قلم سے نکلتا ہوا کالم 'نرم گرم' طنزیہ ومزاحیہ ادب کے سرمایے میں ایک بہترین اضافے کا باعث بنا۔ اس میں عوام کے مختلف طبقوں کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے ہر قسم کے مواد شائع کیے جاتے تھے۔ افسانے، نظمیں، غزلیں، ادبی لطائف، اقوال زریں وغیرہ مشمولات اسے ایک معیاری رسالے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ عوام کی تفریح وحیرت انگیز معلومات کا مرقع 'کرناٹک پنچ' تقریباً گیارہ سال پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ بالآخر چند ناگزیر حالات کے سبب اس کی اشاعت بند ہو گئی۔

اسی سال شہر دھارواڑ سے دوسرا اہم رسالہ ماہنامہ اعتماد 1975 خالص علمی وادبی رسالے کی حیثیت سے منظر عام پر آیا، جس کے مستقل کالموں میں خبرنامہ، نقوش، تبصرے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ تراجم، منتخب اشعار اور مختلف کتابوں پر تبصرے بھی اس رسالے میں طبع ہوتے رہے۔ ماہنامہ 'اعتماد' کو حمید الماس، محمود ایاز، سلیمان خطیب، راہی قریشی، انور عظیم، جمیل مظہری، کوثر چاند پوری، ملک زادہ منظور احمد وغیرہ معروف ادیبوں کی تخلیقات شائع کرنے کا شرف حاصل رہا۔

اسی درمیان صحافتی افق پر نمودار ہونے والے پندرہ روزہ رسائل میں پہلا نام پندرہ روزہ 'صد رنگ' کا ہے۔ یہ رسالہ اردو کے شاعر عادل ادیب کی زیر ادارت بنگلور سے جاری ہوا۔ دوسرا پندرہ روزہ 'صدائے مومن' 1979 کولار سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ یہ رسائل اپنے عہد کی مقامی، علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کے آئینہ دار تھے۔ رسائل میں لائق مطالعہ ادبی تخلیقات کے علاوہ اہم خبروں کے تجزیے بھی شامل اشاعت ہوتے تھے۔ ان پندرہ روزہ رسائل نے تقریباً ایک دہے سے زیادہ عرصے تک برابر شائع ہو کر کرناٹک کی صحافتی تاریخ میں طویل عمر پانے والے رسائل میں جگہ بنائی۔

خالص ادبی نوعیت کے رسائل کی اشاعت کا سلسلہ آگے بھی جاری رہا۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں کئی معیاری رسائل ریاست کی ادبی صحافت کی توانا روایت کا حصہ بنے۔ رسائل میں شائع ہونے والی ادبی تخلیقات اور معلوماتی قسم کے مضامین نے قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی، جس سے رسائل اور قاری کے درمیان رشتہ مزید استوار ہوا۔ رسالہ 'واردات' 1980 خالد سعید کی زیر ادارت، 'شعلۂ نوا' 1982 خلیل مجاہد کی زیر ادارت 'نوائے عصر' 1982 انیس صدیقی کی زیر ادارت اور 'استعارہ' 1985 خورشید وحید کی زیر ادارت منظر عام پر آئے اور اردو صحافت کو جلا بخشی۔

ادب کے جدید رجحانات کی پیش کش اور ترجمانی میں رسالہ 'واردات' 1980 نے اہم رول ادا کیا۔ اس ماہنامے کو ملک کے تقریباً سبھی اہم ادیبوں اور نامور شاعروں کا تعاون حاصل تھا۔ اپنے معیار اور مواد کی وجہ سے دلچسپی

سے پڑھا گیا۔ واردات کی اشاعت کے دو سال بعد رسالہ 'شعلہ نوا' چند فعال نوجوان قلم کاروں کے ذریعے منظر عام پر آیا۔ اس زمانے میں نئی نسل کے نمائندہ کی حیثیت سے 'شعلہ نوا' کو کرناٹک کی ادبی صحافت میں ایک خاص مقام حاصل ہوا۔ یہ رسالہ اس دور کے ادبی، سماجی اور ثقافتی رجحانات کا مکمل نقشہ پیش کرتا ہے۔ علم وادب اور سماج کی بے لوث خدمت میں ہمہ تن مصروف رہنے والے معروف صحافی انیس صدیقی کا رسالہ 'نوائے عصر' اپنے موضوعات کے اعتبار سے تاریخی اور ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ مشاہیر اہل قلم کے تعاون نے رسالہ کو معیار و وقار بخشا۔

یوں تو کرناٹک کی اولین خاتون صحافی ہونے کا شرف سیدہ ذکریٰ بتول کو حاصل رہا ہے لیکن صحت مند و صالح ادب کی تشکیل اور اخلاق اور تعلیمی شعور پیدا کرنے میں ماہنامہ 'زریں شعاعیں' 1989 کا کافی عمل دخل رہا ہے جس کی مدیرۂ خصوصی فریدہ رحمت اللہ اسما ہیں۔ یہ رسالہ خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ اس رسالے کے اغراض ومقاصد میں تعلیم نسواں کی ترویج، خواتین میں علمی وادبی ذوق پیدا کرنا، خواتین کے معاشرتی، شہری اور ملکی حقوق کا تحفظ شامل ہے۔ اس نے اپنی ملکی مستورات کی دماغی بیداری و ذہنی ترقی میں کردار ادا کیا، خواتین کے علمی ارتباط، ادبی دلچسپی، پاکیزگی ذوق اور وسعت نظری کی ترقی کا ذریعہ بنا۔

کرناٹک اردو اکادمی نے بھی صحت مند ادب کی ترویج میں پیش رفت کرتے ہوئے 2011 میں بنگلور سے ایک رسالہ 'ادیب' جاری کیا۔ جس کے نگراں قمر الاسلام اور مدیر کے منصب پر ایس مرزا عظمت اللہ فائز تھے۔ علاوہ ازیں کرناٹک اردو اکادمی کے ترجمان کی حیثیت سے سہ ماہی ادبی وتہذیبی مجلہ اذکار 2011 میں منظر عام پر آیا۔ مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے حافظ کرناٹکی اور مدیر کے فرائض مرزا عظمت اللہ نے انجام دیے اس ادبی جریدے میں کرناٹک کے علاوہ ملک بھر کے ممتاز دانشور قلم کار لکھتے رہے، بالخصوص کرناٹک اردو اکادمی کی سرگرمیوں سے متعلق مضامین شامل کیے جاتے۔ مختلف سیمناروں میں پڑھے گئے مضامین خصوصی اشاعتوں میں شامل کیے جاتے۔ اس رسالے کی عمر تو زیادہ نہ رہی لیکن اپنے بلند پایہ مضامین اور شاعری کی وجہ سے ادبی حلقوں میں ممتاز مقام رکھتا تھا۔

اس مختصر جائزے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس طرح جنوبی ہند کی دیگر ریاستیں اور شہر علم وفن کا گہوارہ رہے ہیں اسی طرح کرناٹک بھی ادبی ولسانی اعتبار سے اپنی تاریخ رکھتا ہے۔ اس کے اضلاع بھی زبان وادب، تہذیب و ثقافت اور مذہب و سیاست کا گہوارہ رہے ہیں۔ اسی طرح ادبی صحافت کی تاریخ میں ہم کرناٹک کو فراموش نہیں کر سکتے، کیونکہ اس ریاست کی ادبی صحافت صحت مند اقدار کی حامل رہی ہے۔ یہاں کے رسائل کے آغاز وارتقا کی تاریخ کا اجمالی جائزہ ہمیں اس نتیجے پر لے جاتا ہے کہ یہاں بہت سے رسائل شائع ہوئے۔ اردو رسائل نے ایک ایسے زمانے میں اپنے بال و پر نکالے جو ہماری قومی تاریخ کا تغیراتی عہد تھا۔ بلاشبہ رسائل کی اشاعت سے اردو زبان وادب میں آنے والے افکار ونظریات، ادبی وسماجی رجحانات اور تحریکات کا پتہ چلتا

> جس طرح جنوبی ہند کی دیگر ریاستیں اور شہر علم و فن کا گہوارہ رہے ہیں اسی طرح کرناٹک بھی ادبی و لسانی اعتبار سے اپنی تاریخ رکھتا ہے۔اس کے اضلاع بھی زبان وادب' تہذیب و ثقافت او رمذہب و سیاست کا گہوارہ رہے ہیں- اسی طرح ادبی صحافت کی تاریخ میں ہم کرناٹک کو فراموش نہیں کر سکتے'کیونکہ اس ریاست کی ادبی صحافت صحت مند اقدار کی حامل رہی ہے- یہاں کے رسائل کے آغاز وارتقا کی تاریخ کا اجمالی جائزہ ہمیں اس نتیجے پر لے جاتا ہے کہ یہاں بہت سے رسائل شائع ہوئے-

ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مختلف موضوعات پر شائع ہونے والے یہاں کے رسائل نے ادب کا ایک خاص معیار بھی پیش کیا ہے۔ ماضی میں نکلنے والے ادبی رسائل نے ہماری ادبی تاریخ سازی میں نہایت اہم، بامعنی اور کارآمد کردار ادا کیا ہے۔ مختلف مقامات سے وقتاً فوقتاً معیاری اور مفید ادبی رسائل کبھی ہفتہ وار اور پندرہ روزہ تو کبھی ماہنامے اور سہ ماہی کی صورت میں جاری ہوتے رہے، ان میں سے بعض تو تاریخ ادب میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ اب اگر موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو ان دنوں رسائل کی رفتار سست ہے، یہ ایک افسوسناک صورت حال ہے اور اس کی تلافی ضروری ہے۔ رسائل کو زندگی اس کے قارئین سے ملتی ہے جو رسائل قارئین کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے ماضی کی بازیافت کے ساتھ روح عصر کو اپنے اندر سمو لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور وقت کے ساتھ چلنے کا ہنر جانتے ہیں درحقیقت وہی کامیاب ہیں۔ ہم رسائل کی ادبی سماجی وثقافتی خدمات سے انکار نہیں کر سکتے، اگرچہ بہت سے بہترین رسائل شائع ہوئے اور ناموافق حالات کے سبب بند بھی ہو گئے، لیکن وہ ادبی جریدے جو چراغ کی طرح اب بھی روشن ہیں اور اپنی ادب نوازی اور ادب دوستی کا ثبوت پیش کر رہے ہیں انھیں زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

مراجع / کتابیات

1. اردو صحافت کا سفر، گربچن چندن، عفیف آفسیٹ پرنٹرز، دہلی 2007
2. اردو صحافت ترجمہ وادارت، سید ضیاء اللہ، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور، 1994
3. ابلاغیات، پروفیسر محمد شاہد حسین، عفیف آفسیٹ پرنٹرز، دہلی، 2004
4. اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل، مرتبہ عابد سہیل، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 1981
5. کرناٹک میں اردو صحافت، ڈاکٹر انیس صدیقی، اوایس گرافکس، نارائین گوڑا حیدرآباد، 2003
6. بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب، مرتبہ پروفیسر عتیق اللہ، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی، 1973
7. چند اہم اخبارات ورسائل، قاضی عبدالودود، ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ لبرٹی آرٹ پریس، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
8. جنوبی ہند کا بہترین ادب، مجیب احمد، منظور احمد، مجلس ادب پبلی کیشنز، بنگلور، 1958
9. اردو ادب آزادی کے بعد، مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام، یونیورسٹی پبلی کیشنز ڈویژن علی گڑھ، 1973
10. جنوبی ہند کی تاریخ، کے ایل نیل کنٹھ، شاستری، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، 1980
11. مدراس میں اردو ادب کی نشوونما، ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، معین پبلی کیشنز، باغ روڈ حیدرآباد، 1979
12. مجلاتی صحافت کے ادارتی مسائل، روشن آرا راؤ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، 1989
13. مشاہیر کرناٹک، خالد انجم، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور، 2009
14. جنوبی ہند کی اردو صحافت، ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، معین پبلی کیشنز، باغ روڈ حیدرآباد، 1980
15. اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار، رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز 1969
16. ادب اور اردو صحافت، ضمیر الدین قریشی، ایجوکیشنل پریس علی گڑھ، 1964
17. تاریخ ادب اردو، کرناٹک، کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور 1994

■

Umme Ammara Zia
Room No.: 09, Koyna Hostel, JNU
New Delhi- 110025
Mob.:8920475306

مہجری ادب اگرچہ کہ اپنی کم سنی اور کم مائیگی کی وجہ سے طویل زمانہ گزرنے کے بعد پذیرائی حاصل کر سکا لیکن مہجری ادب کا سرمایہ جدید عربی ادب کا اب جزو لا ینفک بن چکا ہے۔

غزالہ پروین

لبنان کا ایک آشفتہ سر
جبران خلیل جبران

نوعِ انسانی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہم پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ دنیا میں مختلف اقوام نے مختلف وجوہات سے نقل مکانی کی ہے۔ غیر مناسب موسم اور آب و ہوا، معاشی و اقتصادی نا آسودگی، حکمراں طبقے کے ظلم و استبداد سے چھٹکارہ، بہتر اور خوشحال مستقبل کی تمنا، غرض سماجی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی وجوہات کے علاوہ بھی بہت سے اہم اسباب تھے جن کی بنا پر دنیا کی مختلف اقوام مختلف ادوار میں اپنی بود و باش اور سکونت کو تبدیل کرتے رہے۔

جب ہم خلیجی ممالک پر نظر ڈالتے ہیں تو ان ممالک کی عوام نے مختلف سیاسی، سماجی، اقتصادی وجوہات کی بنا پر نقل مکانی یا ہجرت کی۔ عرب ممالک میں مصر، عراق، شام، فلسطین اور لبنان ایسے ممالک ہیں جہاں کی عوام نے ہزاروں کی تعداد میں مغربی اور یورپی ممالک میں سکونت اختیار کی۔ تقریباً 1850 سے 1925 تک کے دورانیے میں عرب ممالک سے ہزاروں لوگوں نے ہجرت کی۔ خاص طور سے لبنان میں برسوں سے رائج ایسے قوانین ہی سب سے اہم اسباب تھے ہجرت اور نقل مکانی کے۔ لبنان کی خوں ریز جنگوں میں لاکھوں انسان مارے گئے۔ جو بچ گئے انھوں نے اپنی جان کی سلامتی اور اپنے بچوں کے مستقبل کی آس لیے مغربی ممالک اور یورپی ممالک کو اپنا مسکن بنایا۔ ان مہاجرین کی اکثریت ملک شام اور لبنان کے باشندوں کی تھی انھوں نے شمالی و جنوبی امریکہ کو اپنا ملجا و ماویٰ بنایا۔

عرب و لبنان کے ان مہاجرین میں لبنان کے سپوت خلیل جبران بھی تھے جو حکومت کے ظلم و ستم اور کلیساؤں کی اجارہ داری سے تنگ آکر اپنے خاندان کے ساتھ 1895 میں شمالی امریکہ کے شہر بوسٹن میں سکونت اختیار کی۔ دن بہ دن عرب ممالک سے مہاجر کے قافلے مختلف یورپی و مغربی ممالک پہنچنے لگے۔ دیارِ شرق سے نکلے ہوئے یہ قافلے دیارِ غرب کی چکا چوند میں بھی اپنے وطن کی مٹی کو یاد کرتے رہے۔ وقت گزرتا رہا کچھ برسوں بعد ان مہاجرین کو جب ذہنی آسودگی نصیب ہوئی تب انھوں نے اپنے احساسات، تجربات و مشاہدات کو سپرد قلم کرنا شروع کیا اور اس طرح شمالی اور جنوبی امریکہ میں رہائش پذیر ان مہاجرین نے ادب کی تمام اصناف کو سیراب کرنا شروع کیا اور اس طرح مہجری ادب کی بنیاد دیارِ غیر میں رکھی۔ مہجری ادب میں تہذیبی تبدیلی کے باوجود اپنی مادری زبان اور وطن سے محبت کا اثر نمایاں ہے۔ مہجری ادب اگرچہ کہ اپنی کم سنی اور کم مائیگی کی وجہ سے طویل زمانہ گزرنے کے بعد پذیرائی حاصل کر سکا لیکن مہجری ادب کا سرمایہ جدید عربی ادب کا اب جزو لا ینفک بن چکا ہے۔ جدید عربی ادب میں مہجری ادب کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے مشہور عربی ناقد 'شوقی ضیف' رقمطراز ہیں:

''مہجری شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے سے پہلے اس کے لیے اپنے ذہن کو تیار کر لینا چاہیے کیونکہ جدید پیمانے قدیم شاعری کے پیمانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اس کو مکمل طور پر سمجھنے کے بعد ہی اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''

سابق پروفیسر شعبہ عربی، سرسید کالج اورنگ آباد محترم صدرالحسن ندوی مدنی مہجری شاعری اور اس کی اہمیت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''عربی شعر و شاعری عصرِ جاہلی سے عصرِ جدید تک جس مزاج و منہاج پر رواں دواں تھی انیسویں صدی کے نصف اول تک اس میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہیں ہوئی لیکن اس صدی کے نصف آخر میں سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی مد و جزر کے تناظر میں بڑے پیمانے پر ترکِ وطن کے نتیجے میں ادب کا ایک ایسا دبستان وجود میں آیا جو عربی شاعری کے قدیم مزاج و منہاج کے سلسلے میں اپنے ذہن و دماغ میں منفی تصورات رکھتا تھا۔ اونٹوں اور گھوڑوں کی تعریف، دیارِ محبوب کے ٹیلوں پر اشک ریزی اور اصحاب وجاہت کے تملق و مدح سرائی کی ایک بے روح شاعری گردانتا تھا۔ اس لیے شعرا مہجر نے عربی شاعری کو تمام بندشوں، روایات، تکلفات اور مبالغہ آرائیوں سے آزاد کر کے ادب برائے زندگی کے ہر شعبے کا ترجمان بنا دیا۔ اس ردِ عمل کے نتیجے میں انھوں نے قدیم عربی شاعری کے عروض و قوافی اور اوزان و اسالیب کے مروجہ قواعد سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی اور اس کی شاید سب سی بڑی وجہ مغربی زبان و ادب سے ان کی واقفیت و شیفتگی اور یورپ کے ترقی پسند شعرا سے ان کی مزاجی ہم آہنگی تھی۔''

ان مہجری شعرا میں ایک اہم نام جبران خلیل جبران کا آتا ہے جنھوں نے روایتی اسلوب اور روایتی شاعری کو ترک کر کے نئے مزاج اور نئے ادب سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ خلیل جبران کی زندگی کا بیشتر حصہ شمالی امریکہ میں گزرا۔ دیارِ مغرب کی آزاد فضا، فکر و عمل کی آزادی نے خلیل جبران کے تخیل کو نئی وسعتیں دیں۔ جبران کے خمیر میں حب الوطنی کی روح جاگزیں تھی۔ وہ اپنی قوم و وطن کو ان مغربی ممالک کی صف میں کھڑا کرنا چاہتے تھے جہاں انسانیت ان کے ادب کا ناگزیر حصہ

تھی۔اگر جبران کی جملہ تخلیقات کا تجزیہ کیا جائے تو اکثر حصہ ملک ووطن کی بہتری، نئے سماج کی تشکیل، روایت شکنی، انصاف، خوشحالی کی امید اور حقوق انسانی پر مشتمل ہے۔ لبنان کی تاریخ میں جبران کی انقلابی سوچ اور ان کی انسان دوستی کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

لبنان کے سپوت اور سرفروش خلیل جبران 1883 میں لبنان کے بشرئ نامی ایک گاؤں میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 1895 میں غربت وتنگدستی سے پریشان ہوکر اپنی ماں، بھائی پطرس اور دو بہنوں کے ہمراہ امریکہ کے شہر بوسٹن میں سکونت اختیار کی۔ اور وہاں چینیوں کا غریب محلّہ چائنا ٹاؤن میں مقیم ہوگئے۔ اس وقت جبران محض بارہ سال کے تھے۔ اپنی ابتدائی تعلیم بھی مکمل نہیں کی تھی۔ لہٰذا عربی زبان وادب کی مزید تعلیم کے لیے جبران کو دوبارہ لبنان بھیج دیا گیا۔ جہاں جبران نے مدرسۃ الحکمۃ میں تقریباً چار سال تک عربی زبان وادب میں مہارت حاصل کی۔ اسی کے ساتھ فرانسیسی ادب، بائبل اور فلسفے کی بھی تعلیم حاصل کی۔ تقریباً چار سال مدرسۃ الحکمۃ میں گزارنے کے بعد جبران جب بوسٹن واپس لوٹے تو انھیں یکے بعد دیگرے کئی صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کی بڑی بہن سلطانہ کا انتقال ہوگیا اس کے کچھ دنوں بعد جبران کے بھائی اور ماں کا بھی انتقال ہوگیا۔ گھر کی تمام ذمے داریوں کا بوجھ جبران اور ان کی بہن ماریہ پر آن پڑا۔ یہ جبران کی زندگی کا بدترین دور تھا۔ ماریہ دست کاری سے اپنا اور جبران کا پیٹ پالتی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جبران نے انشا پردازی اور پینٹنگ شروع کی۔ 1904 میں بوسٹن میں جب 'جریدۃ المہاجر' کی اشاعت عمل میں آئی تو جبران اپنے مضامین بھی شائع کرنے لگے۔ اسی طرح دوسرے جریدۃ 'الھدیٰ' میں جبران کے مضامین باقاعدگی سے شائع ہونے لگے۔ جس کی وجہ سے ادبی حلقوں میں جبران بہت جلد معروف ہوگئے۔ 1904 ہی میں تصویروں کی نمائش میں ان کا تعارف میری ہاسکل سے ہوا۔ جس نے جبران کی غیر معمولی ذہانت وفطانت دیکھ کر اس پر خاص توجہ کی اور اپنے ذاتی خرچ پر جبران کو فن مصوری (پینٹنگ) کی اعلیٰ تعلیم کے لیے پیرس روانہ کیا۔ جبران نے پیرس میں دو سال گزارے۔ فن مصوری کے ساتھ ساتھ جبران نے فرانسیسی زبان و ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ جس سے انھیں فرانسیسی ادیبوں کے جدید افکار ونظریات کو سمجھنے کا بہترین موقع حاصل ہوا۔

فرانس سے واپسی کے بعد جبران نے اپنی رہائش مستقل طور پر بوسٹن سے نیویارک منتقل کرلی۔ ابتدا میں جبران بہت سے عربی مضامین مختلف جرائد میں شائع کرواتے تھے۔ اسی طرح ابتدا میں کچھ کتابیں عربی زبان میں بھی لکھیں۔ لیکن نیویارک میں عربی کتب کو خاطر خواہ پذیرائی نہیں ملی۔ اور نہ ہی ان چند کتابوں کی اشاعت سے معاشی تنگی دور ہوئی۔ جبران نے انگریزی میں لکھنا شروع کیا۔ ان کے مضامین مختلف انگریزی جرائد کی زینت بننے لگے۔ اسی طرح انگریزی زبان میں کچھ کتابیں منظرِ عام پر آنے کے بعد عربی اور انگریزی ادبی حلقوں میں جبران متعارف ہوئے۔ ان کی ادبی تخلیقات کی بہت پذیرائی ہوئی۔ بلکہ اس حد تک پذیرائی ہوئی کہ کچھ کتابوں کے کئی ایڈیشنس منظر عام پر آئے۔ خلیل جبران کی ایک کتاب 'النبی' (The Prophet) دنیا کی سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ کتاب جو انگریزی زبان میں تحریر کردہ ہے پندرہ لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہوئیں۔ دنیا کی تقریباً بیس زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ یہ انگریزی زبان میں سب سے اہم تصنیف ہے۔ اس طرح عربی زبان میں ناول 'الاجنحۃ المتکسرۃ' بھی سب سے عمدہ تصنیف تسلیم کی گئی۔ جبران نے تصنیف وتالیف کا کام دو زبانوں میں کیا ہے، عربی اور انگریزی۔ عربی ممالک کے لیے عربی زبان میں اور اہلِ مغرب اور انگریزی داں کے لیے انگریزی کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ کچھ عرصے بعد جبران کی تمام عربی وانگریزی کتب کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ جبران نے آٹھ کتابیں عربی زبان میں اور آٹھ کتابیں انگریزی زبان میں لکھی ہیں۔

عربی زبان کی کتابیں

1 **الموسیقی** (1905)

جبران نے اس کتاب میں موسیقی کی اہمیت اور نفسِ انسانی کے ساتھ اس کے روحانی رشتے پر روشنی ڈالی ہے۔ جبران نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ موسیقی انسان کے اندر ایک نیا عزم، جوش اور ولولہ پیدا کرتی ہے۔

2 **عرائس المروج** (1906)

یہ تصنیف تین افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان تینوں افسانوں میں مذہبی تعصب، سرمایہ دارانہ نظام کی اجارہ داری اور مختلف سیاسی وسماجی برائیوں پر ضرب کی گئی ہے۔ اس کتاب میں جبران کا رویہ باغیانہ اور سخت ہے۔

3 **الارواح المتمرّدہ** (1908) سرکش روحیں

یہ کتاب چار افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس میں حکمراں طبقے اور مذہبی پیشواؤں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس کتاب میں بھی جبران کے باغیانہ تیور نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کی وجہ سے جبران پر ملحد ہونے کا الزام لگایا گیا۔ چرچ میں اس کتاب کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔ اور اسے نذرِ آتش کیا گیا۔

4 **الاجنحۃ المتکسرہ** (1921) ٹوٹے ہوئے پر

یہ کتاب جبران کا ایک مشہور ناول ہے۔ اس کتاب میں بھی فرسودہ رسوم اور طبقاتی کشمکش کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں طبقۂ اناث کی حمایت اور طرف داری کی گئی ہے۔

5 **دمعۃٌ و ابتسامہ** (1914) آنسو اور مسکان

یہ کتاب جبران کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہے۔

6 **المواکب** (1914) قافلے

یہ جبران کی واحد شعری تخلیقات کا مجموعہ ہے جس کا نفسِ مضمون فلسفیانہ خیالات اور صوفیانہ افکار ہیں۔

7 **العواصف** (1920) آندھیاں/طوفان

یہ کتاب جبران کے افسانوں اور مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ دراصل پہلی جنگِ عظیم کے بعد لبنان اور دوسرے عرب ممالک میں ہونے والے بحران اور مسائل کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔

8 **البدائع و الظرائف** (1923)

یہ کتاب بھی جبران کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ حکیمانہ اقوال اور ناصحانہ تحریریں اس کتاب کا خاصہ ہے۔

خلیل جبران کا تخلیقی ادب نثری وشعری اصناف میں موجود ہے۔ جبران نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے شعری ونثری دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن جبران کو شہرت ان کے شعری کلام کے بجائے نثری تخلیقات سے ہوئی۔ سوائے 'مواکب' کے جو جبران کی پہلی اور آخری شعری تخلیق ہے۔ باقی تمام تخلیقات نثری یا منظوم نثری حالت میں ہیں۔

جبران کی ایک بہت اہم کتاب 'الارواح متمرّدہ' (سرکش روحیں) ہے جو چار افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں چار افسانوں میں سے یہاں دو افسانوں کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

افسانہ 'کافر خلیل' اس عنوان سے ہی جبران کا طنز جھلکتا ہے۔ اس افسانے میں جبران نے ایک بہت نیک، پارسا، عیسائی مذہب کا سچا پیروکار، غریبوں کا مسیحا، اخلاقیات کا شیدائی، اعلیٰ اقدار کے حامل انسان کو مرکزی کردار عطا کیا ہے۔ کافر خلیل کے روپ میں جبران نے ایک ایسے باغی وسرکش کا روپ دے کر مذہبی پیشواؤں کے سیاہ کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔ جبران نے جب شعور کی منزلوں کو طے کرنا شروع کیا تب انھیں اس کا ادراک ہوتا

گیا کہ سماج کس طرح طبقاتی کشمکش میں مبتلا ہے۔ غربا و مساکین کی آمدنی کا اکثر حصہ کس طرح سرمایہ دار اور مذہبی پیشواؤں کی جیب میں جاتا ہے۔ کافر خلیل جو اس افسانے کا مرکزی کردار ہے عوام الناس کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ کافر خلیل جو حکمراں طبقے اور مذہبی پیشواؤں کی نظر میں کافر، ابلیس، باغی، سرفروش، سرکش اور روایت شکن ہے۔ لیکن جبران نے خلیل کو ایک مسیحا کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہی وہ تصنیف ہے جس کی وجہ سے جبران پر الحاد کا الزام لگا کر کلیساؤں میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔ بلکہ اس کتاب کو عیسائیوں کے لیے حرام قرار دیا گیا۔ لبنان میں جبران کی کتابیں نذرِ آتش بھی کی گئیں۔

جبران مذہب مخالف نہ ہو کر مذہبی پیشواؤں کی بے جا بندشوں اور ان کی مفاد پرستی سے نالاں تھے۔ جبران عیسیٰ مسیح کی سچی تعلیمات کو صحیح طریقے سے لوگوں میں پھیلانا چاہتے تھے۔

جبران کا یہ افسانہ پڑھنے کے بعد ہمیں اس وقت کی سماجی ناانصافی اور حقوق تلفی کا اندازہ ہوتا ہے اور لوگوں کے تئیں جبران کی سچائی عیاں ہوتی ہے۔

خلیل جبران کا دوسرا افسانہ جو 'سرکش روحیں' نامی کتاب میں شامل ہے۔ اس افسانے میں جبران نے آج سے ایک صدی قبل لبنان اور دوسرے عرب ممالک کے رسوم پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ صدیوں سے چلے آرہے بہت سارے فرسودہ رسوم کس طرح ہماری زندگی کو تلخیوں سے بھر دیتے ہیں۔ سماج میں بہت سے رسم و رواج محض انسان کی جاہلیت اور کم فہمی کی وجہ ہیں ہے۔ انسانی سماج میں شادی بیاہ بھی ایک اہم اور ناگریز رواج ہے۔ جبران نے اس افسانے میں دو مرکزی کردار یعنی رشید نعمان اور روزہنی کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ چاہتوں اور رشتوں کا پیمانہ مادیت نہیں ہے۔ یہ چاہت دنیاوی شان و شوکت سے بہت پرے کی چیز ہے۔ چاہت تو وہ جذبہ ہے جو لافانی اور ہست و بود سے ماورا ہوتا ہے۔ اسی طرح مرد و عورت کے درمیان سچی چاہت کا معیار مال و دولت اور جاہ و حشم کی بجائے وہ احساس و جذبہ ہوتا ہے جس کا کوئی مول نہیں۔ گویا جبران نے اس افسانے میں بتایا ہے کہ سچی چاہت مابعدالطبیعاتی ہے۔ ہمارے سماج میں اکثر ظاہری شان و شوکت اور کروفر ہی شادی اور دوسرے رشتوں کے لیے محرکات بنتے ہیں۔ جبران کے مطابق یہ ہمارے سماج کی بہت تلخ حقیقت ہے کہ انسانی رشتوں میں ہم ہمیشہ مادیت کو مدِنظر رکھتے ہیں لیکن اس دنیا میں سچی خوشیاں ظاہری شان بان سے نہیں بلکہ یہ تو دلوں کی ہم آہنگی اور لطیف احساسات پر منحصر ہوتی ہیں۔ یہ بھی ایک کڑوی حقیقت ہے کہ سماج میں ہزاروں شادیاں محض مال و دولت اور شان و شوکت کو مدنظر رکھ کر انجام پاتی ہیں۔ چاہے مرد و عورت کے دل اور ذہن ہم آہنگ ہوں یا نہیں۔ آج ہمارے سماج میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو چاہت کی بجائے مصالحت پر زندگی گزار رہے ہیں اور شادی جیسے بندھن کو مصالحت پر گزارنا کسی عذاب سے کم نہیں۔ جبران جو سماج کے بڑے نبض شناس تھے انھوں نے سماج کے ان فرسودہ رسوم پر کاری ضرب لگائی ہے۔

اس افسانے میں رشید نعمان، روزہنی سے عمر میں بہت بڑا ہوتا ہے۔ روزہنی کے والد کی عمر کے برابر۔ لیکن رشید اپنی شان و شوکت، دولت و ثروت کی بنیاد پر روزہنی سے شادی کرتا ہے۔ لیکن روزہنی نعمان کو کبھی اپنے شوہر کے روپ میں قبول نہیں کرتی اور ایک روز وہ موقع پا کر نعمان کا گھر چھوڑ دیتی ہے اور اپنے پسندیدہ شخص کے ساتھ شادی کر لیتی ہے۔ بقول جبران "سماج ایسی عورت کو زانیہ اور فاحشہ گردانتا ہے۔'' لیکن جبران کی فکر و نظر میں روزہنی ذرا بھی قصوروار یا مجرم نہیں ہے۔ جبران نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسانی رشتوں اور چاہتوں کو دولت کے پیمانے میں نہ تولا جائے، چاہت تو وہ انسانی جذبہ ہے جس کا کوئی مول نہیں اور مادیت کبھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اقتباس افسانہ 'وردۃ الھانی'

''عورت کو خوشی نہ تو مرد کی شان و شوکت اور عزت سے حاصل ہوتی ہے اور نہ اس کی سخاوت سے۔ بلکہ یہ تو اس پیار سے حاصل ہوتی ہے جو دونوں کے دلوں اور ان کی لگن کو شیر و شکر کر دے اور جسم و جاں ایک کر دے۔

اس عورت کا غم کون جانے جو خدا کے حکم سے اپنی روح اس آدمی پر نچھاور کر دے جسے وہ چاہتی ہو اور اپنا بدن دوسرے کے حوالے کر دے جسے وہ انسانی قانون کے دباؤ تلے رہ کر پیار کرے۔ یہ ایسا المیہ ہے جسے عورت کے لہو اور آنسوؤں سے لکھا گیا ہو لیکن آدمی اسے پڑھ کر اس کا مذاق اڑاتا ہے کیونکہ وہ اسے سمجھتا ہی نہیں۔ پھر اگر وہ سمجھ ہی لے تو اس کا ایک قہقہہ اس فعل کو ملامت میں بدل دے گا اور یہ عورت کے دل پر آگ بن کے جلے گا۔ کالی راتیں یہ ناٹک اس عورت کی روح کے اسٹیج پر کھیلتی ہیں، جس کا بدن شادی کے خدائی قانون کا مطلب سمجھنے سے قبل ایسے آدمی سے باندھ دیا گیا ہو جسے وہ اپنا شوہر سمجھتی ہو۔ وہ اپنی روح کو اس آدمی کے ارد گرد منڈلاتے دیکھتی ہو جسے وہ تمام پاکیزہ اور سچے پیار اور خوبصورتی سے سراہتی ہو۔ یہ کیسا خوفناک عذاب ہے۔ آغاز عورت میں کمزوری پیدا کرنے اور مرد کو طاقت بخشنے سے ہوا۔ یہ آدمی کے بگڑے ہوئے قانون اور مقدس پیار اور دل کے متبرک مقصد کے درمیان ہولناک جنگ ہے۔''

مذکورہ افسانے میں سماج کے سامنے سماج کے ان تلخ حقائق کو جبران نے اپنی تحریروں کے ذریعے عیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ جبران کی تمام شعری و نثری تخلیقات میں جبران کے باغیانہ افکار اور روایت شکنی کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

جبران کی تمام تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ جبران قوم و ملت کے مسیحا ہیں۔ جبران کی وسعتِ نظری اور آفاقی فکر ایسے رسوم و عقائد کا برابر جائزہ لیتی رہی جو سماج کو صدیوں سے کھوکھلا کرتی چلی آرہی ہے۔ جبران قوم کا مسیحا نظر آتا ہے۔ ان کی ذہانت و فطانت ایسی روایات کو برداشت نہ کر سکی۔ انسانوں کا سیاسی، سماجی، معاشی، جذباتی استحصال وہ کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی تمام تخلیقات سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ وہ قوم کے چارہ گر اور غمگسار تھے۔ کبھی خوابیدہ قوم کو حکمراں طبقے کے ظلم سے بیدار کرتے ہیں۔ قوم کے اس سوز و گداز میں وہ کبھی باغیانہ روش اختیار کرتے ہیں اور کبھی شفقت و نرمی کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ جبران کی ہر تحریر میں ایک انقلابی و اصلاحی سوچ عیاں ہے۔ زندگی کا اکثر حصہ دیارِ غیر میں گزارنے کے باوجود جبران اپنے لوگوں اور وطن کی مٹی سے ہمیشہ جڑے رہے۔

لبنان کی تاریخ میں جبران کی سرفروشی اور روایت شکنی ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ جبران بطور شاعر، ادیب، مصور، روایت شکن، باغی کے علاوہ ایک انسانیت کے ہمدرد اور غمخوار کی حیثیت سے انسانی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

مراجع و مصادر

1 جدید عربی شاعری: ڈاکٹر فوزان احمد، جامعہ سلفیہ بنارس 2008
2 جدید عربی ادب اور ادبی تحریکات۔ ڈاکٹر ابو عبید۔ الکتاب انٹرنیشنل، نئی دہلی 2011
3 سرکش روحیں اور آبی پریاں۔ جبران خلیل جبران۔ روشان پرنٹرس، دہلی 2018
4 روح کے آئینے اور گلبدن۔ جبران خلیل جبران 2018
5 جدید عربی ادب: ڈاکٹر شوقی ضیف، روشان پرنٹرس، دہلی 2014

■

Dr. Ghazala Parveen
Lecturer in Arabic
Dr. Rafiq Zakaria College for Women
Aurangabad - 431001 (MS)
Mob.: 9850782985

قرۃ العین

ازبکستان میں اردو زبان و ادب

ازبکستان مرکزی ایشیا کا ایک اہم ملک ہے جس کا شمار دنیا کے قدیم ممالک میں ہوتا ہے۔ یہ خشکی اور خوبصورت پہاڑوں کے درمیان واقع ہے اس کی سرحدیں مغرب اور شمال میں قزاخستان مشرق میں کرگستان اور تاجکستان، جنوب میں افغانستان اور ترکمانستان سے ملتی ہیں۔ یہ دنیا کا دوسرا ایسا ملک ہے جس کے چاروں طرف ایسے ممالک ہیں جو خود بھی سمندر سے محروم ہیں۔ آزادی کے بعد اس ملک کی قومی زبان ازبیک ہے۔ یہ ایک ترکی زبان ہے جو ترکی اور دیگر ترک زبانوں سے ملتی جلتی ہے۔ ازبکستان عہد قدیم سے ہی ایک علمی مرکز رہا ہے خواہ اسلامی علوم و فنون ہوں یا ادبی وثقافتی، دیگر ممالک نے بھی یہاں کے علمی سوتے سے فیض حاصل کیا ہے۔ بڑے اور عظیم اسکالروں کا تعلق بھی اس سرزمین سے رہا ہے۔ حدیثوں کو یکجا کرنے والے امام بخاری کا تعلق بھی ازبکستان کے شہر بخارا سے رہا ہے۔ ان کے علاوہ ابن سینا، البیرونی، الخوارزمی، احمد الفرغانی وغیرہ بھی ازبکستان کے ہی رہنے والے تھے۔ ہندوستان سے مرکزی ایشیا اور خاص طور پر ازبکستان سے رشتے کافی پرانے ہیں۔

مذہبی، لسانی تجارتی اور تہذیبی تناظر میں ہندوستان کی تاریخی اہمیت کا جائزہ لیا جائے تو ازبکستان کا ذکر خصوصی طور پر سامنے آتا ہے۔ ازبکستان سے سماجی سیاسی، تہذیبی، تمدنی، تجارتی اور لسانی سطح پر ہندوستان سے بہت قریبی مراسم رہے ہیں اور ہندوستان کو انھوں نے متاثر بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1995 سے قبل جب ازبکستان کو باقاعدہ ایک ملک ہونے کا درجہ حاصل نہیں تھا یا ازبکستان اپنی خصوصی ریاست کے لیے سرگرم جدو جہد تھا اور متحدہ روسی نظام کے ماتحت ہونے کے باعث یہ اپنے وجود یا وقار کی جنگ لڑ رہا تھا۔ بالآخر 1991 میں جب اسے آزادی کا پروانہ ملا تو اس پر مہر لگانے والا یا اسے عالمی افق پر تسلیم کرنے والا پہلا ملک ہندوستان بنا اور سب سے پہلے اس کو آزادی کی مبارک باد پیش کی۔ اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ازبکستان اور ہندوستان کے آپسی مراسم اور رشتے کس قدر مضبوط اور مستحکم ہیں۔

اردو جنوبی ایشیا کی ایک اہم اور بڑی زبان ہے۔ یہ بھارت کی بائیس قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔ دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اس زبان پر بھی کچھ اہم زبانوں کے اثرات نمایاں ہیں۔ مثلاً سنسکرت اور اپ بھرنش کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، ترکی اور ازبیک وغیرہ۔ اگرچہ اردو کی بنیاد کھڑی بولی اور اب بھرنش زبانوں اور بولیوں پر استوار ہے۔ فارسی کا کئی صدیوں تک بھارت میں سرکاری زبان ہونا ایک ایسا عمل ہے جس نے ہندوستانی زبانوں میں اپنے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔

ہندوستان کی زبان پر فارسی کے توسط سے یا بالواسطہ فارسی کے توسط سے اردو پر ازبیک کے اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ گرچہ فارسی اور ترکی کے اثرات ازبیک کے مقابل زیادہ نمایاں ہیں، لیکن ازبیک چونکہ ترکی سے زیادہ قریب ہے پھر بھی ازبیک پر فارسی کے اثرات بہت زیادہ نمایاں ہیں۔ اس لیے بہت سی چیزیں جو ازبیک کے راستے ہندوستان پہنچی جیسے کھان پان، لباس اور زبان جو ازبیک سے تھی لیکن فارسی کے خانے میں چلی گئی، کیونکہ بھارت کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ یہ بھی ہے کہ بہت سی روایتیں جو فارسی اور ازبیک کی مشترکہ تھیں وہ آج اردو کا بھی حصہ ہیں۔

عالمی منظرنامے پر ازبکستان ایک ایسا ملک ہے جس سے اردو زبان وتہذیب کے قدیم ترین رشتے ہیں۔ اس کا آغاز ہندوستان میں ازبکوں کی آمد سے ہوتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے تہذیبی وثقافتی اور لسانی دھارے میں خود کو شامل کر کے ایک نیا رنگ دیا۔ اردو زبان کی لفظیات میں ازبکی الفاظ کا اضافہ کیا۔ نیز حدود سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ اردو زبان کا دائرہ بھی وسیع کیا۔ دوسری طرف ہندوستانی مسلمان جب ازبکستان گئے تو اپنے ساتھ یہ زبان بھی لے گئے۔ اس کے علاوہ ازبکستان کو ہم اس اعتبار سے بھی جانتے ہیں کہ یہ اردو ادب وتہذیب کا بڑا گہوارا بھی ہے۔ اردو تدریس کے لحاظ سے ازبکستان اردو کی ایک اہم بستی ہے۔

آزادی کے بعد ہی ازبکستان کی تاشقند یونیورسٹی میں باقاعدہ السنہ ہند کے نام سے شعبہ قائم ہوگیا تھا جہاں اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تہذیب، تاریخ اور سیاست وغیرہ کے مضامین پڑھائے جاتے تھے، ابتدا میں اس شعبے کے پہلے ہندوستانی استاد مدن تھے جو پہلے اردو پڑھاتے تھے پھر بعد میں ہندی زبان پڑھانے

لگے۔ انھیں روسی زبان میں بھی مہارت حاصل تھی۔

مشرق وسطی میں تاشقند اردو، ہندی تعلیم وتدریس کا ہمیشہ سے عظیم مرکز رہا ہے۔ یہاں کے ادیبوں میں کئی بڑے نام شامل ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب اور ہندی ادب کی نہایت ہی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں رحمان بیردی محمد جانوف، نبی جان محدوف، زینت اللہ عاشور بائف، فتح تیشا بائف، صورت میر قاسموف، طاہر ابراہیموا، آزاد شاماتوف، تاش مرزا، سونیا چیر نیکوا، قربان بیگ، غفور رخصت وغیرہ اولین جماعت تھی جو باقاعدہ مدن جی کے شاگرد تھے اور انھیں کی نگرانی میں اردو زبان سیکھی۔ یہ لوگ بعد میں ازبکستان کے مختلف اداروں میں اردو تدریس کے فرائض پر مامور ہوئے۔ اس کے علاوہ ازبکستان میں موجود اردو ہندی کے چند اور اردو اساتذہ کے نام یہ ہیں پروفیسر الفت محب، مکتوبہ مرتضی خوجہ، ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا، مخلصا صاحبہ، امید صاحبہ، ماہرہ صاحبہ اور مخرم صاحبہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

رحمٰن بیردی محمد جانوف: ازبکستان میں اردو زبان وادب کو فروغ دینے والے رحمٰن بیردی اردو کے بڑے محسن اور سرپرست تھے۔ وہ ازبک اور اردو زبان وتہذیب کے سچے علم بردار تھے۔ اردو زبان وادب کے قواعد کے تمام پہلوؤں پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ساٹھ کی دہائی میں ازبکستان میں اردو کا سب سے بڑا کتب خانہ ان کا گھر تھا جہاں اردو کی نادر ونایاب کتابیں موجود تھیں۔ رحمٰن صاحب بہت کم گو اور منکسر المزاج شخصیت کے مالک تھے ہمیشہ تحقیقی اور علمی کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ انھوں نے باقاعدہ تاشقند کے اسکولوں اور یونیورسٹی کے اردو کورسز کے لیے درسی کتابیں تیار کیں۔ تدریسی اور غیر تدریسی کتابوں کے علاوہ ان کا اہم کارنامہ ترجمہ نگاری بھی ہے۔ انھوں نے اردو شعر وادب کو ازبکی زبان میں منتقل کیا مثال کے طور پر غالب کے اردو دیوان کے منتخب کلام کو ازبک زبان میں پیش کیا۔ اس کے علاوہ پریم چند کے مشہور ناول گئودان کا ترجمہ بھی کیا۔ وہ نہ صرف اردو سے ترجمہ کرتے تھے بلکہ ازبک ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف کے تراجم بھی اردو میں انجام دیتے تھے۔ ان میں علی شیر نوائی۔ عمیر الدین بانده اور جدید ازبک شعرا کے کلام شامل ہیں۔ ان کے اردو سے کیے گئے ترجموں میں پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، سجاد ظہیر جیسے ادیبوں کی تخلیقات قابل ذکر ہیں۔ وہ خود بھی اردو میں شاعری کرتے تھے۔

نبی جان محدوف: ازبکستان میں باقاعدہ سردار جعفری کی شاعری پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے والے پہلے اسکالر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ نہایت ہی ذہین، خوش گفتار، حاضر جواب اور وسیع المطالعہ شخصیت کے ماہر انسان تھے۔ اردو ازبکی اور روسی زبانوں میں یکساں مہارت تھی جس کی وجہ سے وہ اکثر سرکاری وغیر سرکاری پروگراموں میں مترجم کے فرائض انجام دیتے تھے۔ نبی جان ترجمہ نگاری حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ مرزا ہادی رسوا کا شاہکار ناول امراؤ جان ادا کا ترجمہ ازبک زبان میں کیا جو بہت مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ سردار جعفری اور فیض کی شاعری کا بھی ترجمہ انھوں نے کیا۔

زینت اللہ عاشور بائف: تاشقند کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے ممتاز اسکالروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے منٹو کی کہانیوں پر پی ایچ ڈی کی اس کے علاوہ منٹو کی کہانیوں کا

ازبیکستان میں اردو زبان وادب کی تاریخ اور اردو تدریس و تعلیم تقریباً سو سالوں سے بڑے پیمانے پر وہاں کی مختلف یونیورسٹیوں میں باضابطہ ہورہی ہے۔ ازبیکستان میں اردو زبان و ادب کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ سو سال سے زائد عرصے سے وہاں کی یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جا رہی ہے۔ ازبیکستان میں اردو کو نہ صرف ایک زبان کے طور پر پڑھایا جاتا ہے بلکہ اس کے پس منظرمیں قدیم ترین دوستی اور ایثار و قربانی کے جذبے کی پوری تاریخ موجود ہے جسے ازبیکی کبھی فراموش نہیں کرنا چاہتے۔

ازبک میں ترجمہ بھی کیا۔ انھوں نے اردو زبان بہت محنت سے سیکھی اور وہ روانی سے اردو میں باتیں کیا کرتے تھے۔

فتح تیشا بائف: ساٹھ کی دہائی میں ازبکستان سے جن طلبا کی جماعت اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہندوستان آئی تھی ان میں ایک اہم نام فتح کا ہے یہاں دہلی یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور طالب علم رہے۔ بعد میں سرسید کے سماجی افکار کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ازبکستان کے سابق صدر اسلام کریموو کے دور حکومت میں نائب وزیر خارجہ کی ذمے داری نبھائی اس کے بعد امریکہ میں سفیر کے باوقار عہدے پر بھی فائز رہے۔ ازبکستان کی اردو دنیا میں انھوں نے اپنی صلاحیت، محنت اور ذہانت سے جو مناصب حاصل کیے اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

فتح صاحب ہندوستان میں جب ازبکستان کے سفیر بنائے گئے تو سب سے پہلے انھوں نے یہ کوشش کی کہ دونوں ملکوں کے لسانی، ثقافتی اور تجارتی رشتے مزید مستحکم ہوں اور اس کے توسط سے دونوں ممالک کی زبان کو بھی فروغ حاصل ہو۔ اس کے لیے دہلی میں ایک ہند ازبک سوسائٹی بھی بنائی گئی جس کے تحت ازبکستان کے قومی تہوار منانے کے ساتھ ساتھ کئی ادبی وثقافتی سیمنار بھی منعقد کیے گئے۔

طاہر ابراہیموو: طاہر ابراہیموا کا شمار بھی ازبکستان کے نامور اردو ادیبوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان وادب سے ان سے والہانہ لگاؤ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب آپ تاشقند کے ایک اعلی اشاعتی مرکز غفور غلام کے اہم ذمے دار تھے تو آپ کی سرپرستی میں اس ادارے سے کلاسیکی اور جدید اردو ادب کی کئی کتابیں ترجمہ ہوکر شائع ہوئیں۔ جس میں ایک نہایت ہی اہم کام میر امن دہلوی کی داستان 'باغ و بہار' کا ازبک ترجمہ ہے جسے انھوں نے خود کیا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس داستان کا پہلا اڈیشن ساٹھ ہزار شائع ہوا اور چند مہینوں میں ہی یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی۔ در اصل قصہ چہار درویش ازبکستان میں بہت مقبول تھی اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کا ترجمہ بھی آسان اور عام فہم زبان میں کیا گیا تا کہ ہر ایک کو سمجھ میں آسکے۔

آزاد شاماتوف: ازبکستان میں اردو کے حوالے سے پروفیسر آزاد شاماتوف ایک معتبر نام ہے۔ انھوں نے ڈاکٹریٹ کے ساتھ ڈی لٹ کی اعلی سند بھی حاصل کی۔ ان کی صلاحیت اور علمیت کا ہر کوئی معترف ہے۔ درس وتدریس ان کا اصل میدان تھا وہ نہایت ایماندار اور اصول پسند تھے اور شعبے کے دیگر اساتذہ کی تربیت کیا کرتے تھے کہ درس وتدریس اور علمی کاموں میں محنت و جانفشانی سے کام کریں تا کہ طلبا پر اس کا مثبت اثر ہو۔ اردو لسانیات، زبان کی نشو ونما اور اس کی لسانی خصوصیات کے حوالے سے آزاد شاماتوف کا نام سرفہرست ہے۔ آزاد شاماتوف کا اصل میدان دکنیات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی ادب، خصوصی طور پر قطب مشتری اور دیگر دکنی ادبیات کی روشنی میں انھوں نے لسانیات کے حوالے سے اہم کام کیے ہیں علاوہ ازیں دیگر جرائد ورسائل میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان کے اردو شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جو ازبکستان کے مختلف شعبوں میں اردو کے حوالے سے کام کر رہے ہیں جیسے مختلف

اداروں میں درس وتدریس، ٹی وی، ریڈیو کے علاوہ سیر وسیاحت کی جگہیں اور ائیر پورٹ وغیرہ۔ آزاد شاماتوف کو ازبکستان میں اور خاص طور پر ادبی وعلمی حلقوں میں نہایت ہی عزت واحترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

غفور رخصت الالف: ازبکستان کے اردو منظر نامے پر ایک اہم نام غفور رخصت کا ہے۔ ان کا تعلق ایک زمانے تک ریڈیو ازبکستان کے شعبہ اردو سے تھا جہاں وہ نہایت ہی ہنرمندی اور مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے پروگرام کرتے تھے۔ غفور جان تاشقند کی مشرقیاتی یونیورسٹی میں اردو کے استاد بھی رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ جب ازبکستان کے شہر تاشقند میں ماسکو کا اردو اشاعت گھر قائم ہوا تو ان کو اس کی اہم ذمے داری دی گئی اور اس ذمے داری کا حق ادا کرتے ہوئے انھوں نے بے شمار ازبکی شعر وادب کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا۔ اس کے علاوہ خود بھی کئی ازبک ادیبوں کی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا۔

سونیا چیرنیکوا: اردو میں تحقیق کا کام ہمیشہ سے اہم رہا ہے اس اعتبار سے دیار غیر میں سونیا چیرنیکوا ایک نمایاں نام ہے۔ تحقیق کے موضوع پر ان کی کتاب اردو کے صیغے ایک اہم کتاب ہے۔ تاشقند یونیورسٹی میں ایک عرصے تک اردو کی استاد تھیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو پڑھنے، پڑھانے، سیکھنے، سکھانے اور اس زبان کی خدمت وتحقیق میں صرف کردی۔ انھیں اردو محاورے اور قواعد پر غیر معمولی دسترس تھی۔ اردو زبان میں نہایت شائستگی، شگفتگی اور روانی سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ اردو میں مرکب افعال کی اقسام، پر ان کی ایک اہم کتاب موجود ہے جسے انھوں سب سے پہلے روسی زبان میں شائع کرایا پھر بعد میں خود اردو میں منتقل کیا۔

ازبکستان کی کئی یونیورسٹیز میں باقاعدہ اردو زبان کی تدریس ہوتی ہے جن میں مشرقیاتی یونیورسٹی تاشقند اور تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی آف ورلڈ اسٹڈیز کے نام قابل ذکر ہیں۔ ازبکستان میں اردو زبان کی درس وتدریس کا باقاعدہ آغاز تو 1920 میں ہو چکا تھا جب تاشقند میں فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اردو کی بھی تعلیم جاری کر دی گئی تھی۔ لیکن اس وقت اردو شناسی کو زیادہ فروغ حاصل نہیں ہوا اور سب سے پہلے مشرقیاتی یونیورسٹی میں اردو کی پڑھائی شروع ہوئی۔ اس طرح ازبکستان میں اردو تعلیم کا آغاز تو 1920 میں ہی ہوا لیکن حال میں وہاں کی مختلف یونیورسٹیز میں اردو زبان وادب کی تہذیبی تاریخی اور لسانی موضوعات پر باقاعدہ ڈاکٹریٹ بھی ہورہی ہے۔ بعد کے اساتذہ میں ڈاکٹر تاش مرزا، ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا، محترمہ مکتوبہ مرتضی، محترمہ امید صاحبہ اور ماہرہ صاحبہ وغیرہ بھی اہم ہیں۔ ان اساتذہ نے بھی ازبکستان میں اردو زبان کی تعلیم اور اس کی بنیاد کو مستحکم کیا۔

پروفیسر تاش مرزا: ازبکستان میں اردو ادب کے حوالے سے ایک نمایاں نام مشہور شرق شناس، سوویت اور ازبک سفارتکار، ماہر لسانیات، ازبکستان میں اردو کے بڑے محسن استاد ڈاکٹر تاش مرزا صاحب کا ہے۔ تاش مرزا نے ازبکستان میں اردو کو دورنو سے روشناس کرایا۔ اردو میں جو تبدیلی آئی اس کو بھی انھوں نے واضح کیا۔ وہ ساری عمر اردو پر کام کرتے رہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ انھوں نے روسی اردو روسی صفات ترتیب دی اس اہم کاوش پر انھوں نے تیس سال کام کیا۔ اردو زبان کی گرامر، نحو، تاریخ اور تبدیلی پر مرزا صاحب کی کئی کتابیں اور مقالے ہیں۔ جن میں دو لغات بھی شامل ہیں، اردو روسی اور اردو ازبیک ڈکشنری کے علاوہ، اردو ریڈر اور ہندوستان میں اردو کی ترویج کی چند خصوصیات وغیرہ اہم ہیں۔ ڈاکٹر تاش مرزا کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انھوں نے وسطی ایشیا اور خاص کر ازبکستان میں سیکڑوں اردوداں اور ہزاروں ماہرین کی تعلیم وتربیت کی۔ مشرقیاتی یونیورسٹی تاشقند میں اردو کے پروفیسر تھے اب وہ سبک دوش ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا: اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل لنگویجیز تاشقند میں اردو ادب کی استاد اور غالب شناس ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا ایک معتبر نام ہے۔ انھوں نے قدیم اردو کے افعال پر کام کیا۔ محترمہ محیا صاحبہ غالب کی غزلوں کو ازبکی زبان میں، ازبیک زبان میں غالب کی غزلوں کا انتخاب اور امام بخاری کے ملک میں چند روز، نامی سفرنامہ کا ترجمہ کر چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کتابوں میں اردو ادب اور زبان، بابر کے زمانے کی زبان کے علاوہ مختلف جرائد ورسائل میں متعدد مضامین بھی ان کے شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر الفت محب: مرکزی ایشیائی ملک ازبکستان کا شہر تاشقند زمانہ قدیم سے اردو کی تعلیم وتدریس کے لیے اہم مرکز رہا ہے۔ خاص طور پر اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز تاشقند، جہاں 1947 سے ہی اردو ہندی کی تعلیم دی جارہی ہے۔ اس ادارے سے کئی اہم شخصیات وابستہ رہی ہیں جن میں پروفیسر الفت محب صاحبہ کا نام بھی ہے۔ اس وقت وہ اس شعبے کی صدر ہیں۔ بابری عہد کے ادب پر ان کا بڑا اہم تحقیقی کام ہے۔

ڈاکٹر لولا مکتوبہ مرتضی: اردو ازبکستان کی ایک مقبول زبان ہے جس میں ماہرین اردو اساتذہ اور طلبا کی ایک اہم تعداد موجود ہے۔ جن میں لولا مرتضی کا نام بھی اہم ہے۔ تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز میں اردو اور ہندی کی استانی ہیں۔ وہ تقریباً تیس برسوں سے اردو زبان وادب سے وابستہ ہیں۔ اردو زبان کے حوالے سے ان کا خیال ہے کہ یہ بہت ہی خوبصورت اور پیاری زبان ہے۔ وہ اردو نہایت ہی آسانی اور روانی سے بولتی ہیں۔

ان کے علاوہ اور بھی دیگر شخصیات جو اردو زبان وادب کی تدریس سے وابستہ ہیں جن میں ڈاکٹر سراج الدین نورمتو، موجودوہ صادیقوا، سلیمانوا معمورا، شارا حمیدوا تخلصہ، کمالہ ارگاشوا اور محترمہ تمارا خوجائیوا صاحبہ بہت ہی اخلاص اور محنت ومشقت سے درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ ان اساتذہ میں بہت سے ایسے ہیں جن کے مضامین ہند وپاک کے رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ زیادہ تر اساتذہ پی ایچ ڈی کے علاوہ ڈی لٹ کی بھی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ازبکستان میں اردو زبان وادب کی تاریخ اور اردو تدریس وتعلیم تقریباً سو سالوں سے بڑے پیمانے پر وہاں کی مختلف یونیورسٹیوں میں باضابطہ ہورہی ہے۔ ازبکستان میں اردو زبان وادب کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ سو سال سے زائد عرصے سے وہاں کی یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جارہی ہے۔ ازبکستان میں اردو کو نہ صرف ایک زبان کے طور پر پڑھایا جاتا ہے بلکہ اس کے پس منظر میں قدیم ترین دوستی اور ایثار وقربانی کے جذبے کی پوری تاریخ موجود ہے جسے ازبکی کبھی فراموش نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی طور پر ہندوستان اور ازبکستان کی عوام ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور لسانی اعتبار سے اردو اور ازبکی زبانیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ رسم الخط میں تبدیلی کے باوجود ان کے پاس لاتعداد الفاظ، کہاوتیں عام ہیں۔ اسی لیے ازبکی برصغیر کو اپنا دوسرا وطن اور اردو زبان کو اپنا قدیم اور قیمتی اثاثہ وسرمایہ سمجھتے ہیں۔

حوالہ جات

1. ارمغان تاشقند، مرتبہ نوبہار صابر
2. ازبکستان، انقلاب سے انقلاب تک۔ پروفیسر قمر رئیس
3. ماہنامہ انشا، (رسالہ) کولکاتہ، مئی، جون 2007
4. تاشقند کا جوہری، محمد طاہر نقاش
5. ازبکستان اور علی شیر نوائی۔ پروفیسر قمر رئیس

■

Dr. Qurratulain
Bhartiya Bhasha Samiti
Ministry of Education
3rd Floor, A Wing Vishwakarma Bhawan
IIT, Katwaria Sarai
New Delhi- 110016
Mob.:9810102723

اکمل نعیم صدیقی

میرے اشعار میرے اندرون اور بیرون کا آئینہ ہیں: طرب میرٹھی

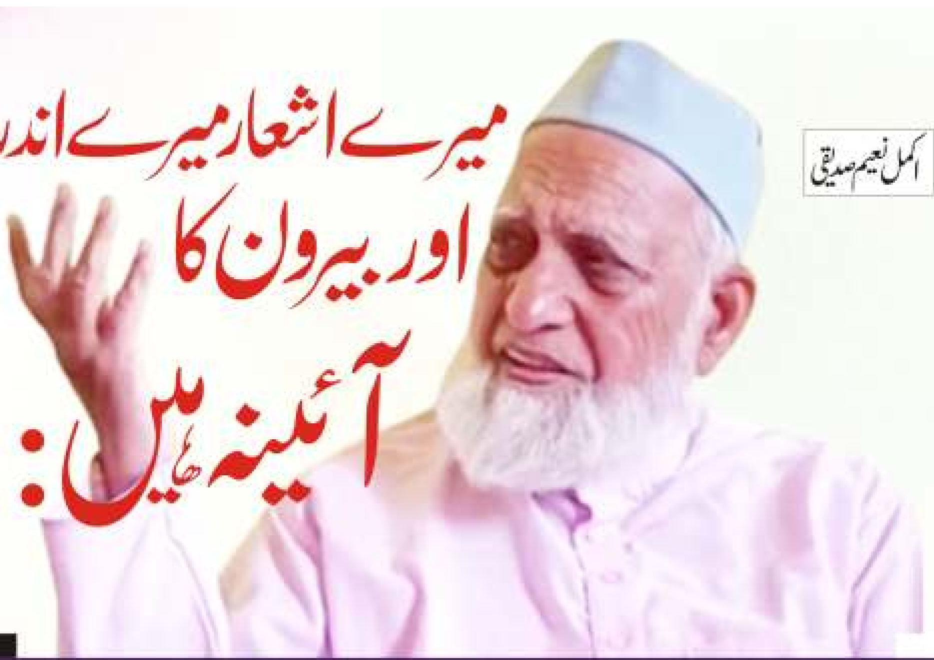

طرب میرٹھی اردو کے ایک معروف شاعرہیں جنھوں نے مختلف شعری اصناف، غزل، نظم، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعیات، قطعات، حمد و نعت اور سھرے میں طبع آزمائی کی ھے۔ ان کے کئی مجموعے شائع ھوچکے ھیں جن میں سازِ طرب، کیف و سرور، سوز باطن اور جذبوں کی آواز شامل ھے۔ انھوں نے بھت سے مشاعرے پڑھے ھیں۔ کل ھند مشاعروں میں ان کے کلام کو سامعین نے پسند بھی کیا ھے۔ ان کا ترنم بھت اچھا ھے۔ ان کی شاعری میں ان کی زندگی کے تجربات اور مشاھدات کا عکس ملتا ھے۔ زندگی جس شکل سے گزرتی رھی اس کی بڑی عمدہ صورت گری انھوں نے اپنی شاعری میں کی ھے۔ ان کی شاعری ان کے مزاج اور طرزِ فکر کا آئینہ ھے۔ اپنے عھد کے ماحول کی بھت ھی عمدہ عکاسی انھوں نے اپنی شاعری میں کی ھے۔ اکمل نعیم صدیقی نے ان کی زندگی کے حالات اور تخلیقی تجربات کے حوالے سے گفتگو کی ھے۔ پیش ھیں اس گفتگو کے کچھ اقتباسات:

غزل کا رنگ نکھاریں گے ہم ہزار طرح
جہاں میں آئے ہیں کچھ کام کر ہی جائیں گے

اکمل نعیم صدیقی: آپ کا اصلی اور مکمل نام کیا ہے؟

طرب میرٹھی: میرا نام حسین احمد ہے اور تخلص 'طرب' ہے۔ میرٹھ کی نسبت سے میں طرب میرٹھی لکھتا ہوں اور اسی نام سے لوگ مجھے پہچانتے بھی ہیں۔

ا ن ص: اپنی زندگی کے ابتدائی ایام کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ط م: میری زندگی کے ابتدائی دنوں میں، بچپن کے دن میرٹھ شہر میں والدین کے سایہ شفقت میں ہنستے کھیلتے ہوئے گزرے۔ میں چونکہ چھ بہنوں کا تنہا بھائی تھا اس لیے میرے ناز نخرے خوب اٹھائے گئے۔ نوجوانی کا دور والد محترم کی سخت مگر مشفقانہ نگرانی میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے گزرا۔ میں نے 1961 میں ہائر سیکنڈری کا امتحان فیض عام انٹر کالج سے پاس کیا۔ مگر 1960 میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے باعث بڑی بہن اور بہنوئی کے گھر، دیوبند ضلع سہارنپور منتقل ہو جانا پڑا۔ وہاں جوانی کے کچھ سال گزارے۔ تعلیم ادھوری رہ گئی۔

ا ن ص: تعلیم کہاں تک حاصل کی؟ ذریعہ معاش کے بارے میں بھی کچھ بتائیں؟

ط م: والدین کے انتقال کے بعد سب کچھ بدل گیا۔ کچھ ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا کہ مجھے بہنوئی کے دفتر 'تجلّی' میں بطور کلرک کام کرنا پڑا۔ اس کے بعد میں نے لائبریری سائنس میں ڈپلومہ کا امتحان پاس کیا۔ 1971 میں، میں جودھپور چلا آیا اور یہاں کے مشہور و معروف ادارے اسحاقیہ اسکول میں میرا تقرر بطور لائبریرین ہو گیا۔ جودھپور میں ہی میں نے ملازمت کے دوران اپنی تعلیم بھی مکمل کی۔ پہلے بی اے کی ڈگری حاصل کی پھر اس کے بعد بی ایڈ کیا اور بعد ازاں اسی ادارے میں اردو استاد کے عہدے پر مجھے تقرری ملی۔ درمیان میں کچھ سال میں اس ادارے سے دور رہا لیکن 1990 میں مجھے دوبارہ اس ادارے نے اردو کی خدمت کا موقع فراہم کیا اور 2000 میں، میں اسی ادارے سے سبکدوش ہوا۔

ا ن ص: شاعری کی طرف آپ کا رجحان کیسے ہوا؟

ط م: شاعری کی طرف رجحان دیوبند کے دوران قیام پیدا ہوا۔ گھر کے ادبی ماحول نے اسے جلا بخشی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ دفتر تجلّی، جہاں میں بطور کلرک کام کرتا تھا، ایک ادبی مرکز بھی تھا۔ جس کی دیکھ بھال میرے ذمے تھی۔ اس میں مختلف شعرا کے مجموعے تھے جن کے مطالعے سے شاعری کے رجحان نے خوب تقویت حاصل کی۔ جن شعرا کے کلام سے میں نے فیض سخن حاصل کیا ان میں میر تقی میر، مرزا غالب، جگر مرادآبادی، حسرت موہانی اور اصغر گونڈوی کے نام قابل ذکر ہیں۔

ا ن ص: اپنے شعری سفر کے دوران آپ کو کن شعرا نے متاثر کیا؟

ط م: اپنے شعری سفر کے دوران مجھے جن شاعروں نے متاثر کیا ان کا ذکر میں آپ سے کر چکا ہوں۔ ان کے ساتھ ساتھ فیض احمد فیض اور ساحر لدھیانوی میرے پسندیدہ شاعر رہے ہیں۔ ساحر صاحب سے ملنے اور فلموں میں گانے لکھنے کے شوق میں 1964 کے آس پاس میں بمبئی بھی گیا تھا۔ ساحر صاحب سے میری ملاقات بھی ہوئی لیکن طبیعت نہ لگنے کی وجہ سے میں واپس لوٹ آیا۔

ا ن ص: شاعری کے ابتدائی دنوں میں آپ نے اپنے کلام پر کس سے اصلاح لی؟ اور آپ کے باقاعدہ استاد کون ہیں؟

ط م: میں نے اپنی پہلی غزل جناب حفیظ میرٹھی صاحب کو بغرض اصلاح پیش کی تو انھوں نے اس نوٹ کے ساتھ واپس کر دی کہ غزل اصلاح کی محتاج نہیں ہے۔ جہاں تک استاد کی بات ہے تو مطالعہ ہی میرا استاد ہے۔ میں نے اپنے کلام پر اس کے بعد کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔

کسی کو رہنما کس لیے بنائیں طرب
رہ حیات میں ہم خود نشان منزل ہیں

ا ن ص: کیا آپ بھی کسی ادبی تحریک کا حصہ رہے ہیں؟ یا

کسی ادبی تحریک کے تاثرات آپ کے کلام میں نظر آتے ہیں؟

ط م: میں کبھی کسی ادبی تحریک کا حصہ نہیں رہا۔ ہاں کچھ اشعار میرے کلام میں کہیں کہیں ناظرین کو ضرور مل جائیں گے جن کا رنگ ترقی پسند تحریک سے میل کھاتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار دیکھیں۔

زر پرستوں نے کبھی سوچا نہ سوچیں گے کبھی
کیوں بغاوت پر یہاں مائل مجھے ہونا پڑا
تمہارا حق جو نہ دے کوئی چھین لو بڑھ کر
تم اپنے حق کی طلب کے لیے خوشی سے لڑو
رہ جائے نہ اب کوئی مکاں تیرہ و تاریک
یہ جان لو سورج کی ضیا سب کے لیے ہے

لیکن ان اشعار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں باقاعدہ طور پر اس تحریک کا رکن رہا ہوں۔

ا ن: کن کن ادبی رسائل میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہا ہے؟

ط م: بیسویں صدی میں میری غزلیں لگاتار دس سالوں تک شائع ہوتی رہیں۔ اس کے علاوہ شاعر، روبی نخلستان جیسے ادبی رسائل میں میری غزلیں شائع ہوتی رہیں ساتھ ہی مختلف اخبارات میں بھی غزلیں شائع ہوتی رہی ہیں۔

ا ن: آپ کا پہلا شعری مجموعہ کون سا ہے؟

ط م: میرا پہلا شعری مجموعہ 1963 میں مکمل ہو گیا تھا اور اس وقت میری عمر 19 سال تھی۔ اس کا نام تھا 'ساز طرب'

ا ن: اس کے علاوہ اور کون کون سے مجموعے ہیں آپ کے؟

ط م: اس کے علاوہ کیف و سرور، سوز باطن اور جذبوں کی آواز بھی شعری مجموعے ہیں۔

ا ن: کبھی فلمی نغمے لکھنے کا خیال نہیں آیا؟

ط م: بالکل خیال آیا، میں نے ابھی ذکر کیا تھا کہ میں گانے لکھنے کے ارادے سے 1964 میں بمبئی گیا تھا۔ ساحر لدھیانوی صاحب سے مراسم تھے تو سیدھے ان ہی کے پاس پہنچا۔ ان سے جب اپنے ارادے ظاہر کیے تو کہنے لگے کہ بمبئی میں کام ملنا بڑا ہی مشکل ہے اور اس سے زیادہ مشکل ہے اس کام کو کرنا یعنی دی گئی دھنوں پر گیت لکھنا۔ بہر حال میں بمبئی زیادہ نہ رک سکا۔ طبیعت گھبرائی اور میں واپس دیوبند لوٹ آیا۔

ا ن: سنا ہے آپ کی آواز بہت بلند تھی اور لوگ آپ کے ترنم کے شیدائی تھے۔ اس بارے میں کچھ بتائیں۔

ط م: جی ہاں، یہ بات سچ ہے کہ میری آواز بہت بلند تھی، بلکہ ابھی بھی بلند ہی ہے۔ اور اتنی بلند ہے کہ مائک کے بنا بھی دور تک سنی جا سکتی ہے۔ ساتھ ہی میری آواز محمد رفیع کی آواز سے مشابہت رکھتی ہے اور میرا ترنم بھی اچھا ہے لہٰذا جب میں ترنم سے پڑھتا تھا تو سامعین بہت غور سے سنتے تھے اور اپنی بھرپور محبتوں سے نوازتے تھے۔

ا ن: آپ نے کن کن شہروں میں مشاعرے پڑھے ہیں؟

ط م: ایک طویل فہرست ہے۔ سب تو اب یاد نہیں لیکن جو جو یاد ہیں اگر ان کا میں ذکر کروں تو اتر پردیش کے چاند پور ضلع بجنور، کرت پور ضلع بجنور، سیوہارا ضلع بجنور، مظفر نگر، میرٹھ، دہرادون، دیوبند، سہارنپور وغیرہ میں، میں نے مشاعرے پڑھے ہیں۔ راجستھان میں جودھپور، پالی، ناگور، اودے پور، کوٹہ، اجمیر، بیکانیر وغیرہ میں بھی میں نے بہت سے مشاعروں میں اپنا کلام پیش کیا ہے۔ اسی طرح آل انڈیا مشاعروں میں بھی شرکت رہی ہے۔

ان میں سے جو میرے ذہن میں اس وقت آ رہے ہیں ان میں چاند پور کا آل انڈیا مشاعرہ جس کی نظامت کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے کی تھی اور اس مشاعرے میں وسیم بریلوی اور بشیر بدر بھی موجود تھے۔ سہارنپور کا آل انڈیا مشاعرہ جس میں بشیر بدر اور نور اندوری جیسے بڑے شعرا موجود تھے، کھتولی کا آل انڈیا مشاعرہ جس میں نواز دیوبندی اور راحت اندوری بھی شامل تھے۔ دہرادون کا آل انڈیا مشاعرہ جس میں تمنا جمالی، عبداللہ راہی اور نواز دیوبندی شریک تھے۔ میرٹھ کا آل انڈیا مشاعرہ جس میں راز الہ آبادی، نور اندوری اور بشیر بدر شریک تھے۔ دیوبند کا آل انڈیا مشاعرہ جس میں علامہ انور صابری بھی شریک تھے۔ اجمیر کا مشاعرہ جس میں پروفیسر عنوان چشتی موجود تھے اور کوٹہ کا آل انڈیا مشاعرہ جس میں راز الہ آبادی، ہلال سیوہاروی وغیرہ شریک تھے۔

ا ن: غزلوں کے علاوہ آپ نے کن کن اصناف میں طبع آزمائی کی ہے؟

ط م: غزلوں کے علاوہ پابند اور غیر پابند نظمیں، قصیدے، مرثیے، مثنوی، رباعیات، قطعات، بچوں کے لیے نظمیں، حمد، نعت اور سہرے، بہت لکھے ہیں۔

ا ن: آپ کی نظر میں ایک اچھے شعر کی کیا تعریف ہو سکتی ہے؟

ط م: اس ضمن میں میرا ایک شعر میرے خیال کی نشان دہی کے لیے کافی ہوگا۔

کوئی خیال انوکھا سا لفظ اچھے سے
مجھے بخوبی خبر ہے کہ شاعری کیا ہے

ا ن: آپ کی شاعری کے دوسرے دور کو اگر دیکھا جائے تو اس میں ایک قسم کا سوز ہے، درد ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ مثلاً آپ کہتے ہیں۔

دور تک زلف کا سایہ ہے نہ آنچل کی ہوا
یہ سفر دھوپ کا کس طرح گزارا جائے

وہ دھوپ ہے کہ پھکنے جا رہے ہیں دیدہ و دل
غم حیات کا سورج ہمارے سر پر ہے

اور

دھوپ حالات کی رکھ دے گی طرح جھلسا کر
سایہ زلف سے نکلوگے تو پچھتاؤگے

شاعری کا یہ رنگ آپ کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے یا پھر یہ میر تقی میر سے مستعار لیا گیا ہے؟ اس کی کچھ حقیقت بیان کریں تو بہتر ہوگا۔

ط م: نہیں یہ رنگ کسی سے مستعار لیا ہوا رنگ نہیں ہے بلکہ یہ اس دور کی میری زندگی کا ہی ایک رنگ ہے۔ آپ خود سوچیں کہ ایک نوجوان لڑکا جس کی دنیا بہت آباد ہو، ہر طرف خوشیاں اور سکون ہو اور اچانک سے اس سے سب کچھ چھن جائے۔ اس کے والدین، اس کا گھر، اس کا شہر، وہ محبتیں اور شفقتیں جو صرف والدین ہی آپ پر نچھاور کر سکتے ہیں، سب کچھ۔ تو اس پر کیا بیتے گی؟ وہ یہی شعر تو کہے گا جو ابھی آپ نے پڑھے۔

دور تک زلف کا سایہ ہے نہ آنچل کی ہوا
یہ سفر دھوپ کا کس طرح گزارا جائے

اس دور کی شاعری کا جو رنگ ہے وہ میری زندگی کے اس دور کی کہانی ہے۔ ہاں میں نے بھی میر کی طرح اسے اپنے سینے میں دبا کر نہیں رکھا بلکہ اسے اپنے اشعار کے ذریعے دنیا کے سامنے رکھ دیا ہے تا کہ کوئی میرے غم کو سمجھے یا نہ سمجھے کم سے کم جس دور سے میں گزر رہا تھا اس دور سے کوئی دوسرا گزرے تو اسے ایک سہارا ملے اور اسے معلوم ہو کہ میں اکیلا ہی نہیں ہوں جو زندگی کے اس مشکل دور سے گزر رہا ہوں، مجھ سے پہلے بھی لوگوں پر یہ حالات آئے ہیں۔ اور جب وہ یہ شعر پڑھے تو شاید اسے بھی قرار آئے کہ۔

بہت عزیز ہے بے تابیوں کی دھوپ مجھے
کسی کی زلف کے سائے سے مجھ کو کیا لینا

میں نے بھی میر کی طرح اپنے اس دور کے یاس کو ذاتی غم نہ بنا کر آفاقی غم بنانے کی کوشش کی ہے۔

ا ن: آپ کی شاعری کے موضوعات میں خودداری ایک اہم موضوع ہے۔ مثلاً آپ کہتے ہیں۔

لطف و کرم کی حسن سے مانگی نہ ہم نے بھیک
خودداریوں کا خون گوارا نہ ہو سکا
ٹھوکر میں زمانہ ہے میری دیکھ لو تم بھی
مغرور سمجھتے ہو میں خوددار بڑا ہوں

اور بھی بہت سے اشعار ہیں۔ کیا یہ واقعی مزاج ہے آپ کا یا صرف شاعری کا ایک رنگ ہے۔

ط م: نہیں یہ مزاج ہے میرا۔ یہ اشعار فطری طور پر میری غزلوں کا حصہ ہیں۔ کچھ بھی مصنوعی نہیں ہے۔ ایک حقیقی ادیب اور شاعر کبھی اپنی تخلیق کو خود سے، اپنے مزاج

سے، اپنے خیالات اور احساسات سے اچھوتا کیسے رکھ سکتا ہے؟ وہ چاہ کر بھی ایسا نہیں کرسکتا۔ کسی ادیب یا شاعر کی تخلیق اس شاعر کے مزاج اور اس کی طرزِ فکر کا آئینہ ہوتی ہے۔ میرے اشعار بھی میری شخصیت میرے اندرون اور میرے بیرون کا آئینہ ہیں۔ اس آئینے میں آپ مجھے صاف طور پر دیکھ سکتے ہیں اور اگر آپ بھی میرے جیسے ہیں تو آپ اس سے مانوسیت اور ہم آہنگی محسوس کرتے ہوئے اس سے محظوظ ہو پائیں گے۔ یہی تو ادب کا خاصہ ہے۔

ارباب جہاں کچھ بھی طرب مجھ کو سمجھ لیں
خوددار قیامت کا ہوں، مغرور نہیں ہوں

ا ن: آپ کی شاعری میں یقیناً سوز و گداز ہے مگر کہیں نا امیدی نظر نہیں آتی ہے۔ کیا یہ آپ کی حوصلہ مند طبیعت کی جانب اشارہ ہے؟

ط م: بچپن سے ہی میں نے زندگی کی دھوپ چھاؤں دیکھی مگر کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔ یہی بات میری شاعری میں نمایاں طور پر ابھر کر آئی ہے۔ میں خدا کی ذات سے کبھی ناامید نہیں ہوا اور نا ہی ناسازگار حالات سے کبھی پریشان ہوا۔ جہد و عمل کو میں نے ہمیشہ اپنا شعار بنایا۔ یہی بات میں اپنے اشعار کے ذریعے قارئین کے سامنے رکھتا ہوں تاکہ انھیں بھی حوصلہ ملے۔ مثال کے لیے چند اشعار دیکھیں۔

تم ان اندھیروں میں سورج کرو کوئی روشن
حسیں اجالوں کو مشکل نہیں ہے پا لینا
زندگی خوف کی بانہوں میں ٹھٹھر جاتی ہے
عزم کر لو تمھیں بے خوف و خطر جینا ہے

اور یہ شعر دیکھیں کہ۔

فکر کس کو ہے آشیانے کی
ہم تو خود برق سے الجھتے ہیں
لوگ کیا زندگی کو سمجھیں گے
موت کے نام سے لرزتے ہیں

ناامیدی سے میری کوئی وابستگی نہیں ہے۔

نہ چھوڑ دامن امید غم کی حالت میں
غروب ہو کے ہی سورج طلوع ہوتا ہے

جدو جہد کی رغبت میرے اشعار میں آپ کو جا بہ جا مل جائے گی۔ شعر دیکھیں کہ۔

بے حسی ایک طرف، ایک طرف جدو جہد
سوچ لو خود ہی ادھر موت، ادھر جینا ہے
بناؤ جہد و عمل کو شعار اپنا طرب
اثر رہا نہیں باقی کوئی دعاؤں میں
رکنے والوں کے لیے موت ہے اس دنیا میں
چلنے والوں کو ہر ایک حال میں چلنا ہوگا
سہارے ساتھ نبھاتے ہیں صرف اک حد تک
وہ کامیاب ہے خود پر جسے بھروسہ ہے

اسی طرح چند اشعار اور دیکھیں۔

انھیں نہیں ہے کوئی حق جہاں میں جینے کا
جو آپ اپنا مقدر بنا نہیں سکتے
ملے نہ تم کو ہی منزل یہ غیر ممکن ہے
دلوں میں شعلۂ عزم جواں کو لے کے چلو
زندگانی کو طرب ہم نے ٹھہرنے نہ دیا
راہ میں یوں تو ملے ہم کو بھی طوفاں کیا کیا

ا ن: آپ کی نظر میں ایک شاعر معاشرے کے لیے کیوں ضروری ہے؟ وہ معاشرے کے لیے کیا کرتا ہے؟

ط م: عوام کی طرح شاعر بھی اپنے عہد اور ماحول کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اس سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ شاعر ایک کام یہ کرتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی خصوصیات اور اپنے عہد کے ماحول کی عکاسی اپنی شاعری کے ذریعے کرتا ہے۔ وہ ماحول سے متاثر تو ہوتا ہی ہے، وہ ان احساسات کو اپنے اشعار میں پیش بھی کرتا ہے جنھیں وہ محسوس کرتا ہے۔ کہیں کہیں شاعر وہ انھیں سیدھا ہی بیان کر دیتا ہے اور بیشتر جگہ انھیں لطیف اشاروں میں بیان کرتا ہے جو نہ صرف شعر کے مقصد کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ اس سے شعر کے حسن میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بہار پاک نہیں ہے خزاں کی سازش سے
کہ پھول کھل کے ابھی مسکرا نہیں سکتے
سمجھ رہے ہیں جو ماحول کے تقاضوں کو
ابھی وہ گیت محبت کے گا نہیں سکتے
حرم و دیر سے نفرت کا دھواں اٹھتا ہے
میکدہ چھوڑ کے نادانوں کہاں جاؤ گے

اور ایک ایسا شعر جو موجودہ وقت پر مکمل صادر آتا ہے۔

اپنا اچھے دنوں پہ حق ہے طرب
دن برے بھی تو ہم نے دیکھے ہیں

ا ن: ایک لمبا عرصہ ہوا آپ کو مشاعروں میں دیکھے ہوئے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر سنے ہوئے یا کسی اخبار اور میگزین میں پڑھے ہوئے۔ سنا ہے آپ نے شاعری کو خیر باد کہہ دیا ہے؟ کیا کسی شاعر کے لیے یہ ممکن ہے؟

ط م: 1984 کے دور میں میرا رجحان قرآن کی جانب ہوا۔ جب میں نے سورہ شعرا کا مطالعہ کیا تو شاعری کو مکمل طور پر ترک کر دیا اور اپنا سارا وقت قرآن کے مطالعے میں صرف کرنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے جلد ہی قرآن کریم کی ایک ضخیم اور بالکل منفرد لغت تیار کی۔ اس کے علاوہ قرآن سے متعلق میں نے کئی کتابیں تحریر کیں جن میں سے کچھ کتابیں مثلاً 'انسان اپنے رب کو پہچان' منظر عام پر آچکی ہیں وہیں دیگر بہت سی کتابیں ای فارمیٹ میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ قرآن سے شغف کے بعد میں نے مشاعروں میں شرکت ترک کر دی اور اپنا سارا وقت قرآن کریم کے مطالعے اور اس کی اشاعت و ترویج کے لیے وقف کر دیا۔ ہاں البتہ کبھی کبھی اصلاحی غزلیں ضرور ہو جاتی ہیں تو انھیں نوٹ کر لیتا ہوں۔ جہاں تک کسی شاعر کا شاعری ترک کر دینے کے سوال کا تعلق ہے تو عرض کر دوں کہ یہ ایک فطری چیز ہے۔ یہ آپ کے لاشعور میں رچی بسی قابلیت اور آپ کا ذوق و شوق ہے اسے شروع کر دینا یا ترک کر دینا آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہاں آپ اس کی سمت کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ شاعری کا تعلق شاعر کے مزاج اور اس کی فکر سے ہے تو پھر جب شاعر کے مزاج اور اس کی فکر میں تغیر و تبدیلی آئے گی تو وہ اس کی شاعری میں بھی نمایاں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں جو غزلیں میں کہہ رہا ہوں ان کا رنگ ذرا مختلف ہے۔

ا ن: نوجوان شعرا کے لیے کوئی مسیج دینا چاہیں گے؟

ط م: اردو شاعری کا جادو خصوصاً غزل کا جادو ہر دور میں سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوانوں کی اس جانب خصوصی دل چسپی رہتی ہے۔ جدید دور کا المیہ یہ ہے کہ اردو شاعری تو سبھی کرنا چاہتے ہیں لیکن اردو سیکھنا کوئی نہیں چاہتا خصوصاً اردو رسم الخط سے ناواقفیت اس قدر عام ہو گئی ہے کہ کئی بار یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ فلاں شخص اردو کا مقبول شاعر ہے لیکن اردو رسم الخط سے ناآشنا ہے۔ اس ناآشنائی نے جو سب سے بڑا ظلم کیا ہے وہ ہے تلفظ کے بگاڑ کا مسئلہ۔ اردو اشعار پڑھے جا رہے ہیں لیکن تلفظ درست نہیں ہے۔ کئی بار بڑی کوفت ہوتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اب تو بڑے بڑے شاعر اپنے مجموعے اور دیوان ہندی رسم الخط میں شائع کروا رہے ہیں۔ فیس بک اور سوشل میڈیا پر غزلیں ہندی یا پھر رومن میں لکھی جا رہی ہیں۔ یہ اردو زبان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس طرح ہم اردو رسم الخط کو ختم کر رہے ہیں اور زبان کے بگاڑ میں اپنا تعاون دے رہے ہیں اس جانب نوجوانوں کو توجہ کرنی چاہیے۔

ا ن: آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے ہمارے قارئین کے لیے وقت نکالا۔ ہم آپ کے بہت ممنون ہیں۔

ط م: آپ کا بہت شکریہ!

■

Akmal Naeem Siddiqui
Faize Aam Masjid, Gali no. 5,
G Sector, Partap Nagar, Jodhpur, Raj. 342001
Mobile No. 9413844624
Mail : vedandquraan@gmail.com

ساحرلدھیانوی
کے فلمی نغموں میں محبت و انسانیت

محمد عطاء اللہ

ساحر ایک فطری شاعر تھے اس لیے انھوں نے فلمی گیتوں کو ہی تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا اور فلمی شاعری اور ادبی شاعری کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے فلمی شاعری کو ادبی شاعری کے ہم پلہ بنادیا۔

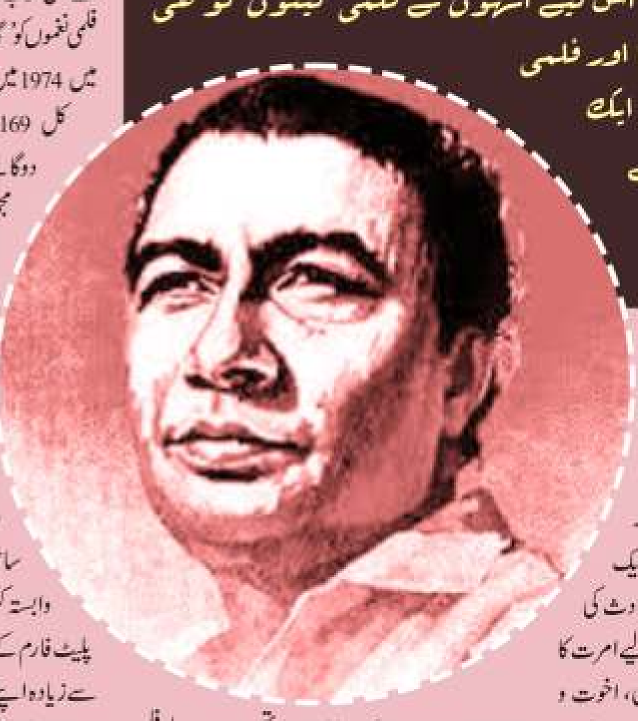

ساحر کے اندر شاعری کی بھرپور صلاحیت موجود تھی اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غزلیں، نظمیں، نغمے، دوہے، حمد، قوالی، بھجن اور دوگانوں وغیرہ کے ذریعے اپنے جذبات و احساسات، افکار و نظریات اور تجربات و مشاہدات کو پیش کر کے اپنے آپ کو ایک مکمل شاعر ثابت کیا۔ ساحر نے تجربات و حوادث کی تلخیاں خود نوش کی، لیکن عوام و خواص کے لیے امرت کا پیالہ پیش کیا۔ اُن کا پورا کلام عظمت انسانی، اخوت و محبت، امن و آشتی اور مذہبی رواداری سے لبریز ہے۔ کلام ساحر کی سحر طرازی نے اپنے معاصرین و متاخرین میں نہ صرف ان کا قد بلند کیا، بلکہ انفرادیت کا وقار بھی عطا کیا۔

ساحر کی شاعری کے موضوعات میں رومان و انقلاب، ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی عکاسی، جبر و استحصال کے خلاف احتجاج، کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کے مسائل، امن و آشتی، انسان دوستی اور مذہبی رواداری وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے کلام کے چار مجموعے تلخیاں، پرچھائیاں، آؤ کہ کوئی خواب بنیں اور 'گاتا جائے بنجارا' ہیں۔ مؤخر الذکر ساحر کے فلمی نغموں کا مجموعہ ہے۔

ساحر کی شاعری کا آغاز زمانہ طالب علمی میں ہی ہوگیا تھا، لیکن ان کی قسمت کا ستارہ اُس وقت اَوجِ ثریا پر مقیم ہوا جب وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے۔ جس وقت ساحر لدھیانوی نے فلمی دنیا میں قدم رکھا اس وقت فلمی نغموں میں رکیک، عریاں، فحش اور گھٹیا قسم کی شاعری ہوتی تھی۔ فلمی شاعری تک بندی اور پھوہڑپن تک محدود تھی۔ فلمی شاعری صرف روزی کمانے کا ذریعہ تھی اور اسی لیے فلمی گیتوں میں معاشرتی تقاضوں اور تہذیبی قدروں کا فقدان تھا۔ ساحر نے شعوری طور پر فلمی نغموں میں ادبیت کی روح پھونکی۔ شروع شروع میں ساحر کو بھی مروجہ فلمی شاعری سے ملتی جلتی شاعری کرنی پڑی، لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اپنی فکری و فنی صلاحیتوں کی بدولت فلمی نغموں کو ادبیت اور سنجیدگی کا معیار بخشا۔ ساحر سے قبل آرزو لکھنوی ہی ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے فلمی نغموں میں کچھ حد تک ادبیت پیدا کرنے کی کوشش کی اور آرزو لکھنوی کے علاوہ شکیل بدایونی، مجروح سلطانپوری، قتیل شفائی اور راجہ مہدی علی خاں نے فلم بینوں کے مزاج اور فلمی نغموں کے معیار کو بدلنے کی کوشش کی لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ ساحر لدھیانوی ہی وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے اکابرین و معاصرین کی کوششوں کو عملی جامہ پہنایا اور فلمی دنیا کو ایسے نغمات عطا کیے جن میں مقصدیت اور پیغام کے ساتھ سماجی، سیاسی اور عصری مسائل کی گونج پہلی بار سنائی دی۔ ساحر نے فلمی نغموں کو ذہنی گندگی، فحاشی و عریانیت سے پاک کر کے صاف ستھرا ادبی ذوق عطا کیا۔

ساحر ایک فطری شاعر تھے اس لیے انھوں نے فلمی گیتوں کو ہی تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا اور فلمی شاعری اور ادبی شاعری کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے فلمی شاعری کو ادبی شاعری کے ہم پلہ بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ساحر کے فلمی نغموں کو عوام کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق رکھنے والوں نے بھی خوب سراہا اور ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ساحر پہلی بار اپنے فلمی نغموں کو 'گاتا جائے بنجارا' کے نام سے کتابی صورت میں 1974 میں منظر عام پر لائے۔ 'گاتا جائے بنجارا' میں کل 169 نغمے شامل ہیں، جو غزل، نظم، دوہے، دوگانے، حمد، قوالیاں اور بھجن، کیرتن وغیرہ کا مجموعہ ہیں۔ اس کتاب کے ابتدائیہ میں اپنی فلمی شاعری کے حوالے سے ساحر لدھیانوی لکھتے ہیں:

''فلم ہمارے دور کا سب سے مؤثر اور کارآمد حربہ ہے، جسے اگر تعمیری اور تبلیغی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے تو عوامی شعور کی نشوونما اور سماجی ترقی کی رفتار بہت تیز کی جاسکتی ہے۔''[1]

ساحر نے فلمی گیتوں کو مسائل حیات سے وابستہ کر کے اپنے مقصد کی ترویج و اشاعت کے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا اور فلمی نغموں کو حصول زر سے زیادہ اپنے مقصد کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ فلمیں چونکہ نشر و اشاعت کا بہترین اور مؤثر ذریعہ تھیں جس سے ساحر نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ ساحر نے فلمی گیتوں میں اپنے مقصد کو شامل کر کے ایک نئی زندگی اور نیا وقار عطا کرنے کے ساتھ فلمی گیتوں کا قلابہ امکانات کی نئی راہوں سے ملا دیا۔ 'گاتا جائے بنجارا' کے ابتدائیہ میں اپنی فلمی نغمہ نگاری کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے ساحر رقم طراز ہیں :

''میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو فلمی نغموں کو تخلیقی شاعری کے قریب لاسکوں اور اس صنف کے ذریعے سیاسی اور سماجی نظریہ عوام تک پہنچا سکوں۔''[2]

ساحر کے فلمی کیریئر کا آغاز فلم 'بازی' اور 'پیاسا' سے ہوا۔ اس کے بعد اپنے فلمی کیریئر میں ساحر نے تقریباً ساٹھ ستر فلموں کے نغمے لکھے جن میں سے بیشتر نغمے آج بھی لوگ گنگناتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ساحر کے فلمی نغموں کے موضوعات میں وسعت اور تنوع ہے۔ 'گاتا جائے بنجارہ' کے نغموں میں جن موضوعات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، ان میں عشق و محبت، استحصالی نظام کے خلاف

احتجاج، انسانی اقدار، امن و آشتی، خود اعتمادی، انسانی زندگی کی ناپائداری، اتحاد و اتفاق اور میل محبت، جنگ آزادی اور عوام کی بیداری، عورت کے تقدس کی پامالی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، سیکولر اقدار اور مذہبی رواداری وغیرہ اہم ہیں۔

مذہبی رواداری پر ساحر کے نغمے لاجواب اور لازوال ہیں جن کی مقبولیت آج بھی برقرار ہے۔ فلم 'برسات کی رات' کی قوالی میں مذہبی رواداری، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، وحدت معبود اور پیام امن کی بات کو ساحر نے مؤثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہ اشعار دیکھیں۔

کعبہ میں رہو یا کاشی میں نسبت تو اسی کی ذات سے ہے
تم رام کہو کہ رحیم کہو، مطلب تو اسی کی ذات سے ہے
یہ مسجد ہے وہ بت خانہ چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو
مقصد تو ہے دل کو سمجھانا چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو
یہ شیخ و برہمن کے جھگڑے سب ناسمجھی کی باتیں ہیں
ہم نے تو ہے اتنا جانا چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو
گر جذب محبت صادق ہو، ہر در سے مرادیں ملتی ہیں
ہر گھر ہے اسی کا کاشانہ چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو

ساحر کا مقصد یہ ہے کہ ہندو مسلمان دونوں بلا تفریق مذہب و ملت آپس میں شیر وشکر ہو کر زندگی گذاریں اور ان کے درمیان مذہب کو لے کر کوئی خلیج باقی نہ رہے۔

ساحر کا ایک مشہور ہندی نغمہ 'تورا من درپن کہلائے' ہے۔ اس ہندی گیت میں ساحر لدھیانوی نے من کی صفائی کا پیغام دیا ہے۔ من، دل یا نفس کو کینہ و بغض اور آپسی عداوت سے پاک صاف رکھنے کی تعلیم تقریباً سارے مذاہب میں ملتی ہے۔ من یا دل ہی وہ جگہ ہے جہاں ایشور یا اللہ کا بسیرا ہوتا ہے۔ اسی لیے کبیر داس نے اپنے ایک دوہے میں دل کو پاک، صاف اور سچائی سے سجانے کی تلقین کرتے ہوئے لکھا ہے۔

سچ برابر تپ نہیں جھوٹ برابر پاپ
جاکے ہردے ساچ ہیں تاکے ہردے آپ

من اگر درپن کی طرح صاف نہیں ہے تو اس دل میں ایشور کا بسیرا نہیں ہوسکتا۔ تورا من درپن کہلائے کا بند دیکھیں۔

بھلے برے سارے کرموں کو دیکھے اور دکھائے
من ہی دیوتا من ہی ایشور من سے بڑا نہ کوئے
من اجیارا جب جب پھیلے، جگ اجیارا ہوئے
جگ سے چاہے بھاگ کوئی لے من سے بھاگ نہ پائے
سکھ کی کلیاں دکھ کے کانٹے من سب کا آدھار
من سے کوئی بات چھپے نا، من کے نین ہزار
جگ سے چاہے بھاگ لے کوئی من سے بھاگ نہ پائے

تورا من درپن کہلائے

انسان کا من ہی اس کے اعمال کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر من صاف ہے تو اس کے سارے اعمال اور کرم درست، ٹھیک اور قابل قبول ہیں ورنہ سب بیکار ہے۔ ساحر نے اپنے اس ہندی گیت کے ذریعے تمام انسانوں کو من صاف رکھنے کا آفاقی درس دیا ہے۔

ساحر کا مشہور زمانہ فلمی بھجن 'اللہ تیرو نام'، 'ایشور تیرو نام' جو فلم 'ہم دونوں' میں شامل ہے، میں بڑی عقیدت کے ساتھ ایشور اور اللہ کو ایک مان کر سب کی خوش حالی اور خیر سگالی کی دعا کی ہے۔ پہلے بھجن کے بند ملاحظہ فرمایئے۔

اللہ تیرو نام، ایشور تیرو نام — سب کو سمتی دے بھگوان
اللہ تیرو نام، ایشور تیرو نام
او سارے جگ کے رکھوالے — سب کو سمتی دے بھگوان
اللہ تیرو نام، ایشور تیرو نام
بلوانوں کو دے دے گیان — سب کو سمتی دے بھگوان
اللہ تیرو نام، ایشور تیرو نام

ساحر نے 'سب کو سمتی دے بھگوان' کہہ کر سارے مذاہب کے لوگوں کے لیے عقل سلیم اور خوش حالی و خیر سگالی کی دعا کی ہے۔ ساحر کا ماننا ہے کہ گیان یا عقل سلیم سے ہی مذہبی منافرت ختم ہوسکتی ہے۔

فلم 'دو کلیاں' کا نغمہ 'بچے من کے سچے سارے جگ کی آنکھ کے تارے' بظاہر بچوں کی نفسیات پر لکھا گیا نغمہ ہے لیکن اس نغمہ میں بڑی گہری معنویت ہے۔ ساحر نے بچوں کے حوالے سے انسانیت، اخوت و محبت اور مذہبی رواداری کا درس دیا ہے۔ دراصل بچے آنکھ کے تارے اور سب کے دلارے اسی لیے ہوتے ہیں کہ ان کے دل صاف ہوتے ہیں اور صاف دل میں بھگوان کا بسیرا ہوتا ہے اس لیے یہ بچے بھگوان کو بھی پیارے لگتے ہیں۔ اگر انسان بھی ان بچوں کی طرح سیدھے، سچے اور صاف بن جائیں تو پوری دنیا سے مذہبی منافرت کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ یہ بند دیکھیں۔

بچے من کے سچے سارے جگ کی آنکھ کے تارے
یہ وہ ننھے پھول ہیں جو بھگوان کو لگتے پیارے
تن کومل، من سندر ہیں، بچے بڑوں سے بہتر ہیں
ان میں چھوت اور چھات نہیں جھوٹی ذات اور پات نہیں
بھاشا کی تکرار نہیں مذہب کی دیوار نہیں
ان کی نظروں میں ایک ہیں مندر مسجد گرودوارے

فلم 'دھول کا پھول' کا نغمہ 'تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا... انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا'' ہر سننے والوں کے کانوں میں نہ صرف رس گھولتا ہے بلکہ گیت سنتے ہی وہ گیت کی مدھروانی میں گم ہو جاتا ہے۔ ساحر کا یہ نغمہ ان کی مثبت فکر کی غمازی کرتا ہے۔ تقسیم ملک کے وقت سرحد کے دونوں طرف مذہب اور ذات کے نام پر قتل و غارت گری کا ایسا ننگا ناچ ہوا کہ شیطان بھی شرمسار ہو گیا۔ مذہب اور ذات پات کے نام پر خون کی جو ہولی کھیلی گئی اُس سے ساحر لدھیانوی نے دل برداشتہ ہو کر یہ نغمہ لکھا اور اس نغمے کے توسط سے آنے والی نسلوں کو یہ درس دیا کہ وہ نہ ہندو ہیں اور نہ مسلمان ہیں بلکہ صرف انسان ہیں۔ بند ملاحظہ فرمائیں۔

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا
مالک نے ہر انسان کو انسان بنایا
ہم نے اسے ہندو یا مسلمان بنایا
قدرت نے تو بخشی تھی ہمیں ایک ہی دھرتی
ہم نے کہیں بھارت کہیں ایران بنایا
نفرت جو سکھائے وہ دھرم تیرا نہیں ہے
انسان کو جو روندے وہ قدم تیرا نہیں ہے
قرآں نہ ہو جس میں وہ مندر نہیں تیرا
گیتا نہ ہو جس میں وہ حرم تیرا نہیں ہے
تو امن کا اور صلح کا ارمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

ساحر اس مذہب کے متلاشی ہیں جہاں نفرت کا ذرہ برابر بھی نام ونشان نہ ہو جہاں نہ کوئی ہندو ہو نہ مسلمان ہو بلکہ صرف انسانیت کا مذہب ہو۔ اس نغمے کے توسط سے ساحر نے صلح کل کا آفاقی پیغام پیش کیا ہے۔

فلم 'چترلیکھا' کا بھجن 'من رے تو کاہے نہ دھیر دھرے'' میں دنیاوی موہ مایا کے چکر سے باہر نکلنے کا درس دیا ہے کیونکہ دنیا کی ساری پریشانیوں کی وجہ موہ مایا ہی ہے۔ یہ بند دیکھیں۔

من رے تو کاہے نہ دھیر دھرے
وہ نرموہی موہ نہ جانے، جن کا موہ کرے
من رے تو کاہے نہ دھیر دھرے

اسی طرح اپنے ایک بھجن میں رام کے جنم اور ان کے بن باس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رام کا اوتار ہر جگ میں ہوتا رہا ہے لیکن دنیا والوں کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر رام کو بن باس اختیار کرنا پڑتا ہے کیونکہ رام کی پوجا سب کرتے ہیں لیکن رام کی تعلیمات پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ دنیا والوں کو اگر رام کا صحیح ارتھ معلوم ہو جائے تو سارے مذہبی جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔ بھجن کے بند ملاحظہ فرمائیں۔

رام ہر جگ میں آئے پر کون انھیں پہچانا
رام کی پوجا کی جگ نے پر رام کا ارتھ نہ جانا
تکتے تکتے بوڑھے ہوگئے دھرتی اور آکاس
جب جب رام نے جنم لیا تب تب پایا بن باس

ساحر لدھیانوی نے بھی رام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے اور رام کے صحیح ارتھ کو سمجھنے کا درس دیا ہے کیونکہ رام کی شخصیت ایک عظیم انسان نمونہ ہے جن سے ہمیں ایثار و قربانی اور محبت واخوت کا درس ملتا ہے۔ اگر ہم رام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں تو ایک صحت مند سماج کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔ ساحر نے اپنے ایک دوسرے گیت میں پریشان حال لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

آنا ہے تو آ راہ میں کچھ دیر نہیں ہے
بھگوان کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ہے

دوسرا مصرعہ تو عوام وخواص میں اس قدر مشہور ہے کہ ہر غمزدہ انسان اپنے آپ کو یا ایک دوسرے کو تسلی دیتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ ''بھگوان کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔''

ایک دوسری جگہ ساحر نے عوام الناس اور مسائل حیات میں الجھے ہوئے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے تمام مسائل کو بھگوان کے سپرد کرنے کی تلقین کی ہے اور بھگوان کے گھر سے انصاف ملنے تک انتظار کرنے کا درس دیا ہے۔ گیت کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جب تجھ سے نہ سلجھیں تیرے الجھے ہوئے دھندے
بھگوان کے انصاف پہ سب چھوڑ دے بندے
خود ہی تیری مشکل کو وہ آسان کرے گا
جو تو نہیں کر پایا وہ بھگوان کرے گا

ساحر نے اپنے فلمی نغموں میں صرف رام یا بھگوان کی تعلیمات کے ذکر پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ کرشن بھگتی اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کی تعلیمات کے ذریعے بھی مذہبی منافرت ختم کرنے کی نہ صرف کوشش کی ہے بلکہ مختلف مذاہب کے مذہبی پیشواؤں اور رہنماؤں کی تعلیمات کو بھی اپنے فلمی نغموں میں پیش کرکے انسانیت کا مذہب اپنانے کا درس دیا ہے۔

ساحر کے یہ تمام نغمے سماجی وطبقاتی تفریق اور مذہبی منافرت کے خلاف ایک مثبت صدائے احتجاج ہیں۔ ان کے فلمی نغموں کی پذیرائی عوام وخواص اور ہر طبقے کے لوگوں میں خوب خوب ہوئی۔ ساحر کی فلمی شاعری کے حوالے سے جاں نثار اختر رقمطراز ہیں:

''کوئی شک نہیں کہ ساحر کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے فلموں کو ایسے گیت دیے جو سیاسی اور سماجی تصور سے لبریز ہیں۔ یہ ایک بڑا قدم ہے جو ساحر نے بڑی دلیری سے اٹھایا۔''[3]

ساحر نے اپنے فلمی نغموں کے ذریعے وہ سب کچھ کر دکھایا جو ایک حساس اور بیدار مغز شاعر یا ادیب کو کرنا چاہیے۔ ساحر کے تقریباً سبھی فلمی نغمے حقائق حیات سے وابستہ ہیں اور اپنے عہد کی زندگی سے براہ راست پیوستہ بھی۔ ساحر نے اپنے مذہبی نغموں کے ذریعے ایک منصفانہ سماجی نظام اور امن عالم کے قیام کی مثبت کوشش کی اور اپنے نغموں کے ذریعے مذاہب کے باہمی ٹکراؤ کو ختم کرنے کی شعوری طور پر کوشش کی۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ ساحر نے فلموں میں بھی آزادانہ طور پر اپنی پسند کی شاعری کی اور فلم کی ضرورتوں کا ایک حد تک ہی خیال رکھا۔ ان کا نقطۂ نظر، ان کے فلمی گیتوں میں صاف طور پر دکھائی اور سنائی دیتا ہے۔ بقول خلیل الرحمن اعظمی:

''ان کے فلمی گیت ایک طرف نغمہ وترنم سے لبریز ہوتے ہیں تو دوسری طرف ان میں نئی کیفیات اور نئے مسائل کا احساس بھی ہوتا ہے۔''[4]

ساحر نے اپنے فلمی نغموں کے ذریعے وہ سب کچھ کر دکھایا جو ایک حساس اور بیدار مغز شاعر یا ادیب کو کرنا چاہیے۔ ساحر کے تقریباً سبھی فلمی نغمے حقائق حیات سے وابستہ ہیں اور اپنے عہد کی زندگی سے براہ راست پیوستہ بھی۔ ساحر نے اپنے مذہبی نغموں کے ذریعے ایک منصفانہ سماجی نظام اور امن عالم کے قیام کی مثبت کوشش کی اور اپنے نغموں کے ذریعے مذاہب کے باہمی ٹکراؤ کو ختم کرنے کی شعوری طور پر کوشش کی۔ ساحر کے سبھی فلمی نغموں میں مقصدیت حاوی ہے۔ ان کے فلمی نغموں میں جہاں سنجیدہ فکری عناصر ہیں وہیں مسرت وبصیرت سے بھی معمور ہیں۔ ساحر ایک شاعر کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کا ایک مفکر ومدبر بھی تھا جس نے اپنے محسوسات کو فلمی نغموں میں ڈھال کر سماجی وسیاسی شعور کا محرک بنا دیا۔

ساحر کی فلمی شاعری ابہام سے پاک ہے۔ ساحر کی شاعری کی بنیاد شدت احساس ہے اور یہی شدت احساس اس کے اسلوب کا حسن بھی ہے۔ ساحر نے اپنے فلمی نغموں کو احساس وفکر اور ادب کا جامہ پہنا کر اپنے اسلوب کے معیار کو برقرار رکھا۔ ساحر کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ فلمی نغموں کو سامعین وناظرین کے مزاج اور حسن سماعت کے پیکر میں ڈھال کر ادبی وقار عطا کیا اور عام فہم اور عوامی زبان میں ایسے مسحور کن نغمے لکھے جس کو عوام وخواص اور ادبی ذوق رکھنے والے سب نے پسند کیا۔ ساحر کی فلمی شاعری کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر ظ۔ انصاری رقمطراز ہیں:

''فلمی موسیقی کو اردو شعر کی زبان دینے میں ساحر کا نام ہمیشہ سرفہرست رہے گا۔''[5]

فلمی شاعری کو معیار و وقار اور شعری محاسن سے مزین کرنے میں ساحر نے کلیدی رول ادا کیا۔ فلمی دنیا کے کیچڑ میں اپنے نغموں کو عریانیت وفحاشی سے پاک کرکے فلمی نغموں کو ایک نیا وژن عطا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ساحر کی شخصیت بھی فلم انڈسٹری میں ایک کنول کے پھول کی طرح ہمیشہ صاف وشفاف رہی اور ایک فاتح کی طرح ساحر کی سربلندی اور انفرادیت کا پرچم فلم انڈسٹری میں لہراتا رہا۔

آج ساحر ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے نغموں کی پرچھائیاں یہ گنگناتے ہوئے ہمارا تعاقب کر رہی ہیں کہ۔

بانٹ کے کھاؤ اس دنیا میں بانٹ کے بوجھ اٹھاؤ
جس رستے میں سب کا سکھ ہو وہ رستہ اپناؤ
اس تعلیم سے بڑھ کر جگ میں کوئی نہیں تعلیم
کہہ گئے فادر ابراہیم

حواشی

1 ابتدائیہ، گاتا جائے بنجارا، ساحر لدھیانوی، رابعہ بک ہاؤس، بخشی مارکیٹ، لاہور، ص 11
2 ابتدائیہ، گاتا جائے بنجارا، ساحر لدھیانوی، رابعہ بک ہاؤس، بخشی مارکیٹ، لاہور، ص 13
3 بحوالہ ساحر لدھیانوی: حیات اور شاعری، سید ضیاء الرحمن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2009، ص 178
4 اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمن اعظمی، علی گڑھ، 1972، ص 117
5 بحوالہ تحفۂ (ساحر لدھیانوی کی حیات اور شاعری کا ایک جائزہ) سید احتشام حسین، بزم ساحر ٹانڈہ، فیض آباد، 1989، ص 158

■

Md Ataullah
Research Scholar, Dept of Urdu
Patna University
Patna- (Bihar)
Mob.:9162715501

اردو/ہندی ناولوں اور ڈراموں پر مبنی فلموں کا مختصر جائزہ

شہزاد بخت خورشید احمد

فلمسازوں کی بنیادی ضرورت ناول کی ایک ایسی کہانی ہوتی ہے جو ول پذیر ہو اور عوامی مزاج سے ہم آہنگ بھی ہو۔ تفریح کے پیش نظر پردۂ سیمیں پر پیش کرنے کے لیے کہانیوں کی تلاش میں سنیما وقتاً فوقتاً تمام زبانوں کے ادب پر منحصر رہا ہے۔

ادب اپنی مقبولیت، شہرت اور عوامی رسائی کے لیے ہمیشہ پردۂ سیمیں کا متلاشی رہتا ہے چونکہ اس کی اس قدر وسیع پیمانے پر نمائش اور پسندیدگی کا کوئی اور موثر ذریعہ میسر نہیں ہے۔ کسی ناول کے مواد یا کہانی کو پردۂ سیمیں پر فلمی شکل میں ڈھال کر پیش کرنا اور عوام کو متاثر کر لینا نہایت مشکل کام ہے، فلم کی کہانی باوجود تمام کوشش کے اگر کلاسک بنتی ہے تو یہ امر مزید پیچیدہ اور توجہ طلب ہو جاتا ہے۔ یہ ہدایت کار کا اپنا وژن ہے کہ وہ کہانی کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے یا نہیں۔ ستیہ جیت رے، رتوک گھاٹک، مرنل سین، اور شیام بینگل جیسے فلم سازوں نے بغیر کسی رکاوٹ کے صفحات پر موجود الفاظ کو اسکرین پر چلتے پھرتے منظر ناموں، جذبات واحساسات سے پُر مکالموں میں تبدیل کیا ہے۔

زیر نظر مضمون میں ہم دیگر زبان و ادب کے مقابلے میں اردو ناولوں کا تذکرہ کریں تو مقام تاسف ہے کہ اردو ناول باوصف تمام اپنا لوہا منوانے میں اس قدر کامیاب نظر نہیں آتے جس کے وہ قرار واقعی مستحق ہیں۔ اس مطالعے کا مقصد اس صد سالہ فلمی منظر نامے میں اردو ناول کی بازیافت اور مستقبل میں امکانات کی تلاش وجستجو سے عبارت ہے۔ تقریباً گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصے یں اردو زبان ادب کی دھاک جہاں مکالمہ نگاری، نغمہ نگاری، منظر نامے اور کہانی کے حوالے سے قائم تھی اب وہ علاقائی زبان و ادب کی رہین منت بن کر رہ گئی ہے۔ اس سلسلے میں از سر نو احیا کے لیے کون سے نتیجہ خیز اور موثر اقدامات کرنے ہوں گے یہ قابل تدبر و تفکر نیز غور طلب مسئلہ ہے۔ بہر کیف یہاں ہم کلاسک ناولوں پر مبنی چند نمایاں ہندوستانی فلموں کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیسے فلموں کے کردار ایک ناول کے محور پر اپنے تاثر کا جلوہ بکھیرتے ہیں۔

ولیم شیکسپیئر کے ناولوں پر مبنی فلمیں

مشہور زمانہ، صاحب اسلوب اور ڈرامہ صنف کے بے تاج بادشاہ ولیم شیکسپیئر کو کون نہیں جانتا؟ برصغیر ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام زبان و ادب کی عوام میں موصوف یکساں مقبول ہیں۔ ذہین ڈرامہ نگار کے ڈرامے زمانہ قدیم سے دنیا بھر کے تھیٹروں میں مختلف زبان و ادب میں پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ معروف بھارتی اداکار نصیرالدین شاہ نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

''جڑیں کھوئی ہوئی نظر آتی ہیں، لیکن ہندی فلم انڈسٹری کی ہر بڑی کہانی شیکسپیئر کی ہے۔''

آیئے ہم ولیم شیکسپیئر کے ڈراموں اور اردو ادب کے ساتھ ساتھ دیگر زبان و ادب پر مبنی ناولوں کی فلمبندی پر ان کی ضمنیات کے ساتھ دیگر بالی ووڈ فلموں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ بالی ووڈ میں ولیم شیکسپیئر کے بہت سارے مداح ملے، جنھوں نے ان کے ڈراموں

مشہور زمانہ،صاحب اسلوب اور ڈرامہ صنف کے بے تاج بادشاہ ولیم شیکسپیئر کو کون نہیں جانتا؟ بر صغیر ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام زبان و ادب کی عوام میں موصوف یکساں مقبول ہیں۔ذہین ڈرامہ نگار کے ڈرامے زمانہ قدیم سے دنیا بھر کے تھیٹروں میں مختلف زبان و ادب میں پیش کیے جاتے رہے ہیں۔

اور کہانیوں (ناولوں) کو بالی ووڈ بلاک بسٹر میں تبدیل کیا۔

ہیملیٹ کا المیہ 1603 میں ڈنمارک کے شہزادہ ہیملیٹ کا المیہ پر مبنی ناول لکھا گیا تھا۔

اس سانحے نے ڈرامے 'حیدر' کو متاثر کیا، جس میں شاہد کپور، شردھا کپور، تبو، کے مینن، اور عرفان خان شامل تھے۔فلم کو وشال بھاردواج اور سدھارتھ رائے کپور نے پروڈیوس کیا ہے، اور اس کے ہدایت کار وشال بھاردواج ہیں۔ یہ تیسری فلم ہے جسے بھاردواج نے شیکسپیئر کے ڈراموں سے اخذ کیا ہے۔

میکبتھ کا المیہ اپریل 1611 میں لکھا گیا تھا۔مقبول اسی پر مبنی ہے۔ ممبئی گینگسٹر کی سیاہ کہانی خونریزی اور فریب سے بھری ہوئی تھی۔ اس فلم میں پنکج کپور، عرفان، تبو، نصیرالدین شاہ، اوم پوری اور پیوش مشرا جیسے کچھ بڑے ہندوستانی سینما ستارے تھے۔ سال 2003 میں ریلیز ہونے والی اس فلم کو بوبی بیدی نے پروڈیوس کیا تھا اور اس کی ہدایت کاری وشال بھادواج نے کی تھی، جنھوں نے فلم کا بیک گراونڈ اسکور بھی کمپوز کیا تھا۔ اگرچہ معاشی طور پر آمدنی میں زیادہ موثر کارکردگی دکھانے میں ناکام رہی، لیکن اداکاری اور ہدایت کاری کے فنی لحاظ سے اس فلم کو ایک سنگ میل سمجھا جاتا ہے۔

اوتھیلو کا المیہ پر اومکارا مبنی ہے۔ یہ فلم بے حد پسند کی گئی، لنگڑا تیاگی، کیسو فرنگی یا اومکارا کے کرداروں نے ہماری زندگیوں میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ اس میں اجے دیوگن، کرینہ کپور، کونکنا سین شرما، سیف علی خان، وویک اوبرائے، نصیر الدین شاہ اور بپاشا باسو نے اداکاری کی۔ 2006 کی فلم کو کمار مانگٹ نے پروڈیوس کیا تھا اور اس کی ہدایت کاری وشال بھادواج نے کی تھی۔

کامیڈی آف ایررز 1594 میں لکھے جانے والے کامیڈی ڈرامے نے چھ تا دس ہندوستانی فلموں کو متاثر کیا ہے۔

دو دونی چار (1968) جس میں کشور کمار اور اسیت سین شامل تھے۔

انگور (1982) سنجیو کمار اور دیون ورما نے اداکاری کی۔ شیکسپیئر کی 'کامیڈی آف ایررز' پر مبنی فلم 'انگور' کی ہدایت کاری گلزار نے کی تھی۔

بھرنتی بلاس (1963 بنگالی فلم) جس میں اتم کمار اور بھانو بندوپادھیائے نے اداکاری کی۔

الٹا پلٹا (1997 کنڑ فلم) جس میں رمیش اراوند اور کریب سوایا نے اس فلم میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔

رام اور شیام دلیپ کمار وحیدہ رحمان نروپا رائے اور پران نے اس فلم میں اداکاری کی۔

رومیو اینڈ جولیٹ 1597 میں لکھا گیا،اس ٹریجڈی ڈرامے نے آج تک کئی بالی ووڈ فلموں کو متاثر کیا ہے۔ رومیو اور جولیٹ سے متاثر ہونے والی کچھ فلموں کے عنوانات درج ذیل ہیں:

بابی (1973) جس میں رشی کپور اور ڈمپل کپاڈیہ تھی۔

ایک دوجے کے لیے (1981) جس میں کمل ہاسن اور رتی اگنی ہوتری نے اداکاری کی۔

صنم تیری قسم (1982) جس میں کمل ہاسن اور رینا رائے شامل ہیں۔

قیامت سے قیامت تک (1988) جس میں عامر خان اور جوہی چاولہ نے اداکاری کی۔

سوداگر (1991) جس میں منیشا کوئرالہ اور وویک مشران شامل تھے۔

عشق زادے (2012) جس میں پرینیتی چوپڑا اور ارجن کپور نے اداکاری کی۔

عشق Issaq (2013) اداکار پرتیک اور عمیرہ دستور اور گولیوں کی راس لیلا: رام لیلا (2013) جس میں دیپیکا پڈوکون اور رنویر سنگھ شامل ہیں۔

منشی پریم چند کے ناولوں پر مبنی فلمیں

شطرنج کے کھلاڑی (1977) ہدایت کار: ستیہ جیت رے۔ شاید منشی پریم چند کے ساتھ فخر بنگال ہدایت کار ستیہ جیت رے کے تعاون سے سب سے زیادہ مشہور، 1977 کی کلاسک فلم شطرنج کے کھلاڑی رہے۔ یہ اودھ بادشاہی کے آخری دنوں اور وقت کے بہاؤ میں پھنسے غیر فعال مردوں کی بے حسی پر مصنف کی کہانی پر مبنی فلم تھی۔ جس میں امجد خان، سعید جعفری، سنجیو کمار، شبانہ اعظمی، فاروق شیخ اور رچرڈ اٹنبرو کی شاندار کاسٹ نے

ستیہ جیت رے کے وژن کے جادو میں اضافہ کیا۔ ستیہ جیت رے کی پہلی ہندی فلم، شطرنج کے کھلاڑی، 1977 میں ریلیز ہوئی تھی۔ یہ فلم منشی پریم چند کی اسی نام کے افسانے پر مبنی ہے اور یہ 1857 میں پہلی جنگ آزادی سے عین قبل 1856 کی کہانی پر بنائی گئی ہے۔ فلم کی کہانی دو رئیسوں کے گرد مرکوز ہے جو شطرنج کھیلنے میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے فرائض اور ذمے داریوں سے غفلت برتتے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے اپنے گھر، اودھ کے الحاق کے خلاف کارروائی کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

غبن (1966) ہدایت کار: رشی کیش مکھرجی۔ نسبتاً زیادہ بالی ووڈش فلم رشی کیش مکھرجی کی غبن (1966) تھی۔ جو منشی پریم چند کے اسی نام کے کلاسک ناول پر مبنی ہے۔ اس میں سنیل دت اور سادھنا نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ ایک اچھے آدمی کی کہانی جو اپنا راستہ کھو دیتا ہے، غبن میں سنیل دت نے تنقیدی طور پر سراہا جانے والا کردار ادا کیا۔

گئودان (1963) ہدایت کار: ترلوک جیٹلی۔ یہ پہلی بار 1936 میں شائع ہوا، 'گئودان' کا شمار ہندی میں لکھے گئے عظیم ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب نے 1963 میں ترلوک جیٹلی کی ہدایت کاری میں بڑے پردے پر اپنا راستہ تلاش کیا۔ راج کمار اور کامنی کوشل، محمود اور شوبھا کھوٹے کے ساتھ معاون کرداروں میں، یہ فلم پریم چند کے ناول کے مطابق تھی۔

فلم مل مزدور: 1934 ہدایت کار موہن بھونانی۔ مشہور مصنف منشی پریم چند کی لکھی ہوئی یہ واحد فلم ہے جس میں انھوں نے ایک مختصر کردار بھی ادا کیا ہے۔ اس فلم کو تنازعات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اس کی کہانی ایک پرہیزگار مل مزدور کے ایک پرجوش بیٹے کی ہے جو مل کا وارث ہوتا ہے اور اپنے کارکنوں کے ساتھ حقارت کا سلوک کرتا ہے۔ یہ اپنی بہن کے ساتھ تنازعات میں رہتا ہے جو اپنے والد کی میراث کو جاری رکھنے کی خواہشمند ہے۔ بہن کے مزدوروں کو اپنے بے راہرو بھائی کے خلاف ہڑتال پر اکسانے کے منظر نے پورے ملک میں خاص طور پر ٹیکسٹائل ملوں کے مرکز ممبئی میں اشتعال انگیز ردعمل کو جنم دیا اور بہت سے معاملات میں طاقت کے استعمال کے ذریعے فلم کو سینما گھروں سے باہر نکالنا پڑا۔ پھر بھی اس نے اُس زمانے میں صنعتی زندگی کے ساتھ ساتھ محنت کشوں کی مشکلات کی ایک واضح، درست تصویرکشی ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ بنارس میں پریم چند کے اپنے پریس کے کارکنوں کو اس فلم کے ذریعے اجرت کی عدم ادائیگی کے خلاف ہڑتال کرنے کی تحریک ملی۔ کتھا سمراٹ پریم چند نے ہندی فلم انڈسٹری کے لیے اسکرپٹ بھی لکھے، لیکن ان کا کیریئر آگے نہیں بڑھ سکا۔ کون سی طنزیہ تحریر ان کی راہ میں حائل ہوئی؟ اس پر کچھ کہنا دشوار ہے۔

ہیرا موتی (1959) 'دو بیلوں کی کتھا' منشی پریم چند کی بہت سی مختصر کہانیوں میں سے ایک ہے۔ کہانی دو بیلوں اور ایک غریب کسان کی زندگی میں ان کی اہمیت کے گرد گھومتی ہے۔ فلم ہیرا موتی (1959) نے ٹکٹ کاؤنٹر پر شاید کوئی نشان نہ بنایا ہو، لیکن اس میں نروپا رائے اور بلراج ساہنی نے کام کیا، جو خود ترقی پسند مصنفین تحریک کی پیداوار تھے۔

سدگتی (1981) 1981 میں، قومی چینل دوردرشن نے ایک فلم بنانے کے لیے ستیہ جیت رے سے رابطہ کیا، اور ماسٹر نے اس کام کے لیے پریم چند کی ایک کلاسک کہانی کا انتخاب کرنے پر مجبور کیا۔ ٹیلی فلم سدگتی ایک 'اچھوت' شخص کی کہانی پر مبنی تھی جو ایک برہمن کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچھوت چاہتا ہے کہ برہمن اس کی بیٹی کی شادی کی رسومات ادا کرے۔ یوں بھی ایسا لگتا ہے کہ منشی پریم چند کی کہانیوں کا ستیہ جیت رے پر گہرا اثر تھا، کیونکہ ان کی دوسری ہندی فلم مصنف کی کہانی سدگتی پر مبنی تھی۔ اوم پوری اور سمیتا پاٹل نے اداکاری کی۔ سدگتی اس ملک میں اچھوتوں کی المناک زندگیوں کا ایک خوفناک واقعہ ہے۔

بازار حسن (2014) (جسم فروشی): گھوش، جیت گوشوامی، اوم پوری اور یشپال شرما، اور دھننجے کمار نے لکھا تھا۔ اس کی کاسٹ میں معروف ٹی وی سٹار ریشمی گھوش بازار حسن میں سمن کے روپ میں نظر آ رہی ہیں۔ جب کہ اوم پوری ان کے والد کشن چند کا کردار نبھا رہے ہیں۔ جیت گوشوامی اور یشپال شرما جیسے اداکار ریشمی گھوش پر مبنی فلم کی ذات بحیثیت سمن، جیت گوسوامی سدان، اوم پوری بطور کشن چند، یشپال شرما بطور گجادھر، راجیشوری سچدیو ویدی کے طور پر فلم میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

پتی پتنی اور وہ (1978) پتی پتنی اور وہ، بی آر چوپڑا کی 1978 کی فلم جس میں سنجیو کمار، ودیا سنہا اور رنجیت کور شامل ہیں، یہ ہندی ناول نگار کملیشور کے ناول 'پتی پتنی اور وہ' پر مبنی ہے۔ کملیشور نے فلم کا اسکرین پلے بھی لکھا، جس کے لیے انھیں فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ فلم ماورائے ازدواجی معاملات پر ایک مزاحیہ انداز کی فلم ہے جس میں مرکزی کردار شادی شدہ ہونے کے دوران اپنے سیکریٹری کے ساتھ ناجائز تعلقات میں مشغول ہو جاتا ہے۔ یہ فلم ان مزاحیہ حرکات کی پیروی کرتی ہے جس میں وہ اپنی بیوی اور سکریٹری دونوں سے سچائی چھپانے کے لیے کرتا ہے۔

گلشن نندا کے ناولوں پر مبنی فلمیں

گلشن نندا بالی ووڈ فلموں کا کافی مشہور و معروف نام ہے۔ ناول نگار گلشن نندا، موجودہ دور کے تجربہ کار پبلسٹی ڈیزائنرز راہل اور ہمانشو نندا کے والد، 60 اور 70 کی دہائی میں اس قدر مقبول تھے کہ ان کے بیشتر ناولوں کو مندرجہ ذیل کامیاب فلموں میں ڈھالا گیا۔

فلم کاجل (1965): گلشن نندا کی کامیابی کی کہانی اسی فلم سے شروع ہوئی جو گلشن نندا کے ناول 'مادھوی' پر مبنی تھی۔

پھولوں کی سیج 1964: یہ ہندوستانی ہندی زبان کی سماجی فلم ہے جسے اندر راج آنند نے لکھا اور ہدایت کاری کی جو گلشن نندا کے اسی نام کے ناول پر مبنی ہے۔

کاجل (کجل) (1965) ایک بالی ووڈ فلم ہے جو گلشن نندا کے ناول 'مادھوی' سے اخذ کی گئی ہے۔

ساون کی گھٹا (1966) ایک بالی ووڈ میوزیکل رومانوی فلم ہے یہ گلشن نندا کے ناول پر مبنی تھی۔

پتھر کے صنم (1967) بالی ووڈ کی ہندوستانی ہندی زبان کی فلم ہے یہ فلم گلشن نندا کے ناول پر مبنی تھی۔

نیل کمل (1968) بالی ووڈ کی یہ بہترین فلم گلشن نندا کے ناول پر مبنی ہے جس کی ہدایت کاری رام مہیشوری نے کی تھی۔

کھلونا (1970) ایک بالی ووڈ میوزیکل رومانی ہے یہ فلم گلشن نندا کے ناول پر مبنی تھی۔

کٹی پتنگ (1971) یہ فلم مشہور ہندی ناول نگار گلشن نندہ کے کٹی پتنگ ناول پر مبنی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ گلشن نندا کو فلم کا اسکرین پلے لکھنے کا موقع ملا۔

شرمیلی (1971) ایک بالی ووڈ میوزیکل رومانی ہے یہ فلم گلشن نندا کے ناول پر مبنی تھی۔

نیا زمانہ (1971) ایک بالی ووڈ میوزیکل رومانی ہے یہ فلم گلشن نندا کے ناول پر مبنی تھی۔ اسے آغا جانی کشمیری نے لکھا۔

داغ (1973) ایک بالی ووڈ میوزیکل رومانی ہے یہ فلم گلشن نندا کے ناول پر مبنی تھی۔

جھیل کے اس پار (1973) ایک بالی ووڈ میوزیکل رومانی فلم ہے یہ فلم گلشن نندا کے ناول پر مبنی تھی۔

جگنو (1973) ایک بالی ووڈ میوزیکل رومانی فلم ہے یہ فلم گلشن نندا کے ناول پر مبنی تھی۔

جوشیلا (1973) ایک بالی ووڈ میوزیکل رومانی فلم ہے یہ فلم گلشن نندا کے ناول پر مبنی تھی۔

اجنبی (1974) ایک بالی ووڈ میوزیکل رومانی فلم ہے یہ فلم گلشن نندا کے ناول پر مبنی تھی۔

چھوٹے سرکار (1974) ایک ہندوستانی بالی ووڈ فلم ہے یہ فلم گلشن نندا کے ناول پر مبنی تھی۔

بھنور (1976) بالی ووڈ کی ایک ہندی فلم ہے گلشن نندا کے ناول پر مبنی ہے اور انھوں نے ہی اسکرین پلے بھی لکھا ہے۔

آزاد (1978) یہ بالی ووڈ ایکشن تھرلر فلم ہے۔ تحریر چمن بھوک، گلشن نندا احسان رضوی وغیرہ کی ہے۔

بڑے دل والا (1983) بالی ووڈ کی ہندی زبان کی ایکشن کرائم ڈرامہ فلم ہے۔ گلشن نندا (کہانی)، سی جے پاوری (اسکرین پلے)، ڈاکٹر راہی معصوم رضا (مکالمے) نے لکھے۔

بندیا چمکے گی (1984) بالی ووڈ ایک ہندوستانی ہندی فلم ہے جسے گلشن نندا نے تحریر کیا تھا۔

بادل (1985) بالی ووڈ کی ہندوستانی ہندی زبان کی ڈرامہ فلم جس میں۔ مکالمے گلشن نندا -اسکرین پلے، موتی ساگر نے لکھے ہیں۔

نذرانہ (1987) بالی ووڈ کی ایک ہندوستانی ڈرامہ فلم ہے، اس میں جے کول کا اسکرین پلے گلشن نندا کی کہانی ہے۔

اردو ناولوں پر مبنی فلمیں

'گرم ہوا' معروف ادیبہ عصمت چغتائی کے ناول گرم ہوا پر مبنی ہے۔

انسان اور گدھا 1973۔ فلم کا مرکزی خیال کرشن چندر کے ناول 'گدھے کی سرگزشت' سے لیا گیا تھا۔

امراؤ جان 1972، 1981، 2006، 2003 امراؤ جان ادا (اردو: اُمراؤ جان ادا) مرزا ہادی رسوا (1857-1931) کے ایک اردو ناول پر مبنی فلم ہے، موافقت: مہندی (1958)، امراؤ جان ادا (1972 فلم)، ایک بالی ووڈ فلم۔ امراؤ جان (2006 فلم)، ایک بالی ووڈ فلم۔

انارکلی/مغل اعظم (1960)۔ سید امتیاز علی تاج (1900-1970) ایک ڈرامہ نگار تھے جو چچا چھکن جیسے لافانی کردار کے خالق تھے جنھوں نے اردو میں انارکلی ڈرامہ لکھا۔ انھیں ان کے 1922 کے ڈرامے انارکلی کے لیے یاد کیا جاتا ہے، جو انارکلی کی زندگی پر مبنی ہے،

جسے سیکڑوں مرتبہ اسٹیج کیا گیا تھا اور اسے ہندوستان اور پاکستان میں فیچر فلموں کے لیے ڈھالا گیا تھا، جس میں ہندوستانی فلم مغل اعظم (1960) بھی شامل تھی۔

کاماسوترا (1996) اس فلم کو میرا نائر نے مشترکہ طور پر لکھا اور ہدایت کاری کی۔ فلم کا پہلا حصہ ہندوستانی مصنفہ واجدہ تبسم کی اردو میں ایک مختصر کہانی 'اترن' (Hand Me Downs) پر مبنی ہے۔

متفرق ناول نگاروں کے ناولوں پر مبنی فلمیں

چتر لیکھا (1941، 1964) یہ فلم بھگوتی چرن ورما کے لکھے ہوئے ہندی ناول چتر لیکھا پر مبنی ہے۔

بہو کی آواز (1985) یہ فلم وید پرکاش شرما کے ناول 'بہو مانگے انصاف' پر مبنی ہے۔

تمس (1988) یہ بھیشم ساہنی کی 1975 کی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ کتاب، تمس پر مبنی ہے۔

محلہ آسی (2018) محلہ آسی ایک 2018 کی بالی ووڈ فلم ہے۔ یہ فلم کاشی ناتھ سنگھ کے 2004 کے ہندی ناول کاشی کا آسی پر مبنی ہے۔

دیوداس 2 200 ,1950۔ فلم دیوداس بنگالی ناول نگار سرت چندر چٹوپادھیائے کے لکھے ہوئے ناول پر مبنی ہے۔

پرینیتا (2004) فلم پرینیتا بنگالی ناول نگار سرت چندر چٹوپادھیائے کے لکھے گئے ناول پر مبنی ہے۔

صاحب، بیوی اور غلام (1962) بالی ووڈ کی فلم 'صاحب، بیوی اور غلام' بنگالی مصنف بمل مترا کی لکھی ہوئی 'صاحب، بیوی اور غلام' پر مبنی ہے۔

فلم گائیڈ۔ (1965) مصنف آر کے نارائن (مالگوڈی ڈیز فیم) کے لکھے گئے ناول پر مبنی فلم ہے۔

فلم داغ ایک انگریزی ناول نگار تھامس ہارڈی کے لکھے ہوئے ناول 'دی میئر آف کاسٹر برج' پر مبنی فلم ہے۔

فلم جنون (1978) رسکن بانڈ کے ناول 'اے فلائٹ آف دی پیجنز' پر مبنی فلم ہے۔

فلم پنجر امرتا پریتم کے لکھے گئے ناول 'پنجر' پر مبنی فلم ہے۔

فلم تھری ایڈیٹس چیتن بھگت کے لکھے گئے ناول '5 پوائنٹ سمون' پر مبنی فلم ہے۔

فلم کائی پو چے۔ چیتن بھگت کے ناول 'دی تھری میسٹیکس آف مائی لائف' پر مبنی فلم ہے۔

فلم تیرے میرے سپنے اے جے کرونین کے لکھے ہوئے ناول 'دی سیٹاڈل' پر مبنی فلم ہے۔

فلم ہیلو، چیتن بھگت کے لکھے ہوئے ناول 'ون نائٹ @ دی کال سینٹر' پر مبنی فلم ہے۔

فلم عائشہ، جین آسٹن کے ناول 'ایما' پر مبنی فلم ہے۔

فلم نیم سیک ہندوستانی امریکی مصنف جھمپا لہری کے لکھے ہوئے ناول پر مبنی میرا نائر کی ہدایت کاری میں تیار فلم ہے۔

فلم بلیو امبریلا، رسکن بانڈ کے لکھے گئے ناول پر مبنی ہے جسے 'دی بلیو امبریلا' کہا جاتا ہے۔

فلم بلیک فرائیڈے، ایس حسین زیدی کے لکھے گئے ناول پر مبنی ہے۔

فلم 'ہزار چوراسی کی ماں' مہاشویتا دیوی کے ناول پر مبنی تھی۔

فلم سورج کا ساتواں گھوڑا، ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی کے لکھے ہوئے ناول پر مبنی ہے۔

فلم رودالی، مہاشویتا دیوی کے لکھے ہوئے ناول پر مبنی ہے۔

فلم معصوم، ایک امریکی مصنف ایرچ وولف سیگل کے لکھے گئے ناول 'مین وومن اینڈ چائلڈ' پر مبنی ہے۔

فلم چھوٹی بہو، سرت چندر چٹوپادھیائے کے لکھے ہوئے بنگالی ناول 'بڑی دیدی' پر مبنی ہے۔

فلم چھوکھر بالی، رابندر ناتھ ٹیگور کے لکھے ہوئے ناول پر مبنی ہے۔

فلم موسم، اسکاٹش ناول نگار اے جے کے لکھے ہوئے ناول 'دی جوڈاس ٹری' پر مبنی ہے۔

فلم اپنے پرائے، بنگالی ناول نگار سرت چندر چٹوپادھیائے کے ناول 'نشکرتی' پر مبنی ہے۔

فلم 'لٹیرا' (1907) او ہنری کے لکھے گئے ناول 'دی لاسٹ لیف' پر مبنی ہے۔

فلم '2 اسٹیٹس' یہ چیتن بھگت کے ناول '2 سٹیٹس' پر مبنی ہے۔

سات خون معاف، رسکن بانڈ کے ناول 'سوزانا کے سات شوہر' کو وشال بھاردواج کی بالی ووڈ فلم' کے روپ میں پیش کیا ہے۔

سانوریہ، سنجے لیلا بھنسالی کی طرف سے خوبصورتی سے تصویر کی گئی جادوئی کہانی ہے۔ یہ کہانی فیوڈور دوستوفسکی کی مختصر کہانی 'وائٹ نائٹس' سے متاثر ہے۔

تیرے میرے سپنے (1971) تیرے میرے سپنے (1971) وجے آنند (دیو آنند کے بھائی) کی لکھی اور ہدایت کاری میں دیو آنند کی پروڈیوس کردہ فلم ہے، کرونن کا 'دی سیٹاڈل'، طبی اخلاقیات کے متنازعہ موضوع پر گھومنے والا ایک ناول ہے۔

ارتھ (1998) دیپا مہتا کی یہ فلم 'ارتھ' تقسیم ہند کی ہولناک واقعات کے گرد بنائی گئی بپسی سدھوا کے ناول 'کریکنگ انڈیا' پر مبنی یہ فلم ہے۔

زبان و ادب کے ناولوں پر مبنی فلموں کے تاریخی پس منظر اور زمانہ حال کے منظر نامے کا تفصیلی مطالعہ کرنے پر اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ اردو ادب جتنا فنی طور پر زرخیز، دلچسپ اور تخلیقیت کے جوہر سے مالا مال ہونے کے باوجود فلمی دنیا میں اپنا لوہا منوانے میں دیگر زبانوں کی بہ نسبت یکسر ناکام نظر آتا ہے۔

■

Shahzad Bakht Ansari
238, New Ward, Mamletdar Lane
Malegaon- 423203 (Maharashtra)
Mob.:9326595753

میسرو اختر

کلامِ درد کا ہمہ جہت رنگ

شاعری ایسا کمال نہیں جس کو مرد اپنا پیشہ بنا لے اور اس پر ناز کرے البتہ انسانی ہنروں میں ایک ہنر ہے بشرطیکہ صلہ حاصل کرنے اور دربدر پھرنے کا آلہ نہ بنے اور مدح وہجو دنیا کمانے کے لیے نہ کرے ورنہ گداگری کی ایک صورت ہے اور طماعی وبدنفسی کی دلیل ہے۔

خواجہ میر درد (1721-1785) بے پناہ خوبیوں کے مالک تھے، ان کے علم وعمل، تخلیقی صلاحیت، شعری کمالات، روحانی اوصاف کا معاصرین اور بعد کے لوگوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور ہمیشہ ان کے نام اور کام کو ادب واحترام سے یاد کیا ہے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ہی درد ان کی جگہ سجادہ نشینی کے منصب پر فائز ہوگئے اور والد ماجد سے علوم رسمیہ وعقلیہ کی شکل میں جو اکتساب فیض کیا اور زہد وتقویٰ، قوت باطنی، روشن ضمیری اور حق پرستی کے جو انمول نقوش والد سے اخذ کیے، اس پر کاملاً بھروسہ کرکے پوری زندگی عمل پیرا رہے اور شرعی احکام کی پاس داری سے سرمو انحراف نہ کیا۔ تصوف اور سلوک کے راہ پر گامزن ہوتے ہوئے کبھی بھی اپنے اہل وعیال سے منہ نہیں پھیرا اور نہ ان کی ضروریات سے کبھی بھی اپنے آپ کو الگ کیا۔ اتنا ضرور ہے کہ دنیا اور علائق دنیا سے اپنے آپ کو الگ ضرور کیا اور خلوت نشینی کو اپنی زندگی کا محور بنایا مگر اس کے پیچھے کئی وجہیں تھیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’خرابی دنیا عجیب وادیِ نامرادی ہے کہ کتنے ہی نامورانِ ذیشان اس بیاباں میں اس طرح گم ہوئے کہ ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا، سرائے دنیا طرفہ مکان بے اماں ہے کہ بہت سے مسند نشینوں نے کامیابی کا بس اس قدر حصہ پایا کہ اب ان کی شان وشوکت کا ذرہ بھی اثر ہویدا نہیں۔ اس لیے میرا اور تیرا ہونا یا نہ ہونا جو حشرات الارض کی پیدائش کی طرح ہے۔ اعتبار کس شمار وقطار میں ہے۔ جبکہ ابنائے صاحب امت اور سلاطین ذی مملکت آخرکار پردہ خفا میں جا چھپے، دوسرے کس خیال میں ناموری چاہیں اور بقائے نام کے لیے جدوجہد کریں۔‘‘[1]

زمانے کے ناموافق سیاسی حالات اور سماجی خلفشار کی وجہ سے درد نے اپنے آپ کو دنیا کی آلائشوں سے الگ کیا اور علائق دنیا سے دوری اختیار کرتے ہوئے عین جوانی کے ایام میں تصوف اور سلوک کی طرف مکمل طور پر گامزن ہوگئے۔ درد کے نزدیک باطنی ترقیات کا انحصار اس بات پر ہے کہ بندہ پہلے اپنے دل کو آلائش دنیا کی گرفتاری سے آزاد کرے اور دل کی کدورتوں کو دور کرے تاکہ تجلیات الٰہی دل کے آئینے میں منعکس ہوسکیں چناں چہ مابعد الطبیعاتی افکار وخیالات میں کھو جانے کے بعد تاحیات کبھی بھی مکروہات دنیا کی طرف ملتفت نہ ہوئے جس کے اثرات ان کی شاعری اور دوسری تصانیف میں بھی نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر نے ان کے شعری محاسن اُجاگر کرنے میں تصوف ومعرفت کے نقوش کو سرفہرست رکھا ہے۔ ہاں چند نقاد اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے کتراتے رہے جن میں مجنوں گورکھپوری، شمس الرحمان فاروقی، رشید حسن خاں اور خلیل الرحمان اعظمی نمایاں ہیں۔ ان تمام نے خواجہ میر درد کو خالصتاً صوفی شاعر ماننے سے انکار کیا ہے، حالانکہ اس بات کو ضرور مانتے ہیں کہ درد عملاً صوفی ضرور تھے۔ ان کا تعلق ایک ایسے خانوادے سے تھا جہاں تصوف ومعرفت کی شمع جل رہی تھی۔

خواجہ صاحب کی تصانیف بالخصوص فارسی تصانیف متصوفانہ خیالات اور طریقت ومعرفت کے مباحث سے لبریز ہیں اور ان کے مطالعے کے بعد اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علمی، عملی اور فکری سطح پر وہ تصوف کے اعلیٰ مدارج پر فائز تھے۔ ’واردات‘ رسالے میں درد نے باطنی مشاہدات اور قلبی واردات کو رباعی کی ہیئت میں بیان کیا ہے اور اس میں تشریحی نثر کے ذریعے ان رباعیات کی وضاحت بھی ملتی ہے اور تصوف وسلوک کے مشکل مقامات کو نثری اسلوب میں آسان بنا کر بیان کرنے کی کوشش بھی نمایاں ہے اور دوسری اہم تصنیف ’علم الکتاب‘ ہے۔ اس میں بھی مابعد الطبیعاتی مباحث کی کثرت ہے گویا ’واردات‘ میں بیان واردات کی تشریح اور وضاحت ہے۔ اس مایہ ناز تصنیف کے تعلق سے پروفیسر قاضی جمال صاحب بیان کرتے ہیں:

’’میر درد کے متصوفانہ افکار وتصورات کا جامع ترین مظہر اور ان کی شاہکار تصنیف ’علم الکتاب‘ ہے۔ درد نے پہلی بار شرح وبسط کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار اس کتاب میں کیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب واردات میں بیان شدہ اجمالی مطالب علم کی تفصیل وتشریح کے لیے لکھی گئی ہے لیکن مباحث کی کثرت اور مضامین کے تنوع کے پیش نظر اسے درد کی دیگر تصانیف میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ایک سو گیارہ واردات کے اجمالی مطالب کی تشریح نے بڑے سائز کچھ سواٹھ تالیس صفحات پر مشتمل ایک مستقل تصنیف کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ’علم الکتاب‘ اپنے مباحث اور پیشکش کے طریقے کی وجہ سے سیرو سلوک کے بحرِ ذخار کی حیثیت رکھتی ہے۔‘‘[2]

علم الکتاب کے بعد درد نے تصوف وسلوک کے مسائل سے متعلق چار اور رسالے تصنیف کیے۔ نالۂ درد، آہ سرد، درد دل اور شمع محفل۔ یہ چار رسالے بھی وقتاً فوقتاً قلوب واذہان میں بعض کلمات جو ان کو پریشان کرتے اور ان کے دل حیران میں آتے رہتے، ان کو ضبط تحریر میں

لاتے رہتے۔ 'نالۂ درد' تین سو اکتالیس نالوں پر مشتمل ہے اور ہر نالہ مختلف مضامین اور حکمت کی باتوں پر مشتمل ہے جس سے درد کے صوفیانہ خیالات اور مذہبی تصورات پر روشنی پڑتی ہے۔ 'آہ سرد' کا اسلوب بھی نالۂ درد کی طرح سادہ اور بے تکلف ہے اور انابت الی اللہ اس رسالے کا بھی موضوع ہے۔ اس رسالے میں بھی 'آہ' کی 143 سرخیاں ہیں۔ ہر آہ کے ذیل میں درد نے اپنی مختلف تعلیمات پر روشنی ڈالی ہے۔ 'درد دل' میں بھی 'درد' کی مجموعی تعداد پچھلے دونوں رسالوں کی مانند '143' ہے۔ اس رسالے میں تجربات کے تنوع کی کمی اور تجربات کی دلکشی کے بجائے ایک ایسے سالک کی تعداد سفر ہے جس نے سلوک کی آخری منزلیں طے کی اور طویل سفر ختم کرنے کے بعد چند الفاظ میں اپنے تجربات کا خلاصہ بیان کرنے کی کوشش میں سرگرم نظر آئے۔

'شمع محفل' اپنے صوفیانہ مباحث اور مجرد کیفیات کے بیان کے سبب پچھلے رسالوں سے مختلف بھی ہے اور دشوار بھی۔ اس میں جملے نسبتاً زیادہ طویل اور مضامین پیچیدہ ہیں۔ نجی تجربات اور شخصی احساسات کے بجائے مسائل تصوف اور پیچیدہ مضامین اور محمدی مشرب کے اہم تصورات پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔

درد کے معاصرین اور بعد کے ادبا اور محققین نے درد اور ان کی شاعری کے بارے میں مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے مثلاً میر تقی میر نے، جو اپنے سوا کم ہی کسی کو خاطر میں لاتے تھے، انھیں ریختہ کا 'زور آور شاعر' کہتے ہوئے انھیں 'خوش بہار گلستان سخن' قرار دیا۔ محمد حسین آزاد نے کہا کہ درد تلواروں کی آبداری اپنے نشتروں میں بھر دیتے ہیں، مرزا لطف علی صاحب، 'گلشن سخن' کے مطابق درد کا کلام 'سراپا درد و اثر' ہے۔ میر حسن نے انھیں 'آسمان سخن کا خورشید' قرار دیا، پھر امداد اثر نے کہا کہ معاملات تصوف میں ان سے بڑھ کر اردو میں کوئی شاعر نہیں گزرا اور عبد السلام ندوی نے کہا کہ خواجہ میر درد نے اس زبان (اردو) کو سب سے پہلے صوفیانہ خیالات سے آشنا کیا۔ جن لوگوں نے کلام درد میں متصوفانہ افکار و خیالات کی کثرت سے ہونے کا انکار کیا ہے ان میں شمس الرحمٰن فاروقی پیش پیش ہیں ان کا کہنا ہے کہ

"یہ ضروری نہیں کہ شاعر اگر اپنی ظاہری زندگی میں صوفی یا مولوی یا فلسفی یا تاجر ہو تو اس کی شاعری بھی صوفیانہ مولویانہ، فلسفیانہ یا تاجرانہ ہو۔ درد کو صوفی شاعر ثابت کرنے کے لیے شہادتیں ان کے کلام سے ڈھونڈنی ہوں گی... درد کے چھوٹے سے دیوان میں چوں کہ نام نہاد صوفیانہ مضامین کچھ زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں اس لیے درد کی عملی صوفیت سے منسلک ہو کر اس نتیجے کی ترتیب لازم تھی کہ درد ایک زبردست صوفی شاعر تھے۔"[3]

رشید حسن خاں نے بھی ایسی بات کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصوف سے لبریز مضامین والے اشعار، دوسرے مضامین والے اشعار کے سامنے کم بلیغ نظر آتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

"درد کے جن اشعار میں خالص تصوف کی اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں یا جن میں مجازیات کو صاف صاف پیش کیا گیا ہے وہ نہ درد کے نمائندہ اشعار ہیں نہ ہی اردو غزل کے۔ یہ بات ہم کو مان لینی چاہیے کہ اردو میں فارسی کی صوفیانہ شاعری کی طرح بلند پایہ متصوفانہ شاعری کا فقدان ہے۔ ہاں، اس کے بجائے اردو میں حسرت، تشنگی اور یاس کا جو طاقتور آہنگ کارفرما ہے، فارسی غزل اس سے بڑی حد تک خالی ہے۔"[4]

بہرصورت تمام آرا سامنے آنے کے بعد بھی کسی نے ان کے کلام میں تصوف کے مضامین کے نہ ہونے کا قول نہیں کیا ہے اور نہ کبھی کوئی اس کا بالکلیہ انکار کر سکتا ہے۔ اس تعلق سے ان کی بہت ساری نثری تصانیف کا اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ ان کے شعری شہ پارے میں اس کے نمونے کثرت سے ملتے ہیں۔

تمام طرح کے نقوش اور امثال کے باوجود ایک خود دار شاعر کی طرح انھوں نے شعر و شاعری کو کبھی اپنا پیشہ نہیں بنایا اور نہ کسی دربار سے وابستہ ہو کر ان کے مدح وستائش میں شعر کہے۔ داد و دہش سے اپنے آپ کو ہمیشہ دور رکھا اور بس اپنی شخصیت کی سرخروئی اور قلبی کیفیات کی تسکین کے لیے اپنی فنکاری کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اپنی دنیا میں مست ہو کر شاعری کی اور اسے واردات قلبی کی تسکین کا وسیلہ بنایا۔ وہ بذات خود نظریۂ شعر اور غایت شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاعری ایسا کمال نہیں جس کو مرد اپنا پیشہ بنا لے اور اس پر ناز کرے البتہ انسانی ہنروں میں ایک ہنر ہے بشرطیکہ صلہ حاصل کرنے اور دربدر پھرنے کا آلہ نہ بنے اور مدح و ہجو دنیا کمانے کے لیے نہ کرے ورنہ گداگری کی ایک صورت ہے اور طماعی و بدنفسی کی دلیل ہے۔"[5]

صوفیائے کرام کے نزدیک دنیا اور عناصر دنیا کے تمام ہنگامے عدم محض ہیں یا ان کا وجود اضافی اور اعتبار محض ہے اور حقیقی وجود صرف ذات باری کا ہے اور دنیا کے موجودات اس حقیقی وجود کے مختلف جلوے ہیں۔ صوفیا کو جب طریقت و سلوک کی راہ چلتے چلتے کو وجود وشہود کی نسبت میسر ہوتی ہے تو وہ وجود مطلق کی ذات کے مشاہدے میں خود کو گم کرتے ہیں اور حقیقت حال کے انکشاف سے خود کو سرشار پاتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے خود کو فنا کرنا۔ اس کا مطلب ہے کہ نفس اور خواہشات نفس کو مات دینا۔ 'موتوا قبل ان تموتوا' (یعنی موت سے پہلے مر جاؤ) کا مفہوم بھی یہی ہے کہ خواہشات نفسانی کو مات دینے کے بعد ہی دل کی حقیقی حیات ہے ورنہ حرص و ہوس کی اتباع دل کو مردہ کر دیتی ہے اور انسان کی غفلت یا اس کا ہوا و ہوس کی زنجیروں میں جکڑ جانا دراصل معشوق حقیقی کے دیدار کا مانع ہے۔ علائق دنیا کی کدورتوں سے پاک کرنے کے بعد محبوب کا دیدار ممکن ہے۔ درد نے سلوک کی اس کیفیت کو شعری تجربے میں محسوس کیا اور اسے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ اس طرح کے مسائل کے بیان میں صفائی اور سادگی کے ساتھ انھوں نے مختصر الفاظ کے استعمال کا بھی بہت ہی خاص خیال رکھا ہے۔ اسی وجہ سے درج ذیل اشعار سہل ممتنع کی بہترین مثال قرار دیے جا سکتے ہیں۔

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے
تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے
جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی نظر آیا جدھر دیکھا
وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال، تجھے منہ دکھا سکے
نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے
ساقیاں لگ رہا ہے یاں چل چلاؤ
جب تک بس چل سکے ساغر چلے

تصوف کے موضوع پر علم الکتاب اور رسائل اربعہ جیسی عالمانہ تحریریں نیز صوفیانہ مزاج اور شخصیت کے باوجود درد کی شاعری، سلوک کے مختلف مقامات کے بیان میں تصوف کی اصطلاحات و حقائق سے بوجھل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ درد کے مختصر شعری سرمایے کا معتد بہ حصہ بھی ایسے اشعار پر مشتمل ہے جن پر عشق مجازی کے رنگ کا گماں ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ درد عشق مجازی کی لذتوں سے نا آشنا نہ تھے، ان کی شاعری حقیقت و مجاز کی ہم آہنگی کی بہترین مثال قرار دی جا سکتی ہے۔

کون سی رات آن ملے گا
دن بہت انتظار میں گزرے
جب نظر سے بہار گزرے ہے
جی پہ رفتار یار گزرے ہے
ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں جو پوچھا تو کہا، خیر یہ مذکور نہ تھا
دل کس چشم مست کا سرشار ہو گیا
کس کی نظر لگی کہ یہ بیمار ہو گیا

کچھ ہے خبر بھی اٹھ اٹھ کے رات کو
عاشق تری گلی میں کئی بار ہوگیا
خون ہوتا ہے دل کا یاں آہ
مہندی پاؤں میں کیا ملی ایسی

خلیل الرحمان داؤدی درد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''درد بلاشبہ صوفی شاعر تھے اور ان کی شاعری کا بیشتر حصہ تصوف وعرفان کے موضوعات پر مشتمل ہے تاہم ان کے کلام میں شاعری کے دوسرے عناصر بھی وافر مقدار میں ملتے ہیں جہاں ان کے کلام میں مسائل تصوف ومعرفت کا بیان ہے، وہیں تغزل کے دوسرے جوہر بھی اتنی آب وتاب سے جلوہ گر ہیں کہ نظر خیرہ ہوجاتی ہے۔''[6]

درد سے حد سے زیادہ عقیدت رکھنے والے قدیر احمد درد کے صوفیانہ مسلک ومشرب، شاعری اور ان کے عشق حقیقی ومجازی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''خواجہ میر درد کا سرمایۂ سخن، عشق مجازی، عشق حقیقی دونوں ہی خصوصیات کا حامل ہے بلکہ بعض اشعار پر تو شبہ ہوتا ہے کہ یہ مجازی ہیں یا حقیقی اور آپ بذات خود صرف عشق حقیقی کے قائل ہیں اس لیے اکثر حضرات کو آپ کے اکثر اشعار کے مطالب کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے اگر چہ آپ نے ابتذال اور عریانی کو منہ نہیں لگایا لیکن مجازی رنگ کے اشعار اتنے کامیاب اور معیاری ہیں کہ بڑا سے بڑا رند لاابالی شاعر بھی ان اشعار پر سر دھنتا ہے، اپنے اشعار میں محبوب کا سراپا اس خوبی سے کھینچا ہے کہ وہ ہو بہو ہمارے سامنے آکر کھڑا ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے واقعی کسی دنیوی محبوب سے عشق کیا ہے۔ اس کے لباس، رفتار گفتار، اس کا کردار، کمر، لب ... دہن، آنکھیں، ابرو، مژگاں زلفیں، مہدی، مسکراہٹ، تلون مزاجی، شوخی، تند خوئی، فسوں سازی اور خودداری وغیرہ ہر ایک داخلی وخارجی خوبی کو اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔

درد وہ گلبدن مگر تجھ کو نظر پڑا کہیں
آج تو اس قدر بتا کس لیے باغ باغ ہے
صورتوں میں خوب ہوں گی شیخ گو حور بہشت
پر کہاں یہ شوخیاں، یہ طور یہ محبوبیاں [7]

درد کا کمال یہ تھا کہ وہ ذاتی اور شخصی تجربے کو آفاقی اور عمومی بنانے کا ہنر بخوبی جانتے تھے۔ عشق مجازی ہو یا حقیقی۔ انھوں نے ہر دو تجربے کو عمومیت اور آفاقیت سے سرفراز کیا ہے۔ بعض دفعہ ان کے کلام میں اس طرح کی مثالیں نظر آنے کے بعد قاری حیرت میں پڑ جاتا ہے، بعض دفعہ ان دونوں عشق کے مابین سرحدیں بھی مسمار ہوجاتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے مدغم ہوجاتے ہیں۔ اس ادغام کی کیفیت کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کم نہ تھے کروبیاں

قاضی عبیدالرحمان ہاشمی لکھتے ہیں:

''درد کی عظمت اور معنویت کی ایک دوسری جہت انسانی درد وآلام سے رشتہ استوار کرنے کی طرف ان کا قوی تر رجحان ہے، وہ اپنی خلوت میں اس خلش کی آنچ سے مسلسل پگھلتے رہتے ہیں۔''[8]

درد نے متصوفانہ شاعری یا مابعد الطبیعیات موضوعات کی عکاسی اپنی شاعری میں کسی نارسائی یا کمزوری پر پردہ ڈالنے کے سبب نہیں کی ہے بلکہ اپنے شوق اور طبعی رجحان کے سبب اس کوچے میں استقامت کے ساتھ قائم رہے اور فکر سخن کرتے رہے۔ وحید اختر کے مطابق:

''درد پہلے شاعر ہے جنھوں نے اردو غزل کو تصوف کے میدان میں فارسی شعرا کے برابر کھڑا ہونے کے لائق بنایا۔''[9]

درد کی شاعری میں وسیع المشربی، کثیر الجہتی، تنوع، ہمہ جہتی، فراخ دلی اور بے پناہ وسعت ہے، دنیا ومافیہا اور علائق دنیا سے بے نیازی کے بعد بھی اپنے آپ کو کبھی بھی غرور وتکبر جیسے اوصاف سے متصف نہیں کیا، دنیاوی مسائل پر بھی گہری نظر رہی اور اپنے آپ کو بھی عام انسانوں جیسا پیش کیا ہے، کہتے ہیں۔

دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا جو رہ گیا ہوگا

کلام درد کے بنظر غائر مطالعے سے اس کی کئی پرتیں کھلنے لگتی ہیں، لفظی اور معنوی محاسن کے ساتھ ان کا نظام فکر بھی کلام میں جا بجا نظر آتا ہے۔ ادبی تاریخ وتنقید پر گہری نظر رکھنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ درد کے اندر لفظوں کے انتخاب اور مخصوص سیاق وسباق کی ہم آہنگی سے بے پناہ معنوی گہرائی پیدا کرنے کا ملکہ تھا جس کے اثرات ان کے کلام میں نمایاں ہیں۔ ان کے کلام میں سادگی ہے، خلوص ہے، جاذبیت ہے، درد ہے، مسائل زندگی کا حل ہے، تصوف ومعرفت کے مضامین کا بحر ذخار ہے، صنعت وبلاغت کا حسین امتزاج ہے، استعارے وکنایے کی خوب صورت آمیزش ہے، عشق حقیقی وعشق مجازی کا حسین سنگم ہے، تغزل کے اعلیٰ جواہر ہیں، سوز وگداز اور واردات قلب وجگر کے نسخے ہیں، اخلاقی مسائل اور حقائق ومعارف کے رہنما اصول ہیں۔ درد کی شاعری اور اس کے فنی محاسن پر بہت سے لوگوں نے اظہار خیال کیا ہے۔

قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کی رائے اس سلسلے میں بے حد موزوں معلوم ہوتی ہے، لکھتے ہیں:

''درد کی غزلوں اور رباعیوں میں وہ تمام محاسن شعری ملتے ہیں جن کا استعمال اساتذہ فن نے بڑی ہنرمندی، چابکدستی، سلیقے اور احتیاط سے کیا ہے، چناں چہ تکرار الفاظ، لفظوں کا الٹ پھیر، مصرعوں کا تقابل، ضرب الامثال، محاورے، فارسی تراکیب، تشبیہ، استعارے، محاکات، کنائے، نقل قول، تعدد الفاظ، حسن تعلیل، مراعات النظیر اور صنعت تضاد وغیرہ نہایت خوبصورت اور دلنشیں استعمال سے درد کی شعری کائنات جگمگا رہی ہے لیکن یہ سب کچھ اس قدر کمال ہنرمندی اور مہارت فن کے ساتھ ہے کہ شاعری پر کہیں بھی آورد کا دھوکا تک نہیں ہوتا اور اس کے قرب سے حاصل ہونے والی دلنوازی موسیقی کانوں میں رس گھولتی رہتی ہے۔''[10]

درج بالا اقتباس سے واقعی مرزا درد کی شاعری میں بہت ہی مناسب روشنی پڑ رہی ہے، جن ناقدین نے بھی ان کی شاعری کے تئیں صرف کسی مخصوص گوشے کو سامنے رکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، وہ کافی حد تک درد سے انصاف کرتے ہوئے نظر نہیں آتے اور نہ ان کے کلام کی تفہیم کے پہلوؤں سے قاری اور ادب سے وابستہ افراد کو کما حقہ واقف کرا پاتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ہر ادیب یا شاعر کی تخلیق یا ان کی شاعری کی صحیح تفہیم کے ان کے شہ پارے کو بالاستیعاب اور دقت نظری سے مطالعہ کر کے کیا جائے اور ہر اس پہلو کو سامنے لایا جائے جس سے اس کی صحیح تصویر سامنے آسکے۔ میں نے اس مضمون میں دونوں طرح کے اقتباسات پیش کر کے اور جگہ بہ جگہ اپنی رائے دے کر درد کے سلسلے میں مناسب رائے قائم کرنے کی کوشش کی ہے، ممکن ہے کہ کچھ گوشوں میں کمی رہ گئی ہو مگر امید ہے کہ اس سے تحقیق اور تنقید کی صحیح صورت قاری کے ذہن میں آئے گی۔

حواشی

1 نالہ درد، خواجہ میر درد، ص 49 (ترجمہ فارسی رسالہ نالہ درد، 1982، بحوالہ ریختہ)
2 مونوگراف، قاضی جمال حسین، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی
3 شمس الرحمان فاروقی، بحوالہ: سید خواجہ میر درد، ص 6، رسالہ نئی صدی، بنارس، 2008
4 رشید حسن خاں دیوان اردو، مکتبہ جامعہ، دہلی، 1989، ص 8
5 نالہ درد، خواجہ میر درد، ص 28
6 خلیل الرحمان داؤدی (مرتبہ) دیوان درد، لاہور، 1988
7 قدیر احمد خاں، خواجہ میر درد اور ان کا ذکر فکر، دہلی، 1964، ص 230
8 قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، مونوگراف خواجہ میر درد، اردو اکادمی، دہلی
9 خواجہ میر درد، تصوف اور شاعری، ص: 378، علی گڑھ
10 قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، مونوگراف، اردو اکادمی، دہلی، ص: 55۔

Myserah Akhter
Research Scholar, Dept of Urdu
Delhi University
Delhi- 110007

عورتوں اور مظلوموں کی بلند آواز شکیلہ اختر

نصرت جہاں

شکیلہ اختر کا شمار اردو کے ان ابتدائی دور کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے افسانوں میں عصری مسائل کو بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ خصوصی طور سے خواتین کے مسائل اور ان میں بھی خاص طور سے بہار کے پس منظر میں عورتوں کے حالات اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز کو جتنی بہت خوبصورتی سے شکیلہ اختر نے پیش کیا ہے۔ شکیلہ اختر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے دیہات کی زندگی، لوگوں کے سماجی مسائل، زمیں دارانہ نظام، استحصال، بھوک افلاس، فاقہ کشی، مزدوروں اور کسانوں کا استحصال، عورتوں کی گھریلو زندگی اور ان کے ساتھ ہونے والی تفریق، ان کی نجی زندگی کے اتار چڑھاؤ، ان کے ذہنی، جسمانی اور جنسی استحصال پر بہت بے باکی سے لکھا ہے۔ بعض اوقات ان کا یہ انداز بہت تلخ ہو جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے افسانے ان کے دور کی روداد ہیں۔ شکیلہ اختر نے اپنے گرد و پیش میں جو کچھ بھی دیکھا اسے الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ ملک کے عصری مسائل سے انھوں نے اپنے افسانوں کا خمیر تیار کیا۔ موضوع خواہ کچھ بھی ہو جو بھی لکھا حقیقی انداز میں لکھا اور موضوع کے ساتھ مکمل انصاف کیا۔ انھوں نے گھسے پٹے موضوع کی جگہ زندہ اور ایسے موضوع پہ لکھنا مناسب سمجھا جو ابھی تک قاری کی نظروں سے اوجھل تھا۔

ان کے افسانوں کے بیشتر موضوعات دیہی علاقے سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے مسلم گھرانوں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے رومانی مزاج کو افسانوں میں بڑی بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کے عنوانات سے ہی نفس مضمون کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

شکیلہ اختر کے افسانوں کے پلاٹ منظم، گٹھے ہوئے اور منطقی ربط رکھتے ہیں۔ انھوں نے افسانوں کی بنت بہت ہی چابکدستی اور فن کاری سے کی ہے۔ ان کے افسانوں میں لفاظی نہیں ہے۔ وہ ہر واقعہ کو مقصد کے پیش نظر بیان کرتی ہیں۔ ان کے افسانوی کردار زیادہ تر غریب عوام سے تعلق رکھتے ہیں۔ کردار اپنی معاشرتی سطح اور معیار کے مطابق عکاسی کرتے ہیں اور اپنے ماحول اور فضا کے سیاق میں بہتر رول ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے کرداروں کے ذریعے پیش کیے گئے مکالمے کرداروں کی نفسیات کی غمازی کرتے ہیں۔

شکیلہ اختر کے بیشتر افسانے عورتوں کی نفسیات پر مبنی ہیں۔ وہ بہار کے متوسط مسلم گھرانوں کی تصویریں کھینچتی ہیں جن کے چہروں پر مٹے مٹے آثار نظر آتے ہیں۔ قصہ پن کی دلچسپی کے ساتھ ان کے افسانوں کے پلاٹ سیدھے سادے کردار جانے پہچانے اور مکالمے آسان ہوتے ہیں۔

شکیلہ اختر اپنے تمام افسانوں میں کردار نگاری، ماجرا سازی اور فضا آفرینی میں ماہر نظر آتی ہیں وہ اپنے افسانوں میں اپنے قاری کو کہیں اور کبھی پیچھے چھوڑنے پر یقین نہیں رکھتی ہیں اور شعوری طور پر یہ کوشش کرتی ہیں کہ ان کا قاری ان کی کہانی کا کوئی کردار بن کر ساتھ چلے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شکیلہ اختر کی کہانیاں آج بھی پڑھی جاتی ہیں اور وہ کسی بھی زاویے سے فرسودہ محسوس نہیں ہوتیں۔

شکیلہ اختر نے عورتوں کی نفسیات پر بہت خوبصورتی سے لکھا ہے جس کی واضح مثال ان کا افسانہ 'مدو جزر' ہے جس کا موضوع عورت کی بے لوث محبت ہے۔ نجمی جو کہ اس افسانے کا مرکزی کردار ہے وہ پرویز سے محبت کرتی ہے۔ پرویز بھی نجمی سے محبت کرتا ہے لیکن اچانک پرویز کی طبیعت بہت خراب ہو جاتی ہے اور اس کے بچنے کی امید نظر نہیں آتی۔ اس بات کا نجمی پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے اور وہ دن رات ہسپتال کے سامنے پڑی رہتی ہے اور جب ہسپتال کی طرف سے ملنے کا وقت آتا ہے تو وہ اس سے ملنے جاتی ہے۔ نجمی کی یہ حالت دیکھ کر بچے اس کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ اس کی حالت دیکھ کر اسے پاگل سمجھنے لگتے ہیں۔ نجمی اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش قسمت سمجھ رہی تھی لیکن پرویز صحت یاب ہونے کے بعد رنگینیوں کا دلدادہ ہو چکا تھا۔ اس لیے نجمی نے موت کے ہیبت ناک پنجوں سے تو پرویز کی زندگی کو لڑ کر چھین لیا تھا لیکن وہ جھوم جھوم کر چھاتی ہوئی رنگینیوں سے پرویز کو نہ چھین سکی۔ وہ سسکتی رہی اور تڑپتی رہی مگر پرویز اسے واپس نہ مل سکا۔ پرویز دوسری لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ اس افسانے میں شکیلہ اختر نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عورتیں محبت میں کیوں نہ ناکام ہو جائیں لیکن وہ کبھی بے وفائی نہیں کرتی ہیں۔

اسی طرح اپنے ایک اور افسانہ 'انتخاب' میں عام گھروں میں لڑکیوں پر ہونے والی سخت بندشوں کو بیان کیا ہے۔ ایک لڑکی جو اپنے ایک رشتہ دار لڑکے سے محبت کرتی ہے۔ ایک دن وہ لڑکا جب اس کے گھر آتا ہے تو وہ اپنی رشتے دار ایک چھوٹی لڑکی کو ایک خط دیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ اسے بہت احتیاط کے ساتھ دینا تاکہ خط کوئی دیکھ نہ سکے۔ اس پورے واقعے کا چھوٹی لڑکی پر بہت اثر پڑتا ہے۔ وہ اپنی بہن کی حالت کو دیکھ کر مسحور ہو جاتی ہے۔ وہ بھی اپنے لیے ایک دوست کا انتخاب کرنا چاہتی ہے لیکن اس کے آس پاس جو لڑکے ہوتے ہیں ان میں اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی لہٰذا وہ اپنے لیے کسی دوست کا انتخاب نہیں کر پاتی۔ ایک دن وہ یونہی قلم اور کاغذ لے کر بیٹھتی ہے کہ اچانک اس کی ماں کی نظر اس پر پڑ جاتی ہے اور وہ اسے بہت ڈانٹتی ہے۔ شکیلہ اختر نے یہ باور کرانے کی سعی

کی ہے کہ آج بھی متوسط گھرانوں میں محبت کو شجر ممنوعہ سمجھا جاتا ہے اور لڑکیوں پر سخت نظر رکھی جاتی ہے۔

'تم کس نگری میں بستے ہو' افسانے میں ایک طالبہ اور اس کے پروفیسر استاد کی محبت کی داستان ہے۔ وہ دونوں اپنی حدود میں رہ کر محبت کرتے ہیں۔ پروفیسر ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ کچھ دنوں بعد شیاما بھی ایک مرض میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے چلی جاتی ہے۔ اس طرح دونوں اس دنیا سے ایک نئی محبت کی خواہش لیے چلے جاتے ہیں۔

ایک اہم افسانہ 'آنکھ مچولی' ہے۔ آپ بیتی کے انداز میں یہ افسانہ شکیلہ اختر کی اپنی کہانی بھی ہے اور ان کی طرح کی دوسری عورتوں کی بھی۔ چونکہ شکیلہ اختر کی گود ہری نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ اس درد کو بخوبی سمجھتی تھیں۔ لہٰذا انھوں نے اس حساس موضوع کو افسانے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ شکیلہ اختر کے یہاں نہ صرف یہ کہ رومان بلکہ انسانی نفسیات اور سماجی معاملات کے ان پہلوؤں کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے جن کا تعلق صنف نازک سے ہوتا ہے۔ ان کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ذات کے کرب کو وسعت دے کر اسے ہمہ گیر بنا دینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہیں، افسانہ 'آنکھ مچولی' کے آغاز میں جو منظر اور ماحول پیش کیا ہے وہ شکیلہ اختر کے گھر کے ماحول سے پوری طرح ملتا جلتا ہے۔ کہانی کا ہیرو فیض ایک شاعر، ادیب اور نقاد ہوتا ہے۔ اس کے گھر ہر شام ملنے والے آتے ہیں مختلف موضوع پر بحث ہوتی ہے۔ لیکن فیض کی اہلیہ پروین جو کہ بچپن سے چنچل ہوتی ہے وہ اس ماحول میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہے۔ شکیلہ اختر اس کی منظر کشی کرتے ہوئے ایک عورت کے جذبات کو بخوبی پیش کرتی ہیں۔

اکثر ناقدین اور تبصرہ نگاروں نے افسانہ 'آنکھ مچولی' کو شکیلہ اختر کی آپ بیتی قرار دیا ہے۔ شکیلہ اختر بھی اولاد کی نعمت سے محروم تھیں اس لیے اس افسانے کا موضوع بہت اہم ہے۔ شکیلہ اختر کی طرح دیگر عورتیں جو اس تجربے سے گزر رہی ہیں انھیں بھی یہ موضوع بہت اہم محسوس ہوتا ہے۔

'بیچاری' افسانہ ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے جو شروع میں بہت امیر ہوتا ہے لیکن فضول خرچی کی وجہ سے اس کی مالی حالت بہت خراب ہو جاتی ہے۔

غریب رہڑی پٹری والے اور چھوٹے دکانداروں کی ابتر زندگی اور نام نہاد امیروں کا ان کے تئیں جو رویہ ہوتا ہے اس کی بہترین مثال شکیلہ اختر کا افسانہ 'صدائے واپسیں' ہے۔ اس افسانے کا موضوع بہت ہی حساس اور اہم ہے۔ اس افسانے میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ موجودہ دور میں یہ چلن بن گیا ہے کہ لوگ بڑے بڑے شاپنگ مال اور بڑی بڑی دوکانوں سے سامان خریدنے میں فخر محسوس کرتے ہیں جبکہ گھوم گھوم کر سامان بیچنے والوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس افسانے میں ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو بارش میں بھیگ کر سبزیاں بیچتی ہے۔ بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اس کی آواز میں کپکپی آجاتی ہے۔ آواز لگاتی ہوئی جب وہ ایک گھر کے سامنے پہنچتی ہے تو گھر کے اندر بلا لیا جاتا ہے۔ اس وقت اس کا حوصلہ تھوڑا بلند ہوتا ہے کہ اس کی سبزی فروخت ہو جائے گی اسے ادھر ادھر پھرنے سے نجات مل جائے گی۔ لیکن جب اس گھر کا باورچی سبزیوں کو دیکھتا ہے تو سبزی فروش عورت کو بری طرح ڈانٹتا ہے کہ تھوڑی تھوڑی سی سبزی ہے اور تم اتنا شور مچاتی ہو۔ عورت اس گھر کی مالکن کی طرف دیکھتی ہے اور اس سے التجا کرتی ہے لیکن وہ بھی منع کر دیتی ہے اور وہاں سے چلی جاتی ہے۔

اس افسانہ میں شکیلہ اختر نے یہ بات عوام کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمیں ان غریبوں کی مجبوری کو سمجھنا چاہیے اور وقت پڑنے پر ان کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔ اسی طرح 'سوکھا ہوا پودا' میں انھوں نے ایک غریب رکشہ والے کی حالت زار کو بیان کیا گیا ہے۔ کس طرح ایک بیمار رکشہ والا دوسرے لوگوں کو ہسپتال تک لے جاتا ہے لیکن خود غربت کی وجہ سے وہ ہسپتال کے اندر نہیں جاسکتا، اپنا علاج نہیں کروا سکتا۔ غریب رکشہ والا بیمار ہوتا ہے لیکن اس کی مجبوری اسے آرام نہیں کرنے دیتی۔ جب اس کے رکشے پر دو موٹے موٹے اور اچھے کپڑے میں ملبوس لوگ بیٹھتے ہیں اور ڈاکٹر کو دکھانے جانے کی بات کرتے ہیں تو وہ ان کے بارے میں کیا سوچتا ہے اس کا نقشہ شکیلہ اختر نے بہت صحیح طریقے سے کھینچا ہے۔

افسانہ 'کیڑے' میں غریب بچوں کی صورت حال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سماج میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اپنے بچوں کی پرورش نہ کر پانے کی وجہ سے انھیں مشنری کے حوالے کر دیتے ہیں۔ بہت سے بچے ایسے ہوتے ہیں جو بچپن میں ہی والدین کے سایے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کا بڑا بھائی یا بہن ان کی پرورش کرتی ہیں۔ لیکن یہ بچے تمام بندشوں سے آزاد جب دل کیے، جہاں دل کیے آسانی سے کھیل سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ کسی بڑے آدمی کے ساتھ رہنے لگیں تو وہاں کے ماحول اور بندشوں سے وہ اکتا جاتے ہیں اور ان کو اپنی پرانی زندگی ہی اچھی لگتی ہے۔ وہ تمام آرائشوں کو چھوڑ کر اپنی پرانی بستی میں لوٹ آنے میں ہی سکون محسوس کرتے ہیں۔

شکیلہ اختر نے 'ڈائن' افسانہ میں معاشرے کی عام فکری روش کو پیش کیا ہے مگر ڈائن عورت کے تعلق سے جو پلاٹ اور موضوع تیار کیا ہے وہ انوکھا ہے کیونکہ یہ کردار یعنی ڈائن ایک غریب اور کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے والی ایک مچھوارن کی کہانی ہے۔ اس کو اس کا سماج ڈائن کے روپ میں دیکھتا ہے اور اس کی شکل وصورت کا بھی خوب مذاق اڑاتا ہے۔ جو انسانیت کے قطعی منافی ہے۔ مگر وہ عورت اپنی سیرت وعمل کے اعتبار سے پاک و صاف ہے۔ لیکن معاشرے میں جب کسی شخص کے تعلق سے کوئی منفی بات مشہور ہو جائے تو اس کی صفائی پیش کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔ غریب اور بدصورت عورت صبح صبح ایک گھر میں اپنا بقایا روپیہ مانگنے پہنچ جاتی ہے۔ اس کو دیکھ کر گھر کے سارے افراد عجیب عجیب باتیں کرنے لگتے ہیں اور چھوٹے بچے رونے لگتے ہیں۔ جب وہ اپنے آنے کا مقصد بتاتی ہے کہ گیارہ آنے باقی ہیں اسے دے دیجیے تو گھر کی عورتیں اس عورت پر طرح طرح کے الزام لگاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ہم نے آٹھ آنے اس وقت دے دیے تھے اب صرف تین آنے باقی ہیں اس بات پر وہ زور زور سے رونے لگتی ہے۔ پر کوئی اس کا پیسہ واپس نہیں دیتا ہے۔

شکیلہ اختر کے اس افسانے کا موضوع بہت اہم ہے۔ انھوں نے اونچی سوسائٹی کے لوگوں کو اس نہایت غریب اور ضرورت مند بڑھیا کے ذریعے اس بات کو باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ان غریبوں میں انسانیت، احسان مندی اور اپنے بڑوں کا کتنا لحاظ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس امیروں کو اپنے فرض کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ انھیں صرف پیسے سے مطلب ہوتا ہے جب کہ ان کی مالی حالت بہتر ہوتی ہے پھر بھی کسی غریب کو دینے سے کتراتے ہیں حرص کی وجہ سے ان کو کبھی سکون نہیں ملتا ہے۔

شکیلہ اختر کی کہانیوں میں صرف عورتوں کے دکھ درد ہی نہیں عصری مسائل کا خوبصورت اور فنکارانہ بیان بھی ہوا ہے۔ نکسلی تحریک، چائلڈ لیبر، اولڈ ایج ہوم اور سیکس جیسے موضوعات پر بھی انھوں نے کہانیاں لکھی ہیں۔ آج کی تیز رفتار زندگی میں جو سماجی تبدیلیاں آرہی ہیں اور رشتے کا جو نیا منظرنامہ سامنے آیا ہے اس پر بھی ان کی صاف نظر ہے۔ مگر یہ بھی بہت واضح ہے کہ انھوں نے فوقیت عورتوں کے مسائل کو ہی دی ہے اور عورتوں کی نفسیات اور سماجی ناانصافیوں کو عورت کے نقطۂ نظر سے ہی پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں عورت کی سماجی حیثیت کے تعلق سے ایک احتجاج ضرور ملتا ہے، خواہ وہ احتجاج خاموش ہو یا بہ آواز بلند اور چونکہ یہ سارے موضوعات،

مسائل ان کے اپنے عہد کے ہیں اس لیے زبان، اسلوب، کردار اور فنی ٹریٹمنٹ بھی ان کا اپنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض کہانیوں میں کچھ کمزور پہلو ہونے کے باوجود ان کی 'وحدت تاثر' میں قاری کی شرکت برابر بنی رہتی ہے۔

'پیاسی نگاہیں' میں بیوہ عورتوں اور ان عورتوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جن کے شوہر یا تو بیمار ہیں یا ان سے دور ہیں۔ ایسی عورتیں اپنی زندگی میں کتنی پریشان ہوتی ہیں اور سکون تلاشنے کے لیے کیسے تاش اور دیگر تفریحی کھیل مل کر کھیلتی ہیں اور اپنا دل بہلاتی ہیں اس کا ذکر ہے۔ اس افسانے میں سماج کی آدھی آبادی مسائل کو عوام کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

سماج میں آئے دن زنا بالجبر اور اغوا جیسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور بہت سے لوگ اپنی دولت کے زور پر معصوم لڑکیوں کی زندگی برباد کر دیتے ہیں۔ شکیلہ اختر نے اس حساس موضوع پر بھی بہت خوبصورتی کے ساتھ لکھا ہے۔ 'نفرت' میں سماج کے ان معمر ہوس پسندوں اور وحشیوں کا ذکر ہے جو دوسروں کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اور اپنے پیسوں کے زور پر معصوم اور کنواری لڑکیوں سے شادی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اس افسانے میں کوآپریٹو بینک کے ایک آڈیٹر کی رنگین مزاجی کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس افسانے میں جس طرح کھل کر یہ بات کہی گئی ہے کہ مرد بوڑھا ہونے کے بعد بھی شادی کرتا رہتا ہے لیکن عورتیں بڑھاپے میں کبھی شادی نہیں کرتیں یہ مرد سماج کے لیے غور و فکر کی دعوت ہے، ساتھ ہی لڑکیوں کے اندر حوصلہ پیدا کرنے کی ترغیب ان کی کہانیوں میں ملتی ہے۔

شکیلہ اختر نے عورتوں کی آزادانہ روش کے برے نتائج کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ افسانہ 'بن تتلی' میں اسی کو پیش کیا گیا ہے۔

شکیلہ اختر نے بچوں کی نفسیات کو بھی بہت قریب سے سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا افسانہ 'خوش بختا' کا مطالعہ کرتے وقت منشی پریم چند کا افسانہ 'عیدگاہ' یاد آجاتا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے یہ ایک اہم افسانہ ہے۔ اس افسانے میں بچے کی نفسیات اور اس کی فرض شناسی کو بیان کیا گیا ہے۔

شکیلہ اختر نے بار بار بے حس سماج کو جگانے کی کوشش کی ہے۔ 'گز بھر کفن' افسانہ بھی سماج کا آئینہ ہے۔ ایک طرف سماج میں ایسے لوگ ہیں جو بھوک اور بہتر علاج نہ ملنے سے مر جاتے ہیں اور مرنے کے بعد ان کا سوگ منانے والا کوئی نہیں ہوتا، انھیں کفن تک نہیں ملتا ہے۔ دوسری طرف اسی سماج میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن سے عام آدمی کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا لیکن ان کے کتے بدیسی کھانا کھاتے ہیں، ان کے علاج کے لیے بڑے بڑے ڈاکٹر آتے ہیں، مرنے کے بعد باقاعدہ تعزیت ہوتی ہے اور اس کتے کو پھول دار قیمتی کپڑے کا کفن دیا جاتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ بہت اہم افسانہ ہے۔ افسانے کے آخر میں ایک غریب ماں کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

''آخری آرام گاہ گدے دار تابوت میں جب کتے کے اس مردہ بچے کو سلا دیا گیا تو نیلون کی خوبصورت چادر سے ڈھانک دینے کے بعد بھی اس کا چہرہ جھلک رہا تھا۔ فوٹوگرافر نے کئی تصویریں جب اتار لیں تب بڑھیا حائز نے اپنے ڈھلکتے ہوئے آنسو کے ساتھ مردہ کتے کے بچے کو جھک کر بڑی حسرتوں سے آخری بار پیار کیا تھا اور پھر تابوت میں کانٹیاں ٹھونکی جانے لگی تھیں۔

ڈاکٹر مائز کا ٹرانسفر ہو چکا تھا مگر اس کوٹھی کے احاطے میں ایک چھوٹی سی قبر پر ابھی تک لکھا ہوا رہ گیا ہے۔

''ہماری محبتوں کا چراغ اس اندھیرے میں بجھا ہوا ہے۔'' بانو ایک بار چیخ پڑی۔ ''ہائے رے میری سجادی بٹی! تو رے ایک گج کپھن بھی نہ ملا۔''

(لہو کے مول، شکیلہ اختر، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ 1976ء، ص 75-174)

ایک غریب اور مجبور انسان اپنی بربادی کے باوجود سرکار یا کسی بڑے آدمی سے کچھ نقد رقم پا جاتا ہے تو سب کچھ بھول کر ایسا خوش ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اس کی بے حسی جھلکتی ہے لیکن اصل میں یہ اس کی مجبوری ہوتی ہے اور وہ اس پل کو جی لینا چاہتا ہے۔ 'لہو کے مول' میں ایک غریب خاندان کی کہانی ہے جو غربت کی وجہ سے ایک امیر کے گھر میں نوکری کر لیتا ہے اسے سرونٹ کوارٹر مل جاتا ہے تو وہ پورے خاندان کو بلا لیتا ہے۔ پورا خاندان بہت خوش رہتا ہے عید اور دوسرے تہوار کے موقعے پر مالک کے بچوں کے پرانے کپڑے وغیرہ مل جاتے ہیں اس طرح ان کی زندگی آرام سے گزرتی ہے اچانک اس کی ایک بیٹی نجمہ کا سڑک حادثے میں انتقال ہو جاتا ہے۔ مالک اس کو دلاسہ دلاتا ہے کہ میں ٹرانسپورٹ کے ڈی ایس پی کو فون کر کے پانچ ہزار روپے دلا دوں گا۔ بڑی تگ و دو کے بعد ایک ہزار روپے مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی زندگی میں تبدیلی آجاتی ہے۔

ایک ہزار روپے ملنے کے بعد مناف میاں اپنے اور بچوں کے لیے خوب خریداری کرتے ہیں۔ ان کی زندگی میں یہ پہلی عید ہوتی ہے جب گھر کے تمام افراد نئے کپڑے پہنتے ہیں۔ خریداری کرنے کے بعد مناف کے پاس سات سو روپے بچتے ہیں۔ عید کے بعد مناف اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنے آبائی وطن جانا چاہتا ہے۔

شکیلہ اختر نے اپنے بعض افسانوں میں اپنے جذبات و احساسات کو بھی بڑی فنکاری کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ آنکھ مچولی، ڈائن، ٹوٹی ہوئی گڑیا، لہو کے مول، آگ اور پتھر اور 'آخری سلام' وغیرہ ان کی نمائندہ کہانیاں ہیں، یہ ساری کہانیاں اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ 'آنکھ مچولی' افسانہ کو تو اکثر ناقدین نے ان کی اپنی کہانی قرار دیا ہے۔ شکیلہ اختر نے اپنے افسانوں میں سماج کی ان لڑکیوں کو متنبہ کیا ہے جو محبت کے دام میں آ کر اپنے والدین اور اپنا گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہیں اور بعد میں لوگوں کے لیے عبرت بن جاتی ہیں۔

'آخری سلام' کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید شکیلہ اختر جس وقت یہ افسانہ تحریر کر رہی تھیں اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھیں اور اس کہانی کے اہم کردار رادھا رانی کی درد بھری کہانی میں وہ خود اپنی زندگی کی جھلک دیکھ رہی تھیں۔ شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری کے بارے میں پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''دراصل شکیلہ اختر کے افسانوں کا پس منظر ہماری روزمرہ کی زندگی کا نشیب و فراز ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے حالات و کوائف کی راز داں ہیں اور انھیں بڑے سلیقے اور فنکاری سے اپنے افسانوں میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں غایت درجے کی دروں بینی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ گہری داخلیت کی بنیادوں پر ان کے کئی افسانے عصمت چغتائی کے افسانوں سے ممتاز تر ہیں۔ شکیلہ اختر لحاف کی افسانہ نگار نہیں 'ڈائن' کی افسانہ نگار ہیں۔ اس طرح ان کے افسانے حسن کے دلدل میں دھنستے ہوئے معلوم نہیں ہوتے۔ نفسیات کے افق پر ابھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔'' (تاریخ ادب اردو، ص 1188)

بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں وہ سب سے زیادہ کامیاب اور بلند پایہ کہانی کار ہیں فن اور زبان و بیان پر ان کی گرفت کافی مضبوط ہے پچپن سالہ ادبی زندگی میں انھوں نے جو ادبی کارنامے انجام دیے وہ اپنی جگہ مسلم ہیں لیکن ان کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج بہار میں بہت سی خواتین افسانہ نگار اپنے فن کا جوہر دکھا رہی ہیں۔

■

Nusrat Jahan
Research Scholar, Dept of Urdu
Delhi University
Delhi- 110007
Mob.:7678451503

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

اصول تعلیم

مصنف: خواجہ غلام السیدین

صفحات: 376، قیمت: 215 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عظمت النساء، ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

تعلیم صرف تدریس کا نام ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ایک قوم خود آگہی حاصل کرتی ہے۔ اور یہ عمل اس قوم کو تشکیل دینے والے افراد کے شعور کو نکھارنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تعلیم وتربیت ہی نئی نسل کو زندگی گزارنے کے طریقے سکھاتی ہے، اور اس میں زندگی کے مقاصد وفرائض کا احساس پیدا کرتی ہے۔ تعلیم ہی کے ذریعے ایک قوم اپنے ثقافتی اور ذہنی ورثے کو آئندہ نسلوں تک پہنچاتی ہے اور ان میں زندگی کے ان مقاصد سے دلچسپی پیدا کراتی ہے جنھیں اس نے اختیار کیا ہے۔

دراصل تعلیم ایک ذہنی، جسمانی اور اخلاقی تربیت ہے۔ اس کا مقصد اونچے درجے کے ایسے تہذیب یافتہ لوگوں کو پیدا کرنا ہے جو اچھے انسانوں اور ذمے دار شہریوں کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دینے کے اہل ہوں۔ اس لیے بہت ضروری ہے کہ ہمارے اساتذہ تعلیم وتربیت کے اصولوں سے اچھی طرح واقف ہوں تاکہ بچوں کو بہتر سے بہتر تعلیم دے کر انھیں ایک اچھا شہری بنانے میں کامیاب ہوں۔

زیر تبصرہ کتاب 'اصول تعلیم' خواجہ غلام السیدین کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں تعلیم وتربیت کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ 'تعلیم وتمدن' ہے جس میں پانچ مضامین ہیں: تعلیم وتمدن اور مدرسہ (2) تعلیم اور تمدنی ادارے (3) خانگی اور معاشی زندگی کے اثرات (4) تعلیم اور مسئلہ معاش (5) حکومت اور تعلیم ہیں۔ اس حصے میں مصنف نے تعلیم اور تمدن کے باہمی تعلق سے بحث کی ہے اور ساتھ ہی تمدن کے مختلف شعبوں سے تعلیم کے رشتے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں تعلیم کے ان مسائل سے بحث کی گئی ہے جو موجودہ تمدنی اداروں کے مطالبات اور خصوصیات کی بدولت پیدا ہوئے ہیں۔ بقول مصنف ''فن تعلیم کے بہترین ارباب فکر کا نظریہ یہی ہے اور یہی رہا ہے کہ ہم تعلیم کے کسی مسئلے کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک اس کا مطالعہ اس کے تمدنی ماحول میں نہ کیا جائے۔''

دوسرا حصہ 'درسی تعلیم' پر مبنی ہے۔ اس میں بھی چار مضامین علم اور زندگی، مدرسہ عمل، ذہنی تربیت، تدوین نصاب، تربیت جسمانی شامل ہیں۔ اس حصے میں ان نکات کو پیش کیا گیا ہے جو عام طور پر عقلی اور دماغی تربیت کے سلسلے میں اٹھائے جاتے ہیں۔

تیسرا اور آخری حصہ 'اخلاق اور معاشی تربیت' چھ مضامین پر مشتمل ہے۔ اس حصے کا پہلا مضمون اخلاق کا حقیقی مفہوم (2) اخلاق اور عمل (3) عقلی اور اخلاقی تربیت کا تعلق (4) ضبط اور تادیب کا نظریہ جدید (5) معلم کی شخصیت (6) اخلاقی سیرت کی تعمیر ہیں۔ اس میں اخلاقی اور معاشرتی تربیت کے اصولوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ مصنف نے اخلاق کا حقیقی مفہوم واضح کرنے کی بہترین کوشش کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ اخلاق کا تعلق عمل سے اور عقلی تربیت سے کیا ہے۔ آخر میں اخلاقی سیرت کے عناصر کا تجزیہ کرکے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ طلبا کی اخلاقی سیرت کی تعمیر کس طرح کریں تاکہ جو نوجوان تعلیم حاصل کرکے نکلیں وہ اپنی ذات میں اہم ترین اخلاقی اقدار اور خصوصیت کے حامل ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''آج کل ماہرین تعلیم ایسی جسمانی تربیت پر زور دے رہے ہیں جس کی بدولت بچوں اور نوجوانوں کو اپنے قوائے جسمانی پر پورا قابو حاصل ہو جائے، اور ان میں جھجک اور بزدلی قائم نہ رہے۔ ہمارے خیال میں اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ تعلیم کا مطمح نظر بالکل تبدیل کر دیا جائے اور وہ بجائے 'سفید پوش شرفا' پیدا کرنے کے جو کسی قسم کی محنت سے اپنے ہاتھوں کو آلودہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، ایسے مستعد مزدور یعنی آمادہ عمل افراد پیدا کرے جو کمر ہمت باندھ کر ہر قسم کے مفید اور دولت آفریں کام کرنے کے لیے تیار رہیں۔

اخلاقی اور ذہنی جرأت سے ہماری مراد ہے اپنے اصولوں اور عقیدوں پر پختگی کے ساتھ قائم رہنا، ان کو دوسروں کی خوشنودی کی خاطر تبدیل نہ کرنا، جب ضرورت ہو اپنی

رائے بے دھڑک ظاہر کردینا، اور حق گوئی کی خاطر ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا۔'' (ص 362)

کتاب کے شروع میں سید راس مسعود کا مختصر مقدمہ اور خود مصنف کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ سید راس مسعود اس کتاب کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس کتاب کا وہ حصہ جس کا تعلق فن معلمی سے ہے ہمارے ملک کے اساتذہ کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ اس کو پڑھنے سے ان کو واضح طور پر معلوم ہوجائے گا کہ آج کل دنیا میں مختلف ممالک کس قسم کی تعلیمی جدوجہد میں مشغول ہیں اور مختلف قوموں نے اپنا تعلیمی نصب العین کیا قرار دیا ہے اور اس تک پہنچنے کے لیے کیا کیا تدبیر اختیار کی جارہی ہے۔''

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مصنف نے اصول تعلیم کے ہر پیچیدہ مسئلہ کو نہایت قابلیت کے ساتھ سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب تعلیمی اصولوں کو سمجھنے میں معاون و مددگار ثابت ہوگی۔

ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج

مصنف: ڈاکٹر رفیق ذکریا، مترجم: ڈاکٹر ثاقب انور
صفحات: 534، قیمت: 245 روپے، تیسری اشاعت: 2022
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 110025
مبصر: شاہ عمران حسن، اے 22، شاہ ہاؤس، مکی مسجد کالونی
مدن پور کھادر ایکسٹینشن، پارٹ: 3 نالہ روڈ، سریتا وہار، نئی دہلی۔ 76

ڈاکٹر رفیق ذکریا مشہور اسلامی اسکالر اور مصنف گزرے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک سیاست داں بھی تھے۔ جہاں انھوں نے مذہب اسلام کا مطالعہ سنجیدگی اور گہرائی سے کیا تھا وہیں وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ سے بھی اچھی طرح واقف تھے، بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی عروج و زوال کو بھی سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اسی کوشش کے نتائج انھوں نے کتاب 'ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج' میں درج کیے ہیں، جو خاصے کی چیز ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کو سمجھنے میں یہ کتاب یقینی طور پر معاون ہے، بلکہ تاریخ کے ہر طالب علم کو ضرور پڑھنی چاہیے کیونکہ یہ ایک مستند کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔

یہ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اس میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست کے ابتدائی صرف 20 سالوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ یعنی اس کتاب میں سنہ 1885 تا 1906 تک کے حالات کا مطالعہ ملتا ہے۔

اگرچہ کتاب کا عنوان سیاسی ہے مگر اس کے پس منظر میں مسلمانوں کی سماجی، معاشی و علمی ترقیات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ ہمیں ماضی کو نہیں بھولنا چاہیے، ماضی کے تجربات و اسباق ہمیں مستقبل کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔

خیال رہے کہ یہ کتاب 'ڈاکٹر رفیق ذکریا کے سنہ 1948 میں کیے گئے پی ایچ ڈی کے مقالہ کی ترمیمی شکل ہے۔ اس مقالہ پر لندن یونیورسٹی سے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی تھی۔

کتاب کے اوراق آپ پلٹتے جائیں اور آپ کو مطالعہ کے لیے نیا مواد ملتا جائے گا، اس میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور قیام پر بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، کہ محمد بن قاسم کے زمانے سے ہی مسلمان نہ صرف آئے بلکہ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔

کتاب کا نواں باب بہت زیادہ سنسنی خیز اور اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر رفیق ذکریا ہندو اور مسلمانوں کے آپسی تعلقات پر لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے تعلقات میں انگریزوں کی آمد سے قبل شاید ہی کبھی اتنی کشیدگی پیدا ہوئی ہو جسے 'پرتشدد فساد' کا نام دیا جاسکے اور اگر کبھی کبھار کسی قسم کی کشیدگی پیدا ہو بھی گئی ہو تو اس کا دائرہ اثر انتہائی محدود رہا۔ منجملہ دیگر وجوہات کے غالباً اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ان دونوں گروہوں میں ایک گروہ سمجھتا تھا کہ وہ فی نفسہ حکومت ہے اور دوسرا گروہ اس دعوے کو تسلیم بھی کرتا تھا۔ اس صورت حال کی دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ان دونوں گروہوں کے مابین معاشی بنیادوں پر کسی قسم کے ٹکراؤ کے امکانات بہت ہی کم تھے۔ (ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج، ڈاکٹر رفیق ذکریا، ص: 343)

کتاب کے دسویں باب میں ڈاکٹر رفیق ذکریا نے سرسید احمد خان کے تعلق سے ایک نئے انداز کی گفتگو کی ہے۔ سرسید کے علاوہ ان کے رفیق خاص محسن الملک کی فراخدلی پر بھی روشنی ڈالی ہے، جنھوں نے سرسید کی بہت زیادہ مالی مدد کی تھی۔ وہیں ڈاکٹر رفیق ذکریا لکھتے ہیں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ سنہ 1857 میں غدر کے پھوٹ پڑنے تک سرسید احمد خان کے جوہر پوری طرح کھلے نہیں تھے۔ اس وقت تک انھوں نے صرف ایک سنجیدہ اور قابل ذکر کارنامہ انجام دیا تھا یعنی دہلی کے آثار قدیمہ کی تاریخ بعنوان 'آثار الصنادید' مدون کی تھی۔ اس کتاب کی وجہ تالیف یہ تھی کہ انھیں مسلمانوں کے کارناموں سے عشقیہ لگاؤ تھا۔ اگرچہ انھوں نے اپنی کتاب میں 'ہندو فن تعمیر' پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ سرسید احمد خان کو عمر کے ابتدائی برسوں ہی میں اس امر کا اچھی طرح احساس ہوگیا تھا کہ 'عہد رفتہ' کی عظمتوں کی بازیابی ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ان کا خیال تھا کہ اب مسلمانوں کے لیے صرف یہ بچ رہا ہے کہ وہ برطانوی حکومت کے زیر سایہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ متمتع ہونے کی کوشش کریں۔ (ایضاً، ص 385)

اسی طرح کتاب کے آخری حصے 'نتائج' میں ڈاکٹر رفیق ذکریا ایک عجیب و غریب بات لکھتے ہیں کہ 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی انگریزوں کی نہیں تھی۔ (ایضاً، ص 439)

پھوٹ تو پہلے سے ہی موجود تھی۔ ان کی پالیسی تو کرزن کے کلاسکی الفاظ میں یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین انصاف کے ترازو کے پلڑوں کا توازن برقرار رکھو۔ چنانچہ اس پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے کبھی اس قوم کو فوقیت دی گئی اور کبھی اس قوم کو۔ ایسا کرتے ہوئے انگریزوں نے اپنی مصلحتوں کے علاوہ حالات کے تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرقہ وارانہ حسد اور رقابتوں میں کمی ہونے کے بجائے مزید اضافہ ہوگیا۔ (ایضاً، ص 440)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

محمد سلیم ثمر آروی

مصنف: محمد زاہد
صفحات: 160، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: مغربی بنگال اردو اکادمی، کولکاتا، مغربی بنگال
مبصر: ذکی طارق، 564 کیلا روڈ، گوشالہ پھاٹک، غازی آباد، یوپی

زیر نظر تصنیف جو محمد حلیم ثمر آروی کا مونوگراف ہے اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد زاہد نے ثمر آروی کے حیات و حالات، ان کی غزل اور رباعی گوئی نظم اور قصیدہ نگاری کے ساتھ ان کی نثر نگاری اور ثمر آروی کے تلامذہ کا تعارف اور مختصر کلام پیش کرتے ہوئے آخر میں ثمر صاحب کا 'انتخاب کلام' کے عنوان سے مختلف اصناف میں ان کے ذریعہ کہا گیا کلام شامل کیا ہے۔ شعری کلام کے ساتھ ہی دو نثری مضامین بھی مونوگراف میں شامل کر کے ثمر آروی صاحب کے اسلوب و بیان اور نثر کی سادگی کو قاری کے ذوق مطالعہ کے لیے پیش کر دیا گیا ہے۔

شاعری اور نثر کے مختلف ابواب میں ڈاکٹر محمد زاہد نے جس محنت اور دیانت داری کے ساتھ ثمر آروی کی غزلوں، رباعیوں نظموں اور قصیدوں پر فنی گفتگو کرتے ہوئے ثمر آروی کا تعارف پیش کیا ہے اس سے ڈاکٹر زاہد کی علمی صلاحیت و استعداد کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعری کی اصناف پر جناب زاہد کی گرفت جہاں مضبوط ہے وہیں ان کا شگفتہ اسلوب بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ زبان و بیان میں کسی قسم کا جھول نہیں بلکہ سلاست اور سادگی کے ساتھ تنقیدی زاویۂ نظر کو الفاظ کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔

محمد زاہد نے زیر تبصرہ مونوگراف کو 8 ابواب میں تقسیم کرتے ہوئے مختلف عنوانات کے تحت ثمر آروی کے حیات و حالات، ان کی غزل گوئی، رباعی گوئی، نظم نگاری، قصیدہ نگاری، نثر نگاری، ان کے تلامذہ کا تفصیلی تعارف کے نمونہ کلام پر مختصر رائے، ثمر صاحب کا انتخاب کلام اور آخر میں دو نثری مضمون شامل کر دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔ حیات و حالات کے تحت یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ثمر صاحب کی پیدائش یکم مئی 1928 کو شہر آرہ کے محلہ مہادیوا میں ہوئی اور چار دسمبر 2016 میں کلکتہ کے ایک نرسنگ ہوم میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اسی عنوان کے تحت ان کی ادبی اور سماجی زندگی کی دیگر مصروفیات درج کی گئی ہیں۔ دوسرے باب میں ان کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ثمر آروی کے یہاں غمِ جاناں کے رنگ اگرچہ بہت زیادہ نہیں لیکن جو اشعار ملتے ہیں ان میں آرزو کی کسک، شکستہ دل کی آواز، محرومی اور یاس ہے پھر یہ یاس زمانے سے اپنا رشتہ استوار کر لیتی ہے۔''

تیسرا باب ان کی نظم نگاری سے تعلق رکھتا ہے، جہاں صاحب مونوگراف نے مختلف نظموں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ان نظموں کو قابل قدر اضافہ قرار دیا ہے وہیں چوتھے باب میں ثمر کی رباعی گوئی پر محمد زاہد کی بڑی نپی تلی رائے ہے کہ ثمر نے رباعیات کہہ کر ''اپنی استادانہ قدرت اور دانشورانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔'' پانچواں باب ثمر صاحب کی قصیدہ نگاری سے متعلق ہے، محمد زاہد نے اس باب میں قصیدہ کے اجزائے ترکیبی پر گفتگو کرتے ہوئے ثمر صاحب کی قصیدہ نگاری میں قدیم روایتوں اور عصر حاضر کے مضامین کو تلاش کرتے ہوئے ان کے یہاں جوش تخیل اور زور بیان کی تعریف کرتے ہوئے ثمر صاحب کو ایک کامیاب قصیدہ گو بتایا ہے۔ چھٹے باب میں ثمر آروی کی نثر نگاری پر مختلف مضامین پر کارآمد گفتگو کی ہے اور ان کو ایک منفرد نثر نگار قرار دیا ہے۔ ساتویں باب میں ثمر صاحب کے تلامذہ کا بھرپور تعارف کرایا گیا ہے، بعد ازاں منتخب کلام اور دو نثری مضامین شامل ہیں جو ثمر آروی کے حیات و فن کو سمجھنے میں معاون ہیں۔

مغربی بنگال اردو اکادمی کا اردو کے فروغ میں جہاں یہ قابل مبارکباد قدم ہے وہیں نئی نسل کے تازہ کار نقاد ڈاکٹر زاہد کی اس تصنیف کا ادبی حلقوں میں یقیناً استقبال ہوگا۔ ایسی ہمیں توقع ہے۔

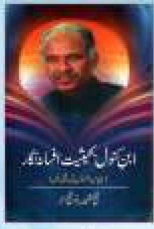

ابن کنول بحیثیت افسانہ نگار

مصنف: شیخ شکیلہ بانو شیخ اکبر
صفحات: 304، قیمت: 450 روپے، سنہ اشاعت: 2023
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ڈاکٹر نازنین سلطانہ آصف احمد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، چشتیہ کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس خلد آباد

ابن کنول جدید ادیب و فنکار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ابن کنول نے اپنے جوہر صرف اور صرف افسانہ نگاری ہی میں نہیں بلکہ تنقید و تدوین میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ابن کنول کو اپنی تخلیقی صلاحیت کی بنا پر کئی انعامات و اعزازت سے بھی سرفراز کیا گیا۔ 'ابن کنول بحیثیت افسانہ نگار (پچاس افسانوں کی روشنی میں)' شیخ شکیلہ بانو شیخ اکبر کی پہلی تنقیدی کتاب ہے۔ مصنفہ نے اس کتاب کے عنوان کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ ابن کنول کی افسانہ نگاری کا جائزہ اُن کے افسانوں کی روشنی میں پیش کیا۔ اس میں پہلا باب: اردو افسانہ اور روایت، دوسرا باب: ابن کنول کے ہم عصر، تیسرا باب: ابن کنول کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ، باب چہارم: ماحصل اور اس کے بعد کتابیات اور رسائل و جرائد کی فہرست درج کی جس کی وجہ سے قاری کو اس کتاب کے مطالعہ میں آسانی ہو۔

پیش لفظ میں مصنفہ نے افسانے کی تعریف و ارتقا اس کے ساتھ اہم افسانہ نگاروں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مصنفہ نے افسانے کی تعریف یوں بیان کی ہے:

''افسانے کے لغوی معنی جھوٹی بات، سرگذشت، قصہ، کہانی، داستان، ناولٹ وغیرہ کے ہیں۔ کہانی اور انسان کا رشتہ جنم جنم سے ہے۔ گویا جب سے انسان وجود میں آیا کہانی نے بھی اپنا سفر وہیں سے شروع کیا۔''

(ابن کنول بحیثیت افسانہ نگار: شیخ شکیلہ بانو شیخ اکبر، ص 11)

مصنفہ نے کہانی، افسانہ اور ناول کے ساتھ داستان جو قدیم ترین صنف ہے اور اس میں مافوق الفطری عناصر پائے جاتے ہے اس کی بھی وضاحت کی ہے۔ ویسے تو اُردو افسانے کی عمر زیادہ لمبی نہیں مگر چھوٹی سی عمر میں اس نے نہایت ترقی کی۔ مصنفہ نے اُردو افسانہ فن اور روایت کے بانی سدرشن، علی عباس حسینی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر وغیرہ کا ذکر کیا۔ یعنی سلسلہ وار تمام افسانہ نگاروں کی افسانہ نگاری کا جائزہ پیش کیا ہے۔

باب دوم: 'ابن کنول کے ہم عصر' ہے اس باب میں مصنفہ نے ابن کنول کے ہم عصروں کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے سید محمد اشرف سے اپنی بات کی شروعات کی ہے۔ محمد اشرف کو ان کی افسانہ نگاری پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا اس کا ذکر بھی مصنفہ نے کیا ہے۔ ابن کنول کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں مصنفہ نے محمد اشرف، سلام بن رزاق، مشرف عالم ذوقی، نورالحسنین، ترنم ریاض اور محمد غیاث الدین کا ذکر کیا

ہے۔ محمد غیاث الدین کے افسانوی مجموعہ 'قصہ شب وروز' کے بارے میں مصنفہ نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ:

''سماج میں موجود اخلاقی برائیوں، جھوٹ، کینہ پروری، چاپلوسی وخوشامد پسندی جیسی چیزوں پر لطیف انداز میں چوٹ کی ہے۔ قاری کے لیے افسانوی مجموعہ جہاں ایک طرف اس کے ذوق کو تسکین فراہم کرتا ہے وہیں یہ مجموعہ شہر اورنگ آباد کی ادبی فضا میں گنج گراں مایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (ایضاً، ص 65)

اس باب کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے ابن کنول کے تمام ہم عصروں کو اس باب میں شامل کیا ہے۔

باب سوم جو اس کتاب کا اہم باب ہے 'ابن کنول کے افسانوں کا جائزہ' ہے، مصنفہ نے ان کے ہر افسانے کا جائزہ اس میں پیش کیا ہے۔ ابن کنول کی افسانہ نگاری کے تعلق سے مصنفہ ایک جگہ رقمطراز ہیں کہ:

''ہر فنکار کی طرح ابن کنول کا بھی اپنا ایک نقطہ نظر ان کی تحریروں میں کارفرما رہتا ہے۔ ابن کنول اپنے وسیع مشاہدے اور مطالعے کے سبب اپنے نقطہ نظر کو زیادہ واضح ہونے نہیں دیتے اور فیصلہ اپنے قاری پر چھوڑ دیتے ہیں جس کے سبب قاری ان کے افسانوں پر سوچے بنا اور غور وفکر کیے بنا نہیں رہ سکتا۔'' (ایضاً، ص 294)

آخر میں مصنفہ نے ان تینوں ابواب کی روشنی میں ماحصل پیش کیا ہے۔ ماحصل میں افسانے کی تعریف، وضاحت، ہم عصر افسانہ نگار اور ابن کنول کی افسانہ نگاری سے جو انھوں نے محسوس کیا اور ابن کنول کو جن ایوارڈز نوازا گیا ان کا بھی ذکر اس میں کیا ہے۔ آخری صفحات پر کتابیات پیش کی گئی ہے، جس میں ابتدائی ماخذ، ثانوی ماخذ اور ان رسائل کی فہرست ہے، جن سے مصنفہ نے اس کتاب کی تالیف میں استفادہ کیا ہے۔

اُمید ہے کہ اس کتاب سے ریسرچ اسکالر اور قارئین استفادہ کریں گے۔

مونوگراف

شوق نیموی (مونوگراف)

مصنف: احمد صغیر

صفحات: 84، قیمت: 50 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: ساہتیہ اکادمی رویندر بھون، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر نزہت پروین، حنیف منزل کوٹھی پوکھر پولس لائن گیوال بیگہ گیا 823001 (بہار)

شوق نیموی احمد صغیر کا تحریر کردہ دوسرا مونوگراف ہے اس سے قبل عطا اللہ پالوی پر بھی مونوگراف لکھ چکے ہیں جسے ساہتیہ اکادمی نے 2016 میں شائع کیا تھا۔

زیر تبصرہ مونوگراف میں احمد صغیر نے شوق نیموی کے فکر وفن پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ شوق نیموی کا شمار بلند پایہ شاعر محقق اور دبستان عظیم آباد کے معتبر ادیبوں میں ہوتا ہے وہ علم وادب کی تاریخ میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شوق نیموی کی حیثیت ملکی نہیں بین الاقوامی ہے انھوں نے اپنے علمی ادبی کارناموں سے اپنے معاصرین کو متاثر کیا اور انفرادیت قائم کی۔

اس مونوگراف کے آغاز میں احوال وآثار کے تحت ان کے حالات زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔ وہ اپنی تعلیم حاصل کرنے کے لیے غازی پور گئے جہاں مولانا مفتی محمد فرنگی محلی سے تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے دوران ان کی شادی خالہ زاد بہن سے ہوئی لیکن زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکیں دوسری شادی ان کی چچازاد بہن سے ہوئی جو بیوہ ہو چکی تھیں۔

دوسرے باب میں شوق نیموی کی نثری تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں ان کی تمام تصانیف کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ازاحۃ الاغلاط، یادگار وطن، سیر بنگال، رسائل اصلاح مع ایضاح، سرمۂ تحقیق جیسی کتابوں کے بارے میں احمد صغیر نے بہت ایماندارانہ بحث کی ہے۔ انھوں نے 'سرمۂ تحقیق' کے حوالے سے لکھا ہے کہ'' یہ حقیقت ہے کہ شوق نیموی زبان کے ماہر تھے اور جس طرح انھوں نے زبان پر کام کیا ہے اس زمانے میں کسی نے نہیں کیا ہے۔''

تیسرے باب میں شوق نیموی کی شعری نگارشات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے تحت مثنوی 'سوز وگداز' پر بات کی گئی ہے۔ دراصل شوق نیموی کی مقبولیت مثنوی 'سوز وگداز' کی وجہ سے ہی ہے، جس میں دو محبت کرنے والے شام سندر اور حسن کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔ 'سوز وگداز' میں مثنوی کے تمام اسرار ورموز موجود ہیں اور اتنے خوبصورت انداز میں کہانی کو پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ 'سوز وگداز' کے علاوہ مثنوی 'نغمہ راز' بھی ایک چھوٹی سی مثنوی ہے جس کی پروفیسر وہاب اشرفی نے بہت تعریف کی ہے۔

شوق نیموی کی غزلوں کا ایک مجموعہ 'دیوان شوق' بھی ہے جس میں 94 غزلیں شامل ہیں۔ ان غزلوں پر بھی احمد صغیر نے کھل کر بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ'' ان کی غزلوں میں سادگی، سلاست، برجستگی اور روانی ہے انھوں نے بے ریا زندگی گزاری اور فطری انداز میں غزل کے اشعار کہے۔''

اگلے باب میں شوق نیموی کی رباعیات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بعد شوق نیموی کے قصیدے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

شوق نیموی نے قطعات بھی لکھے ہیں لیکن ان قطعات میں اشعار کی پابندی نہیں ہے۔ انھوں نے حسین ازل لکھنوی، سورج بھان کلیش، سید نذر الرحمٰن، حفیظ عظیم آبادی اور ممتاز احمد تھانوی پر قطعات لکھے ہیں۔

آخری باب میں شوق نیموی کی مذہبی تصنیفات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے آثار السنن پر بحث کی گئی ہے جو حدیث کی کتاب ہے اور بے حد مقبول ہے اس کتاب کی تمام علمائے کرام نے پذیرائی کی ہے۔ اس کے علاوہ اوشحۃ الجید فی اثبات التقلید، رد السکین، جامع الآثار فی اختصاص الجمعہ فی القریٰ، مقالہ کاملہ، لامع الانوار فی نظر المختار وغیرہ کتابوں کا نہ صرف تعارف کرایا ہے بلکہ اس کی اہمیت وافادیت پر بھی بحث کی ہے۔ آخری باب ماحصل ہے۔

شوق نیموی نے صرف 66 سال کی عمر پائی۔ تقریباً پچیس کتابیں شائع کیں۔ احمد صغیر نے ایک گراں قدر محقق زبان داں اور محدث پر مونوگراف لکھ کر ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ مونوگراف یقیناً پڑھا جائے گا اور لوگ اس سے فیضیاب ہوں گے۔

ترتیب

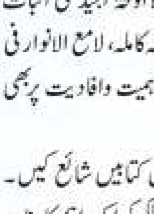

فلسفی ابن صفی: ایک مطالعہ

تالیف وترجمہ: ایم طاہر

صفحات: 144، سنہ اشاعت: جون 2022

ناشر: اپلائڈ بکس، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: عبدالحی، سی ایم کالج، دربھنگہ، بہار

ابن صفی ایک ایسے ناول نگار رہے ہیں جن کا جادو آج بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

ان کے کردار عمران، فریدی، قاسم، جولیا، سر سلطان، روشی، صفدر، تھریسیا، سنگ ہی وغیرہ آج بھی لاکھوں دلوں میں بستے ہیں۔ ابن صفی اردو ادب کے سب سے زیادہ مقبول ناول نگار ہیں۔ میں نے لفظ اردو ادب استعمال کیا ہے جاسوسی یا پاپولر ادب نہیں کیونکہ موجودہ دور ابن صفی کی مقبولیت کا دور ہے اور ان کی تحریریں جاسوسی ہونے کی وجہ سے محض پاپولر ادب میں نہیں رکھی جاسکتی ہیں۔ ابن صفی کے ناولوں میں حیات وکائنات کے مختلف موضوعات کو سمیٹا گیا ہے، انسان اور فلسفہ زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اپنے معاشرے کی اپنے پڑھنے والوں کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ ابن صفی کے ناولوں کو ادب عالیہ میں شامل کرنا ہی بہتر رہے گا۔ ہم اسے محض پاپولر کہہ کر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ابن صفی کی شخصیت اور خدمات پر ایک درجن سے زائد کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان پر ملک و بیرون ملک قومی و عالمی سطح کے سمینار ہو چکے ہیں۔ اردو کی نئی پناہ گاہوں انٹرنیٹ، سوشل میڈیا، مختلف ویب سائٹ، فیس بک اور واٹس اپ کے گروپوں پر ابن صفی کے چاہنے والوں کی تعداد ہزاروں لاکھوں میں ہے اور ان سے محبت کا حال یہ ہے کہ ان کے ناولوں اور ان کے کرداروں کے ناموں پر لوگ اپنا نام رکھتے ہیں۔ کوئی پرنس آف ڈھمپ ہے تو کوئی رانا تہور علی بنا پھرتا ہے۔ کوئی خود کو صحرائی دیوانہ کہتا ہے تو کوئی کرنل ہارڈ اسٹون بن گیا ہے۔ کچھ کے نام ایکس ٹو اور بلیک زیرو بھی ہیں۔ یہی نہیں ابن صفی کے چاہنے والوں نے اپنی جماعت کا نام صفیا نے رکھا ہوا ہے۔ ابن صفی پر ادھر چند برسوں میں تواتر سے کتابیں اور مقالے شائع ہو رہے ہیں اور ابن صفی کی حیات و خدمات کے مختلف اور ان چھوئے پہلوؤں پر خامہ فرسائی کی جارہی ہے۔ مشتاق احمد قریشی، خرم علی شفیق، راشد اشرف، محمد فیصل، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، محمد عارف اقبال، ادریس شاہجہاں پوری، پروفیسر محمد ظفر الدین و ڈاکٹر ارشاد احمد (ترتیب)، پروفیسر خالد محمود و خالد جاوید (ترتیب) تبسم حجازی و مرزا صہیب اکرام، طیب فرقانی وغیرہ کی کتابیں ابن صفی کی شخصیت اور خدمات پر چھپ چکی ہیں۔ محمد عارف اقبال کی مرتبہ کتاب ابن صفی مشن اور ادبی کارنامہ ابن صفی کی خدمات پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے ادریس شاہجہاں پوری نے ابن صفی کے فن پر جگر لخت لخت اور ایک عمدہ کتاب فنکر پرنٹس لکھی اور ابھی ابھی اوراق پارینہ کے عنوان سے ان کی ایک تیسری کتاب منظر عام پر آئی ہے۔ ابن صفی پر یونیورسٹیوں میں تحقیقی و تنقیدی کام بھی ہو رہے ہیں۔ محمد عزم الحق شاہ نے 2020 میں ابن صفی کے ناولوں کے مرکزی کرداروں پر ایم فل کا تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ ان سے قبل خورشید احمد، عثمان حیدر، عمران عاکف خاں، قطب الدین عبدالمجید، محمد طیب علی، محمد لیٰسین، نوشین رحمان، عبدالحق حسرت کانجوی، شبنم امان، ماہ جبیں قدسی وغیرہ نے بھی تحقیقی مقالے قلم بند کیے ہیں۔ ابن صفی پر کتاب ترتیب دینے والوں میں ایم طاہر کا نام بھی شامل ہوگیا ہے۔ ان کی کتاب فلسفی ابن صفی اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ایم طاہر نے ابن صفی کے ناولوں میں مختلف کرداروں کے ذریعہ کہے گئے فلسفیانہ جملوں کو، اقوال کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں پیش کیا ہے۔ کتاب کے بارے میں ایم طاہر لکھتے ہیں:

''میں نے اردو بک ریویو کے ایڈیٹر محمد عارف اقبال کے مرتب کیے ابن صفی کے ناولوں کا سٹ ایک ایک کر پھر سے پڑھنا شروع کیا اور پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ ابن صفی کی تحریروں میں ان کے کرداروں نے جو فلسفیانہ نکتے پیش کیے ہیں کیوں نہ انھیں یکجا کیا جائے، بلکہ ان کا ترجمہ بھی کیا جائے کہ زیادہ افراد تک اس کی رسائی ہو سکے۔ تو بس سطور کی سطور قلم زد ہونے لگیں اور اب قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔'' (ص 22)

کتاب میں ایم طاہر نے تقریباً 283 ایسے اقتباسات شامل کیے ہیں جن میں انسانی زندگی اور کائنات سے متعلق ابن صفی نے فلسفیانہ بیانات دیے ہیں۔ ان بیانات کا انھوں نے انگریزی میں ترجمہ میں کیا ہے جس سے کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ایسی کتابیں غیر اردو داں حضرات تک ضرور پہنچنی چاہیے تاکہ وہ بھی ابن صفی کی بصیرت سے واقف ہوسکیں۔ کتاب میں عالم نقوی کا پیش لفظ یا مختصر مضمون فلسفی ابن صفی کے عنوان سے شامل ہے جس میں انھوں نے ایم طاہر کی اس کوشش پر ان کی ستائش کی ہے اور کہا ہے:

''یہ ایم طاہر کا ایک اور کارنامہ ہے۔ انھوں نے ابن صفی کو ادب عالیہ کے بجائے نام نہاد مقبول عام ادب کے دائرے میں محدود کردینے والوں کے منہ پر ایک اور طمانچہ رسید کر دیا ہے۔'' (ص 19)

اس کتاب میں انسانی شعور، خود احتسابی، عدالتی فیصلے، قانون کی حفاظت، آدمی کا ارتقا، آدمیت کی معراج، سنجیدگی، انسانیت یا درندگی، حیوان اور آدمی، آدمی اور پابندیاں، آدمی اور بچت، آدمی اور جانور، انسانی المیہ، سوسائٹی، آدمی اور شیطان، عقل مندی، آدمی کی ترقی اور فطرت، انسانی جسم کے ایٹم، آزادی نسواں اور سماج، عورت کی اہمیت، عورت کی قیادت، فلسفہ اور عورت، وطن دشمنی، جرائم اور سزا، پیٹ کے کتے، احساس کمتری اور فلسفہ، انسانیت اور احساس کمتری، انسانیت کی فلاح، طاقت اور دنیا جیسے درجنوں عنوانات کے تحت ابن صفی کے اقوال اور ان کے انگریزی ترجمے دیے گئے ہیں۔ ان اقوال کے ساتھ ہی ناول کا نام بھی دیا گیا ہے جس سے یہ قول نقل کیا گیا ہے۔ ان عنوانات سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ابن صفی سب سے پہلے انسان اور اشرف المخلوقات اور اس کی معراج کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کا مسلک دنیا میں امن وشانتی کا قیام تھا۔ وہ ایک ایسے ادیب تھے جو چاہتے تھے کہ ساری دنیا میں قانون کی پاسداری کی جائے اور مجرم کو سزا بھی قانون کے دائرے میں دی جائے، ساتھ ہی جرائم کی وجوہات کا پتہ لگایا جائے اور مجرم کو سدھرنے کا ایک موقع ضرور دیا جائے۔ ابن صفی کے اقوال آج سے تقریباً پچاس برس قبل دائرہ تحریر میں آئے لیکن آج بھی ان کی معنویت کم نہیں ہوئی اور اب بھی ہمیں ایسے سبق آموز پیغامات کی ضرورت ہے جو ہمیں بہتر زندگی جینے کا سلیقہ عطا کریں۔ کتاب میں شامل بہت سارے اقوال کو یہاں نقل کیا جاسکتا ہے لیکن تبصرے کی طوالت کی وجہ سے دو چار اقوال پیش کیے جارہے ہیں۔

آدمی ابھی ارتقا کی اس منزل پر نہیں پہنچا جہاں اس پر فرشتے کا گماں ہو سکے۔ (خوفناک ہنگامہ) جب کوئی بہت اچھا آدمی قتل کر دیا جاتا ہے تو کائنات کا ذرہ ذرہ سوگوار معلوم ہوتا ہے۔ ہوائیں تک آہیں بھرنے لگتی ہیں۔ (لاشوں کا آبشار) دھوکا غیر مناسب لفظ ہے۔ جب قانون کے محافظ اس قسم کی کوئی چال چلتے ہیں تو اسے حکمت عملی کہا جاتا ہے۔ (زہریلے تیر) لڑکیوں سے شرمانا الگ چیز ہے لیکن ان کے ہاتھوں قتل ہو جانا اردو شاعری کی بہترین روایات میں سے ہے۔ (تابوت میں چیخ) مجھے نہ سیاست سے دلچسپی ہے اور نہ قیادت سے، میں تو صرف زمین کے اس ٹکڑے کے تحفظ کو اپنا ایمان سمجھتا ہوں جو میرا ملک کہلاتا ہے۔ (دوسرا پتھر)

مختصر یہ کہ یہ کتاب ہمیں ابن صفی کے ان بیانات سے رجوع کرواتی ہے جن میں ابن صفی بطور فلسفی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے اقوال آج بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کی اہمیت مستقبل میں بھی برقرار رہے گی۔ یہ کتاب ابن صفی کے چاہنے والوں کے لیے کسی سوغات سے کم نہیں ہے۔ ایسے قارئین جو اردو رسم الخط سے واقف نہیں وہ بھی اس انگریزی ترجمے کی مدد سے ابن صفی کی فہم وفراست سے شناسائی حصل کر سکتے ہیں۔

دبیر احمد کا ذہنی و فکری سفر

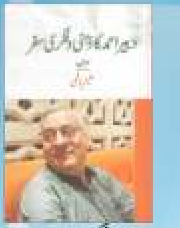

مرتب: علیم ہاشمی

صفحات: 332، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2023

مبصر: فرزانہ پروین، اسسٹنٹ ٹیچر، دی قریش انسٹی ٹیوٹ 5/1، کمبر اسٹریٹ، کولکاتا۔ 700017 (مغربی بنگال)

جولائی، 2023 میں علیم ہاشمی کی مرتب کردہ کتاب 'دبیر احمد کا ذہنی و فکری سفر' منظر عام پر آئی اکتیس مضامین پر مشتمل یہ کتاب اپنا تعارف آپ کراتی ہے، ابتدا ڈاکٹر دبیر احمد کے سوانحی خاکے سے کی گئی ہے جو تین صفحات پر محیط ہے اس کے علاوہ چوبیس صفحات کا مقدمہ لکھا گیا ہے۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ پرخلوص اور پاکیزہ ہوتا ہے ایک اچھے استاد کو اچھا شاگرد ملنا اور ایک اچھے شاگرد کو اچھا استاد ملنا قسمت کی بات ہے بلکہ ایک اچھے استاد کا ملنا قدرت کے کسی نادر تحفے یا انعام سے کم نہیں ہوتا۔ علیم ہاشمی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تعلق نبھانا خوب جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ تعلق دوستانہ ہو یا استاد شاگرد کا وہ ہر تعلق کی ڈور کو مضبوطی کے ساتھ تھامے نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کے مقدمے میں انھوں نے دبیر احمد کی شخصیت، اخلاق، مزاج، ماضی سے حال تک کی ان کی علمی و ادبی فتوحات نیز ان کی اب تک کی کتابوں کی تعداد اور ان کی تنقیدی بصیرت کو سلیقے سے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں جتنے بھی مضامین شامل اشاعت ہیں علیم ہاشمی نے ان مضامین کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مضمون نگار کا مختصر خاکہ اور ان کے مضامین سے ایک ایک اقتباس بھی قلمبند کیا ہے تا کہ صاحب مضامین کے اسلوب کا بھی اندازہ ہو سکے جس کی وجہ سے مقدمہ بہت شاندار ہو گیا ہے۔

مقدمے میں ایک جگہ مرتب لکھتے ہیں کہ "دبیر صاحب کی کل سولہ علمی و ادبی کتابیں اور 150 سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں" لہٰذا ایک تشنگی رہ گئی کہ مقدمے میں مضمون نگاروں کے خاکے پیش کرنے کے بجائے اگر ڈاکٹر دبیر احمد کی تمام کتابوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا تو قارئین کے علم میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا، لیکن علیم ہاشمی ایک جگہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "ممکن ہے کہ بعد میں آنے والی کتابوں میں موصوف کی علمیت کا پورے طور پر احاطہ کیا جا سکے" لہٰذا ایک امید تو بندھتی ہے کہ آئندہ بھی 'موصوف' کی شخصیت پر بہت کچھ پڑھنے کو ملے گا۔

میں یہ بتاتی چلوں کہ ظفر اوگانوی، ڈاکٹر دبیر احمد کے استاد تھے۔ ڈاکٹر دبیر احمد کی سولہ کتابوں میں سے چھ کتابیں ظفر اوگانوی پر ہیں اور ان کتابوں میں انھوں نے ظفر اوگانوی اور ان کے ادبی کارناموں کو الگ الگ زاویوں سے پیش کیا ہے، کہیں وہ (دبیر احمد) محقق نظر آتے ہیں تو کہیں ناقد، ان کی تنقیدی بصیرت و شعور کا کیا کہنا، علیم ہاشمی کی مذکورہ کتاب میں جہاں ہندوستان کی معزز و معتبر شخصیات کے مضامین ہیں وہیں کچھ نو مشق قلم کاروں اور شاگردوں کے مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔

پروفیسر منظر اعجاز اپنے مضمون 'مونوگراف پروفیسر ظفر اوگانوی: ایک جائزہ' میں ظفر اوگانوی کے علمی و ادبی خانوادے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دبیر احمد نے اپنے مونوگراف میں ظفر اوگانوی کو بحیثیت استاد، افسانہ نگار، محقق، ناقد، مدیر اور شاعر پیش کیا ہے اور ان کی شخصیت پر اختصار و جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

پروفیسر شہزاد انجم کا مضمون 'تہذیبی و ثقافتی شہر کولکاتا اور میرے دوست دبیر احمد' میرے دل کو چھو گیا ان کا انداز بیاں اور بے ساختگی مجھے بہت پسند آئی پروفیسر شہزاد انجم نے دبیر احمد سے اپنی قربت، ان کی ہم نشینی میں گزرے اوقات اور اپنی ذات پر دبیر احمد کا اعتماد کچھ اتنی محبت سے پیش کیا ہے کہ مضمون عرصے تک ذہن سے محو نہیں ہو سکتا۔

پروفیسر جمیل اختر محبی نے اپنے مضمون میں مختلف نکات کے ذریعے دبیر احمد کو بہ حیثیت محقق و ناقد پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر شکیل اختر نے اپنے مضمون 'جمال ہم نشیں' میں ڈاکٹر دبیر احمد کا خاکہ خوب صورت اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے، ان کے مطابق۔ "دبیر احمد ایک زندہ دل انسان ہیں، ہمارے دہلی کے دفتر میں انھوں نے کئی بار فلک بوس قہقہے لگائے جس کی بازگشت شعبۂ اردو کے ماہ و انجم نے بھی سنی، وہ اردو کے استاد ہیں۔ ادب و تہذیب سے واقف ہیں، وہ جب گفتگو کرتے ہیں تو الفاظ دیوانہ وار ہونٹوں پر رقص کرنے لگتے ہیں"

کلکتہ کے بزرگ شاعر و ادیب حلیم صابر نے بھی اپنے مضمون کے ذریعے دبیر احمد کی علمی، ادبی اور تنظیمی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے مضمون سے یہ راز بھی افشا ہوتا ہے کہ دبیر احمد اچھے استاد، ناقد، محقق ہونے کے ساتھ ایک اچھے شاعر بھی ہیں انھوں نے کچھ آزاد نظمیں بھی کہی ہیں گرچہ ان کی تعداد کم ہے مگر یہ نظمیں متاثر کن ہیں۔

'متاعِ فکر و نظر' اور 'ظفر اوگانوی بیچ کا ورق کے تناظر میں' پر نسیم عزیزی کے دو مضامین گرچہ کافی طویل ہیں لیکن بصیرت افروز اور معلوماتی ہیں جو یہ احساس دلاتے ہیں کہ انھوں نے ان دونوں کتابوں کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبال کا مضمون 'دبیر احمد کا اسلوب نقد' دوسرے مضامین سے قدرے مختلف ہے جس میں انھوں نے دبیر احمد کی مختلف کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے اسلوب کی تعریف کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ "دبیر احمد کا اسلوب ترقی یافتہ اور بے حد منظم ہے۔ ان کے اسلوب میں تازگی اور ندرت بھی ہے، ہمدردانہ خلوص اور قطعیت بھی ہے۔"

تسلیم عارف کا دبیر احمد پر ایک خاکہ اور متاعِ فکر و نظر پر ایک مضمون ہے۔ 'گل سیما— دبیر احمد' (خاکہ) میں انھوں نے دبیر احمد سے اپنی تیئیس سالہ رفاقت کو بڑے ہی پرلطف اور خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔

ممتاز انور نے بھی اپنے خاکے 'دبستانِ ادب کا آئینہ: دبیر احمد' میں ان کا نقشہ ان کی شخصیت، مزاج، انداز گفتگو نیز ان کی کتابوں پر بھی مختصر تبصرہ کیا ہے۔ وہ ان کے لب و لہجے کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے چہرے کا اتار چڑھاؤ گفتگو کے دوران ایک فلسفی کے لہجے کی یاد دلاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مضامین بھی عمدہ اور پر مغز ہیں علیم ہاشمی کی کتاب کے آخر میں دو مضامین تاثراتی ہیں جن میں ایک ناچیز کا مضمون ہے اور دوسرا ساجدہ پروین کا۔ اپنے مضمون کے متعلق میں اتنا ہی کہوں گی کہ یہ ایک استاد کے تئیں ایک شاگردہ کے جذبات کا اظہار ہے۔ ان سے میری ملاقات اٹھارہ برسوں پر محیط ہے اس دوران میں نے انھیں جیسا دیکھا، پایا اور سمجھا اسے بے کم و کاست تحریری شکل دینے کی کوشش کی ہے۔

ساجدہ پروین بھی ڈاکٹر دبیر احمد کی شاگردہ ہیں جنھوں نے زمانۂ طالب علمی میں دبیر احمد کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کی شخصیت سے متاثر ہوتے ہوئے کئی نکات اس طرح پیش کیے ہیں جن سے کچھ نئی باتیں سامنے آتی ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ کتاب ہمیں تین شخصیات کے متعلق معلومات فراہم کراتی ہے۔ ایک ظفر اوگانوی، دوسری دبیر احمد اور تیسری شخصیت اس کتاب کے مرتب علیم ہاشمی۔ دبیر احمد اپنے استاد ظفر اوگانوی کے اسلوب سے بہت زیادہ متاثر ہیں یہی وجہ ہے کہ مختلف زاویوں سے موصوف نے ظفر اوگانوی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، ممکن ہے کہ علیم ہاشمی بھی انہی راستوں پر چل کر حق شاگردی ادا کرنا چاہتے ہوں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ راستہ کانٹوں بھرا ہے کیونکہ استاد پر قلم اٹھاتے وقت غیر جانبدار رہنا مشکل ترین مرحلہ ہوا کرتا ہے، خدا کرے کہ علیم ہاشمی اس سلسلے میں غیر جانبدار رہیں تو آنے والے دنوں میں ان کی شخصیت بھی دبیر احمد کی طرح مستحکم ہو سکتی ہے۔

شہاب ظفر اعظمی کا مطالعۂ شعر

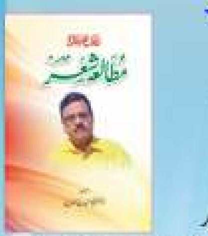

مرتب: ڈاکٹر محمد منہاج الدین

صفحات: 248، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد عارف حسین

اسسٹنٹ پروفیسر (گیسٹ) آئیر، ڈی، کالج، شیخ پورہ، بہار

پروفیسر شہاب ظفر اعظمی کی ذات ایسی ہے کہ طلبا ان کی شاگردی اختیار کرنے اور شرف تلمذ حاصل ہوجانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

'شہاب ظفر اعظمی کا مطالعۂ شعر' اصل میں پروفیسر شہاب ظفر اعظمی کے تواتر کے ساتھ لکھے گئے وہ مضامین ہیں جو اردو کے معتبر مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوچکے ہیں۔ ڈاکٹر منہاج الدین نے جمع کیا ہے اور دے کر قاری کے مطالعے کی میز پر رکھ دیا ہے۔ کتاب کے نام سے ظاہر ہورہا ہے کہ اس میں صرف وہ مضامین یکجا کیے گئے ہیں جن میں پروفیسر شہاب ظفر اعظمی نے مختلف شاعروں کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور فن شعر پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب میں شامل مضامین ملاحظہ فرمائیں: راجا رام موہن موزوں کی اردو شاعری، حالی غزل، جمیلہ خدا بخش: شخصیت اور شاعری، شفق عماد پوری: ایک گم کردہ کلاسیکی شاعر، خواجہ قیام اصدق کی اردو شاعری، جدید اردو غزل میں ہیئت کے تجربے، فیض احمد فیض ہندی والوں کی نظر میں، مجاز کا غزلیہ آہنگ، جمیل مظہری کی نظموں میں عظمت آدم اور احترام انسانیت ، پرویز شاہدی کی نظمیں: شعری جمالیات کا آئینہ، رضا نقوی واہی: طنز ومزاح کا افسانوی شاعر، مظہر امام کی نظمیں: حقیقت اور رومان کا آمیزہ، علقمہ شبلی: مکمل شاعر، ظہیر غازی پوری کا شعری ڈکشن، عبدالمنان طرزی: اردو میں منظوم تنقید کے موجد، منور باز یافتوں کا شاعر: شمیم قاسمی، قدسی کا نظمیہ انفراد، ظفر صدیقی: غزل زمین پر ننگے پاؤں چلنے والا شاعر، مینو بخشی: کلاسیکی رچاؤ کی شاعرہ، ظفر انصاری ظفر: امکانات وتجربات کا شاعر، مخمور سعیدی سے مصاحبہ، کلیم عاجز کے ساتھ گفتگو

مذکورہ عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر شہاب ظفر اعظمی نے صرف فکشن پر ہی نہیں بلکہ شاعری پر بھی بہت غور وفکر کیا ہے اور بہت ہی سنجیدگی سے اردو کی شعری کائنات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں مذکورہ مضامین کی قدر وقیمت کا جائزہ لیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر شہاب ظفر اعظمی شاعری کی پرکھ کا کافی شعور وادراک رکھتے ہیں۔

اس کتاب میں شامل پروفیسر خواجہ اکرام الدین کی تحریر 'نئی نسل کا معتبر نام شہاب ظفر اعظمی' کے عنوان سے پروفیسر نعیم انیس کی تحریر 'حرفے چند' کے عنوان سے اور کورج پر پروفیسر غضنفر کی تحریر سے نہ صرف کتاب کی قدر وقیمت میں اضافہ ہورہا ہے بلکہ شہاب ظفر اعظمی کی خصوصیات وامتیازات بھی واضح ہورہے ہیں۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین کا یہ خیال اس کتاب کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ:

''اس کتاب میں شعری روایات پر جتنے مضامین ہیں وہ مختلف نوعیت کے ہیں، جن سے ان کے وسیع مطالعۂ شعر کا پتہ چلتا ہے۔ یہ محض روایتی اور تبصراتی مضامین نہیں ہیں ان میں شہاب ظفر کا اپنا نقطۂ نظر شامل ہے۔'' (ص 9)

ڈاکٹر منہاج الدین علم دوست انسان ہیں۔ شروع سے پڑھنے لکھنے کی طرف مائل رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر اساتذہ کی نظر عنایت رہتی ہے کہ ایک استاذ کو پڑھنے لکھنے والا باادب شاگرد بہت عزیز ہوتا ہے۔ یہ ان کی پہلی کتاب ہے اور انھوں نے اپنی پہلی کاوش کو اپنے اساتذہ کے نام موسوم بھی کیا ہے۔ اللہ کرے تصنیف وتالیف کے مرحلے دراز سے دراز تر ہوں۔ انھوں نے پروفیسر شہاب ظفر اعظمی کے بکھرے ہوئے مضامین کو تلاش وجستجو کرکے نہ صرف اکٹھا کیا بلکہ ایک طویل مقدمہ بھی لکھا ہے جو ان مضامین کے سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر منہاج الدین نے خوبصورت پیرایے میں پروفیسر شہاب ظفر اعظمی کے مضامین کو ترتیب دے کر کتابی شکل دی ہے۔ میں انھیں دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

رشید النسا: اردو کی پہلی خاتون ناول نگار

مرتبہ: ڈاکٹر شہناز بانو

صفحات: 320، قیمت: 400، سنہ اشاعت: 2022

مبصر: پروفیسر منظر اعجاز

زیر نظر کتاب ڈاکٹر شہناز بانو کی غالباً دوسری کاوش قلم ہے۔ یاد آتا ہے کہ وہ اسی نوعیت کا کام پہلے 'سہیل عظیم آبادی' کے حوالے سے کر چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں کام فکشن کے حوالے سے ہی ہے۔ لیکن 'رشید النسا: اردو کی پہلی خاتون ناول نگار' کو میری نگاہ میں فوقیت حاصل ہے، اس لیے کہ یہ اردو کی پہلی خاتون ناول نگار ہیں، دوئم یہ کہ ان کا تعلق سرزمین بہار بالخصوص نیورہ، پٹنہ سے ہے۔ یہ نواب امداد امام اثر کی بہن تھیں اور امداد امام اثر خواجہ الطاف حسین حالی کے بعد اردو کے دوسرے نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان پر حالی کے اثرات تو نمایاں نہیں ہیں لیکن رشید النسا کے ناول کا عنوان 'اصلاح النسا' ہے اور اس پر ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے اثرات نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر شہناز بانو نے 'عرض مرتب' کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس کے ابتدائی چند سطور دیکھیں کہ کس قدر انداز واسلوب دلچسپ ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''قصے کہنا، سننا اور پڑھنا انسان کی فطرت ثانیہ ہے۔ چنانچہ مجھے بھی کہانی کہنے اور سننے میں بچپن سے دلچسپی رہی ہے۔ گویا اس وقت جب یہ بھی تمیز نہیں تھی کہ ناول، افسانہ یا فکشن کیا ہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ میرے علم میں اضافہ ہوا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اسکول کے زمانے میں کسی درجہ میں 'توبۃ النصوح' کی فہمیدہ اور نعیمہ کی لڑائی میرے نصاب کا حصہ تھی۔ ظاہر ہے کہ اس ایک حصہ کے مطالعے کے بعد میرے اندر تجسس پیدا ہوا کہ آگے کا قصہ کیا ہوگا......''

''یہ تجسس تو تھا ہی پھر ایم اے کے زمانے میں یہ مکمل کتاب شامل نصاب تھی، پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ کچھ ٹونے ٹوٹکے وغیرہ جو اس کتاب میں دکھائے گئے ہیں، شہناز بانو نے اپنے زمانے میں اپنی گلیوں اور محلوں میں دیکھے تھے۔ ان محیر العقول باتوں کے سلسلے میں جب اپنے استاد ڈاکٹر محسن رضا رضوی سے استفسار کیا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ اس کتاب کے حوالے سے جو مضامین لکھے گئے ہیں اور ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں، انہیں تلاش کرکے اپنے مقدمے کے ساتھ مرتب کرو اور پھر شائع کردو۔''

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر شہناز بانو تیز طرار اور ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر حوصلہ مند ہیں کہ محنت ومشقت سے بھاگتی نہیں۔ چونکہ وہ میری پی ایچ ڈی کے ریسرچ میتھوڈولوجی کے کورس میں شاگرد رہی ہیں، اس لیے کسی حد تک ان کے ذوق ووجدان سے میں بھی واقف ہوں اور یہ خصوصیات 'عرض مرتب' اور 'مقدمہ' کے مشمولات سے بھی ظاہر ہیں۔ بہر کیف، 'اصلاح النسا' یا رشید النسا سے متعلق 23 مضامین کا یہ مجموعہ ہے۔ مضامین کی فہرست سال اشاعت کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے، اور بقول مرتبہ ڈاکٹر شہناز بانو:

''بعض کتابوں سے رشید النسا کے سلسلے کے 'اقتباسات وتراشے' عنوان کے تحت کتاب کے آخری میں شامل کیا جا رہا ہے۔ بعض مضامین ایسے ہیں جو متعدد جگہ شائع ہوئے ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ ہر مضمون کے اختتام پر اس کے ماخذ کی نشاندہی کر دی جائے۔ مضمون نگاروں کی فہرست میں جہاں پرانے ناقدین اور مبصرین ہیں وہیں نئے لکھنے والوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔''

مقدمہ کا ایک حصہ مرتبہ کے چند سطور پر مشتمل تبصرہ بھی ہے جو اختصار اور جامعیت کا مظہر ہے۔ اسے بھی یہاں پیش کر دیا جانا موقع ومحل کے خلاف نہ ہوگا۔ ملاحظہ فرمائیے:

''ناول کا قصہ کچھ خاص نہیں ہے۔ اس میں ایک ہی ماں باپ کے دو بیٹے محمد معظم اور محمد اعظم کی کہانی ہے۔ اگر اس کو ہم کلاسیکی ناول کہیں گے تو بیجا نہیں ہوگا کیوں کہ جس طرح سے ہمیں تاریخ پڑھ کر بہت سی چیزوں کا اندازہ ہوتا ہے اور ہم دلچسپی اور دلجمعی سے مطالعہ کرتے ہیں یا تاریخی فلم دیکھ کر ہمیں اس وقت کی تہذیب ومعاشرت کا اندازہ ہوتا ہے اسی طرح اس ناول کو پڑھ کر اس زمانے کی تہذیب، رسم ورواج، خورد ونوش، لباس، سجاوٹ وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے۔''

مندرجہ بالا سارے نقوش 'اصلاح النسا' میں بھی ملتے ہیں۔ اس لیے اس ناول کو پڑھتے وقت اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔''

پہلے ہی جملے میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ناول کا قصہ کچھ خاص نہیں باوجود اس کے موجودہ دور میں اس کی اہمیت وافادیت پر جس انداز واسلوب میں روشنی ڈالی گئی ہے وہ اس کی عصری معنویت کو اجاگر کرنے کے لیے ایک اہم جواز ہے جو اسے خاص بنا دیتا ہے۔

بہر کیف اب مضمون نگاروں کی فہرست پر بھی ایک نظر ڈالیں:— محمد سلمان صدیقی، شعیب عظیم، سید مظفر اقبال، راشدہ آفتاب، ناز قادری، ممتاز احمد، ادیب سہیل، آصفہ واسع، سہیل عظیم آبادی، زاہدہ حنا، سید تنویر حسین، اعجاز علی ارشد، اشرف جہاں، محسن رضا رضوی، شاداب تبسم، دستگیر شہزاد، احمد صغیر، امتیاز عالم، زرنگار یاسمین، سلمیٰ خاتون، شگفتہ یاسمین، سعیدہ رحمٰن، رخسار پروین۔

علاوہ ازیں چھ تراشے بھی اخیر میں شامل کیے گئے، جو درج ذیل محققین کے سرمایہ قلم سے ماخوذ ہیں:

فصیح الدین بلخی، محمد معزالدین، اقبال حسین، انور سدید، عظیم الشان صدیقی، ناہید ظفر۔

ڈاکٹر شہناز بانو کا یہ کام بہر حال مشقت آمیز نوعیت کا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ متعاقب تحقیق کاروں کے لیے چراغ راہ کا کام دے گا۔ اب میں اپنی بات کو مکمل یا نامکمل چھوڑتے ہوئے ڈاکٹر شہناز بانو کو ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کرتا ہوں۔

فکشن

سات رنگ سات سر

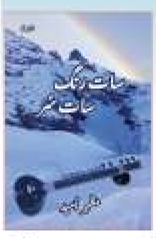

مصنف: مظہر امید

صفحات: 287، قیمت: 450 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: مائی بک سلیکٹ پبلی کیشن، نئی دہلی

مبصر: رخشندہ روحی مہدی، 115-A، پاکٹ A، ڈی ڈی اے فلیٹس سکھد یو وہار، نئی دہلی۔ 110025

'سات رنگ سات سر' بزرگ افسانہ نگار و ادیب جناب مظہر امید صاحب کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔

امید صاحب 6 اپریل 1920 کو بنگلور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ 10 جون 2009 کو 89 سال کی عمر میں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

مذکورہ مجموعہ 20 افسانوں، ایک تبصرہ، ایک مضمون اور ایک خاکہ پر مشتمل ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات سماج میں بکھرے ان گنت حادثات، واقعات اور دکھ درد ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے موضوعات پر اپنی رائے یوں دیتے ہیں۔ 'روایت کے رشتے اٹوٹ ہوتے ہیں میرے جذبات، میرے احساسات بس اسی کی ترجمانی کرتے ہیں۔'' واقعتاً افسانہ عام بات کو نئے انداز سے کہنے کا فن ہے۔ ان کے بیشتر افسانے زندگی کی سچائیوں کا اعتراف ہیں۔ وہ خوابوں کی سہانی دنیا میں تلخ حقیقتوں کی زمین پر کھڑے ہیں۔ 'رنگین دھوکے' اور 'قلی کا بیان' اسکی مثال ہیں۔ قلی کا بیان افسانے میں مزدور کا درد چھلکا پڑتا ہے۔ 'رو میں ہے رخش عمر' دل کش منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

'یہ جنگ کس کی ہے' جنگ میں لڑتے ہوئے ایک فوجی کے دل میں اٹھے دل گرفتہ خیالات کی عکاسی اس افسانے میں بڑی گہرائی سے کی گئی ہے۔

'سات رنگ سات سر' میرا پسندیدہ افسانہ ہے جس کے نام پر اس مجموعے کا عنوان ہے۔ عشق کا عروج وکمال اس کہانی کو تازگی بخشتا ہے۔ دنیا کتنی ہی پریکٹکل ہو گئی ہو لیکن جذبات سدا سچے رہتے ہیں۔ الفاظ کے تیز وتند نشتر قاری کے دل میں اترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ''تم سر بکھیرو، میں رنگوں میں سمیٹ لوں گا۔'' محبت کی معراج معشوق کو پالینے میں مضمر نہیں۔ عشق رواں دواں جھرنا ہے، ایک مسحور کن کیفیت ہے۔ سرور وسرمستی میں اس کہانی کا کردار اپنے مکروہ وجود کو معشوق کی نظروں سے دور کر دیتا ہے، لیکن وہ عشق ہی کیا جس میں جاں کنی نہ ہو، جدائی کی ٹیس نہ ہو اور ملن کی اضطرابی نہ ہو۔ بڑے سہج اور سہل انداز بیان کی تہہ میں عشق کی آنچ قاری کو تخیل کی وادیوں کی سیر کرا دیتی ہے۔ اس طرح کے اثر انگیز افسانے اب نہیں لکھے جاتے۔

'وبا' افسانہ میں ہند پاک بٹوارے میں تباہ شدہ دوستی کی کسک ہے۔ 'حسن تراش' افسانہ انسانی فطرت کی حرص وطمع پر گہرا طنز ہے۔

'سنپولا' عورت کی فطرت میں رچی بسی محبت اور منہ زور جسمانی خواہشات کی تشنگی پر لکھا گیا افسانہ ہے۔

'تذبذب' میں ایک افسانہ نگار کا تخلیقی کرب جھلکتا ہے۔ کتنا جاں گسل کام ہے کہانی لکھنا۔ اس ایک جملے سے ''پوربی ہوا کا ایک شریر جھونکا چپکے سے کمرے میں داخل ہوا اور سامنے ٹیبل پر بکھرے ہوئے ناول کے آخری باب کے کاغذات کو سمیٹ کر آگے نکل گیا'' افسانہ لکھتے ہوئے انسانی ذہن میں پنپتے ارتعاش واحساسات کے طوفان کو سمجھا جا سکتا ہے۔

بقول افسانہ نگار ''ایک انسان اپنی بقا کے لیے جدو جہد کرتا ہے۔ مایوسی کے اندھیروں سے گھبرا کر روشنی کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ چنانچہ میری یہ ادبی کاوش بھی ایک جدو جہد ہے، ایک طویل سفر ہے۔''

مجھے بھی اسی طرح کے کرب سے گزرنا ہوتا ہے جب میں اپنے ذہن پر کسی واقعہ کا دباؤ محسوس کرتی ہوں۔ جب تک وہ افسانے کے شکل میں قرطاس پر اتر نہ جائے۔ سکون نہیں ملتا۔

'مکان خالی ہے' ڈرامہ ہے، جس میں کردار مکالمے بولتے ہیں۔ اس صنف پر بھی مصنف کو مکمل عبور حاصل ہے۔

'غنچے کی باتیں' محبت سے لبریز دو دھڑکتے دلوں کی سرشار کہانی ہے۔ 'کچے دھاگے'

یہ محبت کی دھیمی آنچ پر آشاؤں کے پگھلتے محل کی روداد ہے۔ ''ایک ہاتھ میں زیتون کی سوکھی شاخ کو سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے میں نے وہ مرجھایا ہوا پھول چن لیا، سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوئی کالی کلوٹی کو دیکھا، اس کی پلکوں پر شبنم جیسے موتی تھرک رہے تھے۔''

منظر نگاری افسانے کی روح ہے۔ روکھے پھیکے مضمون کو منظر نگاری دلچسپ بناتی ہے۔ امید صاحب کے افسانے اپنی روح کے ساتھ زندہ جاوید ہیں کہ وقت کی گرد ان کو دھندلا نہیں سکی۔ الفاظ کی جادوگری ان کے افسانوں میں قاری کو متحیر کرتی ہے۔

''یہ لال قلعہ ہے، جس کے لال رنگ کو سرمہ داروں کے ناگوں نے پھنکاروں سے ختم کر ڈالا تھا۔ وہ اب اصل احمریں رنگ سے رنگا جا چکا ہے۔ قطب صاحب کی لاٹ غلط تاریخوں کی تاریکیوں سے نکل کر نئے انسان کا سر بلند کرنے کے لئے اپنا سر اونچا کیے ہوئے کھڑی ہے۔''

محترم امید صاحب اپنی فنی خصوصیات کے دم پر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ دور حاضر کے افسانے اس رنگ جنوں میں ڈوب کر نہیں لکھے جاتے جہاں قاری اپنی زندگی کے ان کہے ان چھوئے باب کھنکھنانے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے وجود کو ان افسانوں کے کرداروں میں ڈھلتا ہوا پاتا ہے۔ یہی افسانے کی کامیابی ہے کہ جب افسانہ قاری کو اپنی گرفت میں لے کر اس کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جائے اور وہ اس کو آپ بیتی لگنے لگے۔ امید صاحب کے افسانے دو تین دہائی قبل کے طرز بیان میں تحریر ہیں جو موجودہ دور میں ایک لیجینڈ کا درجہ پا گئے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ ستمبر 2022 میں دہلی کے ادارہ 'مائی بک سلیکٹ پبلیکیشن' نئی دہلی سے اشاعت پذیر کتاب دہلی اور گرد و نواح کے اردو قاری کی پہنچ سے دور رہی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اہل ذوق کو سات رنگ سات سر پڑھنے کے لیے دستیاب ہو جائے۔ استاد قلم کار امید صاحب کی تخلیقات پڑھ کر آج کی نوجوان قلم کار نسل فن افسانہ کی باریکیاں سیکھ سکتی ہے۔

اپنے والدین کی کاوشوں کو محفوظ کر کے قاری تک پہنچانا ایک صالح اولاد کا بہترین خراج عقیدت ہے۔ اس کتاب کے طابع و ناشر رفیع ہمایوں صاحب نے ادب کا اتنا بیش قیمت سرمایہ قارئین تک پہنچایا ان کے لیے دعائیں اور مبارک باد!

سائنس

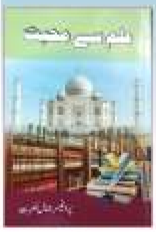

علم سے محبت

مصنف: پروفیسر جمال نصرت

صفحات: 192، قیمت: 300، سنہ اشاعت: 2023

مطبع: نعمانی پریس لکھنؤ

مبصر: غلام علی اخضر، A-3، سیکنڈ فلور، غفور نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی

زیر نظر کتاب 'علم سے محبت' سائنسی اور سماجی علوم سے متعلق ہے۔ اس میں مصنف کے قریب 75 مضامین جو سائنس اور دیگر ابتدائی جانکاری کے تعلق سے ضروری ہوتے ہیں، کو شامل کیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل سارے مضامین لکھنؤ سے نکلنے والے روزنامہ آگ کے اتوار ایڈیشن کے صفحے کا حصہ رہے ہیں جو بلا ناغہ چار سال تک شائع ہوئے ہیں۔

پروفیسر جمال نصرت پیشے سے انجینئر ہیں اور اتر پردیش کے محکمۂ آبپاشی کے اعلیٰ عہدے سے 2006 میں سبکدوش ہوئے ہیں۔ ملازمت کے آخری دور میں انھیں محکمے کے افسران کی تربیت اور ان کی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لیے بنائے گئے واٹر اینڈ لینڈ مینجمنٹ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ میں تعینات کیا گیا اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ذریعے منعقدہ امتحان پاس کرنے کے بعد انھیں پروفیسر کے عہدے پر بحال کیا گیا۔ اس دوران اردو سے محبت کے سبب ان کا قلم چلتا رہا اور وہ اردو میں سائنس پر مضامین لکھتے رہے، جن میں چند ماہنامہ اردو سائنس اور ماہنامہ اردو دنیا وغیرہ میں شائع ہوئے۔

اب تک پروفیسر جمال نصرت کی 10 کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جن میں پانی، ماحولیات، آگ، ہوا، جنگل، زمین وغیرہ کو اہمیت کے پیش نظر موضوع بنایا گیا ہے۔

قارئین کے لیے یہاں زیر نظر کتاب سے کچھ عناوین کی فہرست پیش ہے:

پانی-1، پانی-2، پینے کا پانی، پانی پر محاورے، پانی کی اہمیت اور تحفظ، مستقبل اور پانی، ہوا، ہوائیں کیوں چلیں، ہوا کی قسمیں، جنگل، جنگل: اہمیت، درخت سازی، سیارے اور ہم، زمین، زمین اور ہم، یہ زمین کیسی ہے، کس زمین پر کیا کام؟، آلودگیاں اور وبال، ہوا کی آلودگی، زمین کی آلودگی، پانی اور آواز کی آلودگی، صنعتی اور حرارتی آلودگیاں، سمندری، نیوکلیائی اور اسپتالی آلودگیاں، توانائی، موسم، سنبھالیں جہان کو، گرم ہوتا دنیا کا، ماحولیاتی گرمی کے اثرات، بجلی کے استعمال میں ذہانت ضروری، ہوں گے تو سب ہی برباد، آبادی، پیداوار اور کاشتکار، پلاسٹک کا بم، سر سلامت ہے تو دیوار بھی دروازہ ہے، دنیا کے آخری اسٹیج کا علاج: محبت، عنصر ہیں 118، بجلی بنانا اور بچانا، پانی کی ٹنکیاں، منعکس (Reflection)، آئینہ، پرزم (Prism)، مقناطیس (Magnet)، مقناطیس کی اہمیت، مقناطیس کا استعمال۔

ان مضامین کی زبان آسان اور سلیس ہے۔ تکنیکی الفاظ کو بوجھل بنانے کی بجائے اسے عام فہم رائج زبان میں ہی لکھا گیا ہے۔ جیسے تھرمامیٹر، ڈگری، پریشر، مالیکیول، پول، گرین ہاؤس، گیس وغیرہ۔

'اپنی بات' میں مصنف نے اردو کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اردو میں اپنی بات کہنا اور اس کا سمجھنا آسان ہے۔ یہ دوسری زبانوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت اور ہنر بھی رکھتی ہے۔ جب کوئی لفظ اردو میں آتا ہے تو اس طرح اس میں سما جاتا ہے کہ اسی کا ہو کر خوبصورتی دکھاتا ہے۔ جیسے تکنیک، اسکولوں، کاپیاں، ریل وغیرہ۔

جہاں اس کتاب میں علم طبعیات کے فارمولے سمجھائے گئے ہیں وہیں ان کی مدد سے غسل خانے اور باورچی خانے میں استعمال ہونے والی اشیا کے تعلق سے سائنسی تکنیک کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح عام دھات جیسے لوہا، سونا، چاندی، تانبہ، المونیم اور پارہ جو ہماری زندگی میں بہت اہم ہیں کی خصوصیات عام بول چال میں بہت خوب صورتی سے بتائی گئی ہیں۔ اس کتاب میں زمین، چاند، تارے، موسم، سمندر، روشنی، بجلی، ہوا، جنگل وغیرہ کو بھی سائنسی نقطۂ نظر سے سمجھایا گیا ہے۔

مصنف کا پانی سے خصوصی تعلق رہا ہے کیوں کہ قریب 37/38 سال اسی محکمے سے جڑے رہے ہیں تو بہت سے مضامین پانی کے تعلق سے بھی شامل ہیں جیسے پانی کیسا ہو، پینے کے پانی کی خصوصیات، پانی بچانا، پانی کتنا ہے، کہاں ہے، وغیرہ کو تفصیل سے کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ آبادی، کورونا، ریاضی، پلاسٹک، زہر، کوئلہ کے سلسلے کی عام معلومات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

کل ملا کر یہ کتاب عام ضروریات و معلومات کے حوالے سے کافی دلچسپ اور اہم ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ ان کی گذشتہ کتابوں پانی کی تلاش، ہمارا ماحول اور ہماری ذمے داری، دانہ پانی سے بھی زیادہ اس کتاب کو مقبولیت حاصل ہوگی۔ ایک چیز جو اس کتاب کو لے کر ہمیں کھٹکتی ہے وہ ہے اس کا نام، ایسا لگتا ہے کہ کتاب کا تعلق سائنس سے نہیں بلکہ علم کی اہمیت و افادیت سے ہے۔ امید ہے کہ اردو داں طبقہ سائنسی معلومات کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کرے گا۔

مضامین

رموز ادب (حصہ دوم)

مصنف و ناشر: حبیب سیفی
صفحات: 416، قیمت: 320 روپے، سنہ اشاعت: 2023
مبصر: فرقان شاہ، ریسرچ اسکالر چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ یوپی

موجودہ ادبی منظر نامے پر حبیب سیفی ماہر ادب اطفال، صحافی، شاعر، نثر نگار اور اہم ادیب کی حیثیت سے مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ گذشتہ تین دہائیوں سے ان کا ادبی سفر جاری ہے اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں، کئی صوبائی اردو اکادمیوں نے آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اس دوران ان کے تین بچوں کی نظموں کے مجموعے، دو شعری مجموعے دو تنقیدی مضامین کے مجموعے، اور ایک اطفال کے حوالے سے انتہائی اہم موضوع (بچوں کے ادب میں سائنس کی عکاسی) پر قومی اردو کونسل کا پروجیکٹ شامل ہے۔

زیر نظر کتاب رموز ادب حصہ دوم حبیب سیفی کے ذریعے لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں مختلف اصناف ادب پر تحریریں شامل ہیں۔ باقاعدہ حبیب سیفی کی یہ آٹھویں کتاب ہے جسے انھوں نے چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ جہاں تک حبیب سیفی کے تنقیدی ادب سے تعلق کا سوال ہے تو 1985 کے بعد منظر عام پر آنے والے ادبی رسائل میں ان کی تحریریں شائع ہونے لگی تھیں۔ تنقید و تجزیہ کے سلسلے میں وہ خاصے محتاط دکھائی دیتے ہیں، عام الفاظ میں اپنی بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں، زبان و بیان بے حد آسان ہے۔

رموز ادب کے باب اوّل میں مقالے، علمی و تحقیقی مضامین، کھڑی بولی کی اہمیت اردو کے تناظر میں، 'نثر نگاران بنگالہ' اور اردو نثر کا آغاز و ارتقا، ایسے جنمی پیار کی بولی، ساگر ہاشمی، ہمارے مہاویر سوامی (24 ویں جین تیرتھنکر)، مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور جنگِ آزادی، تطہیر و تہذیب کی ضامن تخلیقات کے خالق: مولانا محمد اسماعیل میرٹھی، سعادت حسن منٹو شخصیت اور فن ایک جائزہ، افسانہ کے ابتدائی نقوش اور کرشن چندر، ہندوستان میں رام راجیہ کا تصور! اور خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں سماجی شعور کے رنگ، بلونت سنگھ کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ شامل ہیں۔

باب دوم میں شخصیات کے فن کا جائزہ کے تحت بے لاگ اور حق گو صحافی تھے مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم، تفہیم جمالیات کا استعارہ تھے شکیل الرحمن بابا سائیں، حرف ہزار معنی کی شاعری اور ڈاکٹر رؤف خیر حیدرآبادی، افق اردو کا حقیقی چاند مہندر پرتاپ چاند ہریانوی، ڈاکٹر نواز دیوبندی کی شاعری کے امتیازات، 'دو ہا دھنک کے رنگ' اور رفیق شاہین علیگ کے حوالے سے نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔

باب سوم میں اصناف ادب کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے مصنف نے بلغ العلیٰ بکمالہ، خوشبو ادھر ادھر، روبرو، میں تیری غزل ہوں وغیرہ کے فکر اور اسلوب پر بحث کی ہے۔

باب چہارم میں نثری مجموعوں پر ایک نظر کے تحت فرہنگ کلیات 'نظیر اکبر آبادی و تنقیدی' اقبال مجید کی ادبی کائنات کا جہان دیگر، شگفتگی و برجستگی قلمکاروں کی؛ 'دست حنائی'، 'اردو شاعری میں تاج محل' صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن، فکشن کے تناظر میں، غیر منقسم بہار میں اردو کے غیر مسلم شعرا اور ان کی خدمات (1980 تک) پر نظر ڈالی ہے۔ نثری کتب پر ان کے مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ حبیب سیفی اپنے موضوعات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ بعض جگہ اپنے محسوسات کو تجزیے کے ساتھ استعاراتی پیرایے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

باب پنجم کے تحت شعری مجموعوں پر تاثرات پیش کیے ہیں۔ اردو میں جتنی بھی اصناف ہیں ان میں غزل کو فوقیت حاصل ہے۔ اس کا دامن اس قدر وسیع ہے کہ انفس و آفاق کے سبھی پہلو اس میں سموئے جا سکتے ہیں۔ لائق مبارکباد ہیں حبیب سیفی کے جنہوں نے اپنے مضامین میں شاعری کے رموز پر گفتگو کی ہے اور صالح فکر کی طرف اشارات بھی کیے ہیں۔ شعری مجموعوں میں عظمتِ تمام، کلام نہال، پس منظر میں منظر بھیگا کرتے ہیں، عہد نو کی سسکیوں کا ساز ہے میری غزل، گل کدۂ صبح و شام، گوہر شہوار، ندیندی کا جب کنارہ ڈوبتا ہے، کاٹھ کا لشکر کی شعری خصوصیات قلمبند کی ہیں۔

باب ششم میں احوال واقعی، اذکار و افکار، پنڈت دین دیال اپادھیائے اور جمنا تٹ (ہریانہ اردو اکادمی) ایک یاد، ڈاکٹر حنیف ترین کچھ یادیں کچھ باتیں: بحوالہ سعودی عرب، سرقہ باز اور چربہ خور خود ساختہ استاد، میرا گاؤں یعقوب پور آغا پور میرے والد اور میں شامل ہیں۔ حبیب سیفی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اصناف ادب میں کسی ایسے موضوع کا انتخاب بھولے سے بھی نہیں کرتے جس سے ان کی واقفیت گہری نہ ہو۔ ان کے موضوعات کا انتخاب ان کے اطراف میں پھیلی پھولی دنیا سے ہوتا ہے۔

اپنے ہم عصروں میں حبیب سیفی بیباک اور دو ٹوک رویہ رکھنے، وقت کی پابندی کرنے کرانے اور اپنی فعالیت کی وجہ سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ دورِ حاضر کے اہم ادیبوں میں ان کا نام اس لیے بھی ہے کہ ان کے فن و شخصیت پر بھی ایک ضخیم کتاب (معروضاتِ حبیب) حبیب سیفی فن و شخصیت کے نام سے گذشتہ برس منظر عام پر آچکی ہے، جس کے مرتب ڈاکٹر محمد معین الدین ہیں۔

حبیب سیفی کے یہاں ادب کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے، اسی لیے یہ کتاب تنقیدی و تجزیاتی کاوش کا مرقع بن گئی ہے۔ رموز ادب ایک ایسی کتاب ہے جس سے قارئین کو فیض پہنچتا رہے گا۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے اور سرورق بھی دیدہ زیب ہے۔ یہ کتاب آنے والی نسلوں کو فیض پہنچاتی رہے گی، نیز ادبی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوگی۔

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➤ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➤

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبرنامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان وادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

قومی اردو کونسل میں 'ہندی پکھواڑا' کی مناسبت سے ہندی میں مسابقۂ مضمون نویسی

کونسل کے ملازمین کی شرکت، پانچ کامیاب شرکا کو نقد انعام وتوصیفی اسناد سے نوازا گیا

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں 'ہندی پکھواڑا' کی مناسبت سے 21 ستمبر کو ہندی زبان میں مسابقۂ مضمون نگاری کا انعقاد کیا گیا تھا، جس میں کونسل کے مختلف شعبوں سے 16 ملازمین نے حصہ لیا تھا۔ کونسل کے اس وقت کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے اس مسابقے کے نتائج کا اعلان کیا اور اس موقعے پر پہلی، دوسری وتیسری پوزیشن حاصل کرنے والے شرکا کے علاوہ دو شرکا کو تشجیعی انعامات

سے بھی نوازا گیا۔ تشجیعی انعام پانچ سو روپے نقد اور سند توصیفی کی شکل میں محمد طاہر صدیقی اور ہریش لال کو دیا گیا، جبکہ محمد افروز نے پہلی، محمد شاداب شمیم نے دوسری اور نشاط حسن نے تیسری پوزیشن حاصل کی، تینوں کامیاب شرکا کو بالترتیب تین ہزار روپے، دو ہزار روپے، ایک ہزار روپے اور توصیفی اسناد سے نوازا گیا۔

اس موقعے پر پروفیسر عقیل احمد نے مسابقے میں کامیاب ہونے والے شرکا کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ جو لوگ کامیاب نہیں ہوسکے، وہ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس مسابقے میں شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ ہندی ہمارے ملک کی ایک اہم زبان ہے جس کے فروغ واشاعت کے لیے ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی تمام زبانیں اہمیت کی حامل ہیں، ہم اردو والے اس ملک کی تمام زبانوں سے محبت کرتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اردو کے ساتھ ملک کی ساری زبانیں ترقی کریں۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے طویل عرصے بعد بھی ہمارے یہاں زیادہ تر دفتری کام کاج انگریزی زبان میں ہوتا ہے، جس سے احتراز کرنے اور ملک میں ہندی زبان میں دفتری کام کا ماحول عام کرنے کے مقصد سے موجودہ سرکار متعدد اسکیمیں چلا رہی ہے، 'ہندی پکھواڑا' بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ پروگرام اس لیے کیا گیا ہے کہ ہمارے یہاں ہندی کے حوالے سے عمومی بیداری پیدا ہو اور ہم اپنا دفتری کام ہندی میں بھی کریں۔ اس موقعے پر کونسل کا تمام اسٹاف موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 ستمبر 2023

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

حکیم عبدالحمید میموریل لکچر

نئی دھلی: غالب اکیڈمی میں حکیم عبدالحمید میموریل لیکچر دیتے ہوئے مشہور نقاد، محقق، شاعر اور کالم نگار شمیم طارق نے کہا کہ جس شاخ پر جتنے زیادہ پھل آتے ہیں وہ اتنی ہی جھکی ہوئی ہوتی ہے۔ حکیم عبدالحمید نے تاعمر انسانی اقدار کی پاسداری اور فیض رسانی کی اور کبھی کسی سے تکبر یا بدزبانی کا معاملہ نہیں کیا اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ شاخ باثمر بن کر رہے۔ فلاح عامہ کے جو کام انھوں نے کیے ہیں ان میں کچھ سے دنیا واقف ہے، بیشتر کو انھوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا اور کچھ کے بارے میں ہم جانتے ہی نہیں مثلاً اگر انھوں نے بروقت بڑی رقم کا چیک نہ دیا ہوتا تو انڈیا اسلامک سینٹر کی زمین حاصل ہی نہ ہوتی۔ ان کی وراثت یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہے اس کی تقسیم اور حصول کے لیے آپس میں جھگڑے کیے جائیں بلکہ ان کی وراثت یہ ہے کہ دولت اور حصول دولت کے نئے ذرائع پیدا کر کے سب کو ملت کی فلاح کے لیے وقف کر دیا جائے۔ ان کے قائم کیے ہوئے یا سرپرستی میں چلنے والے کم و بیش 25 ادارے ہیں جن میں ہمدرد لیبارٹریز، غالب اکیڈمی، جامعہ ہمدرد کو بہت شہرت حاصل ہے مگر اس حقیقت کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے کہ انھوں نے ہسٹاریکل ریکارڈس کو سنبھالنے اور ملازمت فراہم کرنے والے ادارے بھی قائم کیے تھے، ملت میں بڑھتی ہوئی گداگری اور چندہ خوری پر افسوس کا اظہار تو چند لوگوں نے کیا بھی ہے مگر گداگری اور چندہ خوری کے انسداد کی عملی تدابیر صرف حکیم عبدالحمید مرحوم نے بتائی ہیں۔ شمیم طارق نے تقریباً ایک گھنٹے کی تقریر میں حکیم عبدالحمید کی شخصیت اور خدمات، ماضی سے نسبت اور مستقبل بینی کے اتنے اور ایسے ایسے گوشے روشن کیے کہ سامعین حیران رہ گئے۔ غالب اکیڈمی کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ حکیم صاحب نے اکیڈمی کی عمارت تعمیر کرنے سے پہلے غالب کی اور غالب سے متعلق نادر تحریروں کو جمع کر لیا تھا۔ آج یہاں غالب میوزیم قائم ہے۔ کلاسز چلتی ہیں، ادبی اور تہذیبی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں اور یہاں کی لائبریری سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کی فیض رسانی کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ سینٹر فار ایڈوانس سوشیولیگل اسٹڈیز، بزنس اینڈ ایمپلائمنٹ بیورو، ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل ریسرچ، سینٹر فار فیڈرل اسٹڈیز تو ایسے ادارے اور شعبے ہیں جن کو قائم کرنے میں حکیم صاحب کی بصیرت اور عزائم دونوں کا دخل تھا۔ ان کے کارنامے اتنے زیادہ ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص نے کسی سے چندہ لیے بغیر اتنے ادارے اور شعبے قائم کیسے کیے؟ حکیم صاحب برسہا برس رام لیلا کمیٹی کے بھی سرپرست رہے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ حکیم صاحب کا معمول صبح کی سیر کرنا تھا۔ وہ ایران بھی گئے۔ وہاں جاتے وقت جہاز پر ایک شخص کا علاج کیا جس سے ایران کے لوگ ان کے معترف ہو گئے۔ ڈاکٹر گلشن رائے کنول نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ شمیم طارق کا واقعی یادگاری لیکچر ہے۔ ان کو بہت واقفیت ہے۔ حکیم صاحب کم بولتے، کم کھاتے، کم سوتے تھے۔ حکیم صاحب کا مقصد زندگی کو بہتر بنانا تھا۔ اظہار تشکر اور دعائیہ کلمات خواجہ سید محمد نظامی نے ادا کیے۔ اس جلسے میں کثیر تعداد میں اطبا، شعرا، ادبا اور دانشوران دہلی موجود ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 16 ستمبر 2023

ایک شام اردو مرثیہ کے ادبی سفر کے نام

نئی دھلی: جشن بہار ٹرسٹ کے زیر اہتمام انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں داستان مرثیہ 'کربلا سے کاشی تک' ایک شام اردو مرثیہ کے ادبی سفر کے نام منعقد کی گئی جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے فلم ساز مظفر علی نے شرکت کی۔ جشن بہار ٹرسٹ کی بانی کامنا پرساد نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی میت پر رونا یا بین کرنا ہے، مرثیہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی وفات پر اس کے اوصاف اور خوبیاں بیان کرتے ہوئے اپنے رنج و غم کا اظہار کیا جائے۔ اس کی شروعات تعزیتی نظموں سے ہوئی، اس کے بعد یہ کربلا میں نواسۂ رسولؐ امام حسین، ان کے رفقا اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کا بیان بن گیا۔ انھوں نے کہا کہ مرثیہ ہماری گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جس کے بغیر ہندوستانی ادب کی تاریخ ادھوری ہے، جس نے شاعری کے حسن و وقار میں بیش بہا اضافہ کیا ہے، جس نے ہندوستانیت کا رنگ لیے سانحۂ کربلا کی ایسی ترجمانی کی جو عہد در عہد مقبول ہوئی اور جس نے اپنے وطن کے مختلف فرقوں اور طبقوں کو جوڑنے کا کام کیا۔ مہمان خصوصی مظفر علی نے کہا کہ آج کامنا پرساد نے داستان مرثیہ 'کربلا سے کاشی تک' کے عنوان سے جو محفل آراستہ کی ہے وہ سنگ میل ثابت ہوگی۔ وہ ہمیں ایک مخصوص سمت میں سوچنے کی طرف آمادہ کرے گی۔ گداز قلب اور آنکھ کے آنسو یہ بہت بڑی صفات ہیں، یہ صرف محرم اور امام حسین

کے ذکر سے ملتے ہیں۔ بعدازاں اسٹیج آرٹسٹ فیروز خان، ارناب خضرہ اور پلومشرا نے داستان مرثیہ 'کربلا سے کاشی تک' پیش کی۔ پروگرام میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 ستمبر 2023

غالب کے تین اہم معاصرین

دہلی: صہبائی آزردہ اور شیفتہ غالب کے ایسے معاصرین ہیں جو صرف شاعر نثر نگار اور محقق ہی نہیں سماجی زندگی میں فعال اور نظریہ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اس نشاۃ الثانیہ

کے نقیب تھے جو شمالی ہند میں رونما ہوئی اور جس کے نتیجے میں وہ خود اعتمادی پیدا ہوئی جس نے 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے لیے زمین ہموار کی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذمے داران لائق مبارکباد ہیں جنھوں نے ان تین معاصرین غالب کا انتخاب کیا اور ان پر باقاعدہ مذاکرے کا انعقاد کیا۔ ان خیالات کا اظہار فارسی و اردو کی عالمی شہرت یافتہ اسکالر پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقد دو روزہ قومی سمینار 'غالب کے تین اہم معاصرین: صہبائی آزردہ اور شیفتہ' کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ سمینار کا افتتاح سابق سکریٹری حکومت ہند جناب نوید مسعود نے کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ غالب کی شخصیت اپنے عہد میں ایسی نمایاں ہوئی کہ دیگر افراد اس میں دب گئے حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو دہلی میں اس وقت تمام ایسی شخصیات کا مجمع تھا جو اپنے اپنے فن میں کامل نظر آتی ہیں۔ صہبائی آزردہ اور شیفتہ غالب کے ایسے ہی معاصرین میں شمار ہوتے ہیں۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے فرمائی، اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ معاصرین غالب کے تعلق سے یہاں پہلے بھی سمینار منعقد ہوئے ہیں لیکن یہ تین حضرات ذیلی طور پر تو زیر بحث آئے لیکن ان پر باضابطہ اب تک سمینار نہیں ہوا تھا۔ آج کا یہ سمینار ایک اہم گوشے کو روشن کرے گا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے دائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب کے تین اہم معاصرین صہبائی، آزردہ اور شیفتہ کی شخصیت اردو اور فارسی ادب کے تعلق سے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ ان تینوں شخصیات نے صرف ادب میں ہی نہیں ہندستان کی پہلی جنگ آزادی میں خدمات دیں اور اس کی قیمت کسی نے گھر دے کر اور کسی نے جان دے کر ادا کی۔

سمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت دہلی یونیورسٹی کی صدر شعبۂ اردو پروفیسر نجمہ رحمانی نے کی اور کہا کہ سمینار کا ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ پرانے موضوعات جن پر وقت کی گرد بیٹھ گئی ہے دوبارہ ہمارے مطالعے کا حصہ بنیں۔ ایک اہم مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم نئے تقاضوں کی روشنی میں پرانے موضوعات کو دیکھیں اور سوالات قائم کریں۔ اس اجلاس میں پروفیسر عمر کمال الدین نے 'گلشن بے خار پر ایک نظر' پروفیسر علیم اشرف نے 'شیفتہ بحیثیت تذکرہ نگار'، پروفیسر کلیم اصغر نے 'رسالہ قواعد صرف و نحو مصنفہ صہبائی پر ایک نظر' اور ڈاکٹر مشتاق تجاروی نے 'شیفتہ اور غالب' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر علی احمد ادریسی نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کی اور کہا کہ ان تینوں معاصرین غالب میں صہبائی کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ فارسی میں تنقید کا رجحان بہت کم ہے لیکن صہبائی کی 'قول فیصل' کو دیکھیں تو تنقیدی رجحان ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ افسوس کہ اس رجحان کو زیادہ ترقی نہیں ملی۔ اس اجلاس میں پروفیسر عراق رضا زیدی نے 'صہبائی کی فارسی گوئی' ڈاکٹر شمس بدایونی نے 'اردو میں انگریزی رموز اوقاف اور صہبائی'، ڈاکٹر واحد نظیر نے 'آزردہ کا تذکرہ ایک جائزہ'، کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر امیر حمزہ نے ادا کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عمر کمال الدین نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر قمر عالم نے 'مولانا آزاد لائبریری میں آثار شیفتہ کے خطی نسخوں کا تعارف'، ڈاکٹر یاسر عباس نے 'آزردہ بحیثیت فارسی گو' اور ڈاکٹر مخضر رضا نے 'صہبائی اپنے معاصرین کی نظر میں' کے موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شاداب شمیم نے کی۔ چوتھے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کی اور کہا کہ اس اجلاس میں تمام مقالے شیفتہ سے متعلق تھے۔ شیفتہ نے شاعری اور تنقید کی دنیا میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا ہے۔ غالب بھی ان کی سخن فہمی کے قائل تھے، لیکن اس اجلاس کے تمام مقالوں میں نئے سوالات قائم کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر محمود فیاض ہاشمی نے 'شیفتہ کی فارسی گوئی'، پروفیسر احمد محفوظ نے 'شیفتہ کا تنقیدی شعور' اور ڈاکٹر محمد مقیم نے 'شیفتہ کی غزل گوئی چند معروضات' کے موضوع پر مقالات پیش کیے، اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر سفینہ نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 ستمبر 2023

شاہجہان آباد کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی

نئی دہلی: حضرت شاہ ولی اللہ پبلک لائبریری میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں صحافی اشوک ماتھر نے 'شاہجہان آباد کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں بہشتیوں کے بہت سے واقعات بیان کیے کہ وہ کس طرح مشک سے پانی کا چھڑکاؤ کرتے تھے، جب ہمارے بازار سے رام لیلا نکلتی تو آگے آگے چلتے اور پانی سے سڑک پر چھڑکاؤ کرتے جس سے دھول نہ اڑے، یہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی نشانی تھی۔ بہشتی صرف مسلمان ہی ہوا کرتے تھے۔ چوک حوض قاضی پر اب بھی دیوالی کے موقعے پر پانی کا چھڑکاؤ کرتے دکھائی دے جائیں گے۔ اشوک ماتھر نے مقالے میں پرانی دلی کے ہندوؤں کے محلے میں 'سید کے طاق' کا ذکر کیا۔ اپنے والدین کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہماری 120 سال پرانی حویلی ہے، محرم کا تعزیہ ہمارے گھر کے نیچے سے نکلتا تھا، یہ ہمارے لیے بڑی عقیدت کی بات ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے میں جین مذہب کے ماننے والے مسلمانوں کو آداب عرض کہتے تھے۔ ہمارے گھر کی پشت پر ایک مزار شریف تھا، وہاں پر برہمن بھوج کراتے اور جب جاتے تو سب سے پہلے چراغ جلاتے۔ انھوں نے گلزار زتشی دہلوی کا بھی ذکر کیا جو بہترین اردو لکھتے بولتے تھے۔ مقالے کے بعد نشست میں سوالات کا سلسلہ چلا اور سامعین نے سوالات کیے۔ نشست کی نظامت ڈائیوا کے نائب صدر محمد تقی نے کی۔ انھوں نے اشوک ماتھر کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے اشوک ماتھر کے صحافتی کریئر،

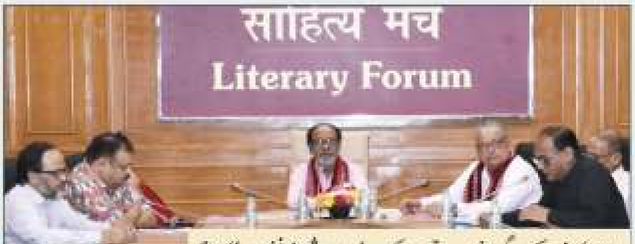

ساہتیہ اکادمی کے پروگرام 'میرے جھروکے سے' اور 'اردو شعری نشست' کا منظر

دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں خصوصی خطبہ 'دلت ادب: ایک تعارف' کا اہتمام

پرانی دلی کی روایت اور ان کی حویلی کا ذکر کیا۔ نشست کی صدارت ڈاکٹر ریاض عمر نے کی۔ انھوں نے شاہجہاں آباد کی تاریخ پر مختصر روشنی ڈالی۔ آخر میں ڈائیوا کے صدر محمد نعیم اور ارشد فہمی نے مقالہ نگار اشوک ماتھر کو لائبریری کی طرف سے تحفہ پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، 18 ستمبر 2023

میرے جھروکے سے

نئی دهلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 16 ستمبر کو اکادمی آفس نئی دہلی میں دو اہم پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ پہلے پروگرام 'میرے جھروکے سے' میں مشہور اردو شاعر و ادیب زاہد ابرول نے اردو کے ممتاز شاعر رباعیوں کے بادشاہ ستیہ پال اختر رضوانی کی حیات و خدمات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اختر رضوانی اردو کے ایسے شاعر تھے جنھوں نے مشکل حالات میں بھی اپنے شعری ذوق وشوق کو قائم رکھا اور تاحیات زبان و ادب کی بہترین خدمات انجام دیتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ اختر رضوانی نے 'ملاپ' لاہور سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ برٹش حکومت کے خلاف اپنی شعلہ بار نظموں کے سبب انھیں گرفتار کیا گیا۔ جب وہ رہا ہو کر لوٹے تو بھی انھوں نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور وہ اپنی شعلہ بیانی سے ملک کے عوام میں آزادی کے تئیں جوش و جنون پیدا کرتے رہے۔ زندگی اُن کی مسلسل تکلیفوں اور محرومیوں میں گزری لیکن عزم اور حوصلے کا دامن نہیں چھوڑا اور ادب کی خدمت کرتے رہے۔ زندگی کے آخری دور میں بیوی اور اکلوتے بیٹے کی موت نے انھیں توڑ کر رکھ دیا اور وہ دیوانگی کے عالم میں شہر شہر بھٹکتے رہے۔ اُن کی موت کب اور کہاں ہوئی اس بارے میں بھی کوئی مصدقہ اطلاع نہیں ہے۔ زاہد ابرول نے بتایا کہ اختر رضوانی کا آزادی سے پہلے کا کلام دستیاب نہیں ہے لیکن اُن کی رباعیوں پر مشتمل تین مجموعے 'فکر و جذبہ'، 'رنگ و سروز' اور 'خد و خال' تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اختر رضوانی نے اپنے ذاتی دکھ درد کے علاوہ عوام کے دکھ درد کے بارے میں بھی خوب لکھا۔ زاہد ابرول نے اپنے مضمون میں اس بات پر دکھ ظاہر کیا کہ اتنے بہترین شاعر اور ادیب کو آج فراموش کر دیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں نئی نسل سے واقف کرایا جائے اور اُن کے کلام کو از سر نو منظر عام پر لایا جائے۔

'ادبی فورم' کے تحت منعقدہ آج کے دوسرے پروگرام 'اردو شعری نشست' کی صدارت اردو کے ممتاز شاعر و صحافی اور ساہتیہ اکادمی اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندر بھان خیال نے کی۔ اس نشست میں تحسین منور، کوثر مظہری، فریاد آزر اور عازم کوہلی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ زاہد ابرول نے بھی اس محفل میں اپنا کلام سنایا۔ اس موقعے پر شہر کی کئی ادب نواز شخصیات شریک محفل تھیں۔

پریس ریلیز: موسیٰ رضا، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 16 ستمبر 2023

دلت ادب: ایک تعارف

نئی دهلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام خصوصی خطبہ بعنوان 'دلت ادب: ایک تعارف' منعقد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر شیوراج سنگھ بے چین نے کی اور خصوصی خطبہ ڈاکٹر جے پرکاش کردم نے دیا۔ تقریب کا آغاز مہمانوں کے استقبال سے ہوا۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر نجمہ رحمانی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے خصوصی لیکچرز سیریز کے متعلق بتایا اور کہا کہ دلت ادب پر ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں منعقد ہونے والا غالباً یہ پہلا پروگرام ہے۔ ڈاکٹر جے پرکاش کردم نے خصوصی خطبہ دیتے ہوئے دلت ادب پر بہت سی باتیں کہیں جن میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ دلت ادب میں مساوات اور انسانیت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے نیز انھوں نے دلت ادب کو روایت شکن اور روایت ساز بھی بتایا۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر امیتابھ چکرورتی نے ڈاکٹر جے پرکاش کردم کے خطبے میں کہی گئی باتوں کی تائید میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر شیوراج سنگھ بے چین نے صدارتی خطبہ دیتے ہوئے دلت ادب کے اجزا و عناصر پر سیر حاصل گفتگو کی۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر متھن کمار نے نظامت کی۔ اس موقعے پر اردو کے اساتذہ پروفیسر ابوبکر عباد، پروفیسر ارجمند آرا، پروفیسر محمد کاظم، ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر ارشاد نیازی، ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر شاذیہ عمیر موجود تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر مظہر احمد، ڈاکٹر شاہینہ تبسم، ڈاکٹر قمر الحسن، ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ، ڈاکٹر عارف اشتیاق، ڈاکٹر معین الدین بھی شریک تھے۔ پروگرام میں فارسی، انگریزی، تیلگو، عربی اور ہندی کے اساتذہ و ریسرچ اسکالر اور طلبہ و طالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ آخر میں شکریہ کے کلمات ڈاکٹر علی احمد ادریسی نے ادا کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 ستمبر 2023

مشیر الحق قومی سمینار

نئی دهلی: ''اسلامک اسٹڈیز علوم انسانی کا ایک اہم حصہ ہے، یہ ہمیں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، تہذیب و ثقافت اور احوال سے روشناس کراتا ہے۔ موجودہ زمانے میں بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اور ان کا ازالہ علمی تحقیقات کے ذریعے ہی ممکن ہے۔'' ان خیالات کا اظہار مہمان خصوصی ڈاکٹر سفیان احمد، لائبریرین، ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کی بزم تحقیق کی جانب سے منعقد 'دوسرے مشیر الحق قومی سمینار برائے ریسرچ اسکالرس' میں کیا۔ بزم تحقیق کے مشیر ڈاکٹر محمد خالد خان نے استقبالیہ کلمات میں معزز مہمانوں کا تعارف کرایا اور سمینار کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کا بنیادی مقصد نئے طلبہ و طالبات کو میدانِ تحقیق کی طرف مائل کرنا اور انھیں اس کی اہمیت سے روشناس کرانا ہے۔ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز اور بزم تحقیق کے صدر پروفیسر اقتدار محمد خاں نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ ہم نے اس سمینار کو پروفیسر مشیر الحق جیسی شخصیت کی طرف منسوب کیا ہے جن کا شمار دور جدید کے اجتہادی فکر رکھنے والے اہم مفکرین میں ہوتا ہے۔ بزم تحقیق کے سکریٹری لعل چاند نے بزم تحقیق کی سالانہ سرگرمیوں کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ محمد حسان خان نے بزم تحقیق کے سالانہ میگزین 'ای جرنل آف اسلامک اسٹڈیز' بہ موضوع 'تعلیم میں ہندوستانی مسلمانوں کی خدمات' کا تعارف پیش کیا، اسی دوران اس کا اجرا

بھی عمل میں آیا۔ نظامت کے فرائض شاہ اجمل فاروق ندوی نے انجام دیے اور مہمانوں کا شکریہ محمد منور کمال اور تائید الاسلام نے ادا کیا۔ سمینار میں افتتاحی اور اختتامی نشستوں کے علاوہ چار علمی نشستوں کا انعقاد ڈاکٹر محمد مشتاق، ڈاکٹر محمد ارشد، ڈاکٹر محمد عمر فاروق اور ڈاکٹر خورشید آفاق کی زیر صدارت ہوا جن میں ملک کی مختلف جامعات سے آئے ہوئے تیس سے زائد ریسرچ اسکالرس نے مختلف موضوعات پر اپنے مقالات پیش کیے۔ علمی نشستوں کی نظامت وسیم احمد، شکیل الرحمٰن، اقرا فاطمہ اور عروسہ قمر نے کی۔ اختتامی نشست پروفیسر سید شاہد علی، سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کی زیر صدارت منعقد ہوئی جس میں انھوں نے ریسرچ اسکالرس کو تحقیق و تصنیف کے اصول و ضوابط سے واقف کراتے ہوئے فرمایا کہ تحقیق کے دوران بار بار سیکھنے اور 'غیر ضروری مباحث کو نظر انداز کرنے کا عمل جاری رکھنا چاہیے، نیز انھیں مقالے کی تکمیل کے بعد اس کا ناقدانہ جائزہ لینا چاہیے۔ آخر میں شرکا اور رضا کاروں کو سرٹیفکیٹ اور سمینار کٹ سے نوازا گیا۔ سمینار میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے جملہ اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 15 ستمبر 2023

اتر پردیش

ہندوستان میں فارسی زبان وادب

علی گڑھ: شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں یک روزہ قومی سمینار بعنوان 'ہندوستان میں فارسی زبان وادب' کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت سابق صدر شعبۂ فارسی، بانی مرکز تحقیقات فارسی پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے کی۔ مہمان خصوصی پروفیسر قاضی جمال نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر عارف نظیر مہمان اعزازی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ صدر شعبۂ فارسی پروفیسر رعنا خورشید نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا اور سمینار کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ ریسرچ اسکالرز کے اندر تحقیق وتنقید کی بصیرت، تحریر وتقریر کی صلاحیت اور قوت ارادی کو مضبوط کرنے کی غرض سے اس سمینار کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے اپنے کلیدی خطبے میں فارسی زبان وادب پر سیر حاصل گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس بات کو بخوبی تسلیم کرتے ہیں کہ اردو زبان میں سب سے زیادہ حصہ فارسی کا ہے۔ انھوں نے فارسی شعر کی سمجھ، اس کی باریک بینی، فارسی شعر کے سبک اور زبان وادب پر روشنی ڈالی۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر عارف نظیر نے فارسی اور سنسکرت کے حوالے سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ زبان کئی صدیوں تک نہ صرف سرکاری بلکہ ادب کی زبان رہی ہے اور اس میں سنسکرت کی کئی اہم کتابوں کے تراجم بھی ہوئے ہیں۔ صدر جلسہ پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے سمینار سے متعلق اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے صدر شعبہ فارسی و تمام اساتذہ کرام کو مبارکباد پیش کی کہ ریسرچ اسکالرز کے لیے ایسی بزم کا اہتمام کیا گیا۔ انھوں نے ریسرچ اسکالرز کو مفید مشوروں سے نوازا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ فارسی ہندوستان میں صرف شعر وادب کی ہی زبان نہیں رہی بلکہ اس زبان میں تاریخ، فرہنگ، تذکرے، طب، موسیقی اور جغرافیہ جیسے بہت سے اہم ذخیرے موجود ہیں جن سے ابھی بھی دنیا کو روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ صدارتی کلمات کے بعد ایم اے کی طالبہ عرشی نے فارسی غزل پیش کی اور پھر شعبۂ فارسی کی ریسرچ اسکالر راحیلہ تبسم نے اظہار تشکر کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد تین ادبی نشستوں میں مختلف یونیورسٹیوں سے آئے ریسرچ اسکالرز اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز نے اپنے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 26 ستمبر 2023

بہار

ساحر لدھیانوی اور معاصر شعرا

پٹنہ: ساحر ایک ایسا شاعر ہے جس نے اپنی شاعری میں سادہ بیانیہ کو جگہ دی ہے۔ ساحر کی شاعری صنائع وبدائع

سے پاک ہے، لیکن ان کی شاعری میں محاکات، مجسمہ سازی، پیکر تراشی اور مصوری کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ ساحر نے محبت کے نغموں کو تلخیوں کا بیانیہ بنا دیا ہے۔ یہ باتیں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی نے ساحر لدھیانوی اور معاصر شعرا کے عنوان سے شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں منعقدہ دو روزہ قومی سمینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہیں۔

شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں دو روزہ قومی سمینار بعنوان 'ساحر لدھیانوی اور معاصر شعرا' منعقد ہوا۔ 25 ستمبر کو افتتاحی اجلاس کی صدارت جناب چندر بھان خیال، کنوینر اردو مشاورتی بورڈ ساہتیہ اکادمی نے کی، جبکہ کلیدی خطبہ خواجہ محمد اکرام الدین نے پیش کیا۔ خیر مقدمی کلمات ساہتیہ اکادمی کے آفیسر محمد موسیٰ رضا نے پیش کیے اور صدر شعبہ اردو ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے ابتدائی کلمات پیش کرتے ہوئے ساحر لدھیانوی کے تعلق سے بڑی قیمتی اور کارآمد باتیں پیش کیں۔ انھوں نے کہا کہ ساحر مثبت قدروں کا شاعر ہے، ساحر خوابوں اور امیدوں کا شاعر ہے۔

پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر گریش کمار چودھری نے سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ ساحر خوابوں کا شاعر ہے۔ ہمیں بھی خواب دیکھنا چاہیے اور اس کو شرمندہ تعبیر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ڈاکٹر شکیل احمد خاں نے اپنی تقریر میں طلبہ کو مشورہ دیا کہ آپ خصوصی طور پر ساحر کے دو مجموعے پرچھائیاں اور تلخیاں کا مطالعہ ضرور کریں۔

سابق وائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اپنے خطاب میں کہا کہ نظیر اکبرآبادی کے بعد ساحر لدھیانوی سب سے بڑا عوامی شاعر ہے۔ اس لیے ساحر کو نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے۔

افتتاحی اجلاس کے صدر معروف شاعر جناب چندر بھان خیال نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ساحر کرب و احتجاج کا شاعر ہے۔ اخیر میں ڈاکٹر سورج دیو سنگھ نے تمام مہمانوں اور شرکائے سمینار کا شکریہ ادا کیا۔

افتتاحی اجلاس کے اختتام کے فوراً بعد پہلا تکنیکی اجلاس شروع ہوا جس کی صدارت سید شاہ حسین احمد اور نعیم انیس نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر منہاج الدین نے انجام دیے۔ اس سیشن میں جن مندوبین نے اپنے مقالات پیش کیے، ان میں پروفیسر کاظم 'وطن کا تصور اور ساحر کا شعری سیاق' اور ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا 'ساحر کا فکر وفن' اہم ہیں۔ پروفیسر سید شاہ حسین احمد نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا

کہ ساحر کی شاعری سادہ بیانی کی عمدہ مثال ہے۔ ساحر کا اسلوب سخن ایسا ہے جو براہ راست دلوں پر اثر کرتا ہے۔ ڈاکٹر نعیم انیس نے کہا کہ ساحر کی شاعری فلاح انسانی کا ایسا مرقع ہے جس کی بازگشت دیر تک سنائی دے گی۔

سیمنار کے دوسرے تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر جانکی پرساد شرما اور پروفیسر محمد کاظم نے کی۔ دوسرے سیشن کا پہلا مقالہ جناب حقانی القاسمی نے 'ساحر لدھیانوی اور معاصر شعرا' کے عنوان سے پیش کیا جبکہ دوسرا مقالہ ڈاکٹر نعیم انیس (کلکتہ) نے 'ادبی اور فلمی دنیا کا رومانی شاعر: شکیل بدایونی' پر پیش کیا۔

پروفیسر جانکی پرشاد نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ ساحر اپنے معاصرین میں اس لیے منفرد ہیں کہ انھوں نے اپنی راہ الگ نکالی اور اپنی شاعری کی اساس اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات اور خود پر بیتے ہوئے حادثات پر رکھی۔

26.09.23 کو سیمنار کے تیسرے اجلاس کا آغاز اسامہ غنی کی غزل خوانی سے ہوا۔ تیسرے اجلاس کی صدارت جناب حقانی القاسمی اور پروفیسر محبوب اقبال نے کی جبکہ نظامت محمد عطاء اللہ شمسی نے کی۔ اس سیشن میں آصف جمال، پرویز احمد، ڈاکٹر منور عالم، ڈاکٹر ریحان احمد قادری نے مقالے پیش کیے۔ امان احمد (پٹنہ) نے اپنا مقالہ 'اختر الایمان کی نظم نگاری' پر پڑھا۔

جناب حقانی القاسمی نے کہا کہ ساحر نے دنیا کو بہت کچھ دیا اور اگر کچھ نہ دیا ہوتا تو دنیا کو خواب ضرور دیے ہیں۔ پروفیسر محبوب اقبال نے کہا کہ فلمی دنیا میں رہ کر بھی ساحر نے اپنے ادبی تخلیقی جوہر سے فلمی شاعری کو بھی تخلیقی شاعری کے ہم پلہ بنا دیا۔

سیمنار کے چوتھے تکنیکی اجلاس کی مجلس صدارت میں جناب ڈاکٹر حامد علی خان اور ڈاکٹر قاسم خورشید شامل تھے۔ نظامت ڈاکٹر عارف حسین نے کی۔ اجلاس کا آغاز محمد فیاض احمد کی غزل خوانی سے ہوا۔ اس سیشن میں پروفیسر محبوب اقبال، پروفیسر مظہر کبریا،، ڈاکٹر جلال الدین، ڈاکٹر زرنگار یاسمین، ڈاکٹر عبدالحئی نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ شہواز انصاری، محمد اشتیاق احمد، شبنم انصاری نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔

ڈاکٹر حامد علی خان نے کہا کہ بلیغ فکر ونظر اور زبان وبیان کے اعتبار سے ساحر کی شاعری اردو کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ ڈاکٹر قاسم خورشید نے کہا کہ ساحر کی شاعری حقیقت میں رومان اور رومان میں حقیقت کا انوکھا سنگم ہے۔

سیمنار کے کا پانچویں اور آخری تکنیکی اجلاس کی صدارت جناب پروفیسر جاوید حیات اور خورشید اکبر نے کی۔ اس سیشن میں احسان حسن، گلستان انجم، کمال الدین احمد، عائشہ پروین نے اپنے مقالے پیش کیے۔

پروفیسر جاوید حیات نے کہا کہ ساحر کی شاعری میں توازن اور تعمیری رجحان فکر کو مرکزیت حاصل ہے۔ خورشید اکبر نے کہا کہ ساحر عوامی شاعر نہیں ہے لیکن عوام پسند شاعر ہے۔

پانچویں اجلاس کے اختتام کے ساتھ ہی اختتامی اجلاس کا سیشن شروع ہوا جس میں حامد علی خان، ابوبکر رضوی، توقیر عالم اور شہاب ظفر اعظمی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں صدر شعبہ اردو ڈائرکٹر سیمینار ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے ساحر کے فکر وفن پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالنے کے بعد ساہتیہ اکادمی نئی دہلی اور پٹنہ یونیورسٹی کا شکریہ ادا کیا جن کے اشتراک وتعاون سے یہ کامیاب سیمینار منعقد ہوا۔

شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر سورج دیو سنگھ نے سیمینار میں شرکت کرنے والے تمام مہمانان وسامعین کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، بہار 28 ستمبر 2023

ادب کا روح سے بہت گہرا تعلق ہے

مدھے پورہ: مادری زبان کوئی بھی ہو، وہ بہت میٹھی و شیریں ہوتی ہے، اس اعتبار سے کسی ایک زبان کو کسی دوسری زبان پر فوقیت نہیں دی جا سکتی، یہی وجہ ہے کہ مادری زبان میں علم سیکھنے پر زور دیا جاتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کیا۔ وہ شعبہ اردو بی این منڈل یونیورسٹی میں طلبہ سے خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے ادب کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ادب کا روح سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ تعلق جتنا مضبوط ہوگا اس کا اثر بھی اسی طرح سامنے آئے گا۔ مسلسل لکھتے پڑھتے رہنے سے اس میں مزید نکھار آئے گا۔ انھوں نے طلبہ کو نصیحت کی کہ وہ ہر دن تھوڑا تھوڑا لکھیں اور اپنے اساتذہ کو دکھائیں، پھر اساتذہ کے ذریعے کی گئی اصلاح پر غور وفکر کریں تاکہ دوبارہ وہ غلطی آپ کی تحریر میں راہ نہ پا سکے۔ اس سے آپ کی تحریر میں سدھار آئے گا اور آپ کے علم میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد احسان نے کہا کہ کسی زبان کا سیکھنا مشکل نہیں ہے، مسلسل محنت اور سیکھنے کا جذبہ ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے، اگر آپ پوری توجہ، لگن اور دیانت داری سے کچھ حاصل کرنا چاہیں گے تو دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے میدان میں ماہر ہونے سے نہیں روک سکتی۔ ڈاکٹر نظام الدین احمد نے طلبہ سے کہا کہ آپ لوگ پڑھنے کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ لکھنے کی مشق بھی کرتے رہیں اس سے آپ کی صلاحیتوں میں بتدریج اضافہ ہوگا۔ شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر سجاد اختر نے مہمان خصوصی ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی کا تعارف کراتے ہوئے ان کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات پر روشنی ڈالی۔ سابق صدر شعبہ پروفیسر امان اللہ خاں نے اپنے مختصر خطاب میں طلبہ کو خوب محنت سے پڑھنے کی تلقین کی اور کہا کہ آپ ہی مستقبل کے ادیب ونقاد ہیں۔ اس سے قبل مہمان خصوصی پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی کو شال اور گلدستہ پیش کر کے شعبہ اردو کے اساتذہ نے اعزاز سے نوازا۔ اس موقعے پر اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں مختلف شعبوں کے ریسرچ اسکالر اور طلبا وطالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اکتوبر 2023

پنجاب

اردو کی متصوفانہ روایت

پانی پت / چنڈی گڑھ: شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں خواجہ میر درد اور فانی بدایونی کے یوم پیدائش کے موقعے پر 'متصوفانہ شعری روایت (بیاد میر درد و فانی بدایونی)' کے عنوان سے ایک خصوصی خطبے کا انعقاد کیا گیا، جس میں پروفیسر ریحانہ پروین نے بطور مہمان خصوصی شرکت کرتے ہوئے میر درد اور فانی بدایونی کی متصوفانہ شاعری کی خصوصیات کے متعلق خطاب کیا۔ پروفیسر ریحانہ نے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی مختلف خانقاہوں کے تعلق سے بات کرتے ہوئے کہا کہ کیسے اردو شاعری کی روایت میں متصوفانہ شاعری پروان چڑھی اور کیسے امیر خسرو اور بابا فرید سے ہوتے ہوئے یہ سلسلہ ان شعرا تک آیا۔ پروفیسر ریحانہ نے ان شاعروں کے کلام سے تصوف کی مثالیں پیش کیں۔ بعد ازاں شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر علی عباس نے تصوف کی اصل کیا ہے اور اس کی پہچان کیسے کی جا سکتی ہے، اس پر پر مغز گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ متصوفانہ شعری روایت کے ابتدائی نقوش بصرہ میں ملتے ہیں، جہاں سے دو نظریے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک حسن بصری نظریہ جس میں وہ خوف خدا اور جنت و جہنم کے بنیادی عقائد کو اصل عبادت کی روح تصور کرتے ہیں اور دوسرا نظریہ رابعہ بصری کا جن کے مطابق ہم خدا کی عبادت صرف اس لیے نہیں کرتے کہ ہمیں خدا کا خوف ہے بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ خدا نے ہم سے اس کا عہد و پیمان لیا ہے۔ اللہ کی ذات نے ارض وسما کی تخلیق

کی اس لیے ہم اس کی عبادت کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کی تمام علامتیں فارسی سے آئی ہیں اور کیسے ہم ان کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ بت کدہ، مے کدہ، مندر، مسجد اور دیگر علامتوں اور استعاروں کا شعر میں ہونا اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس میں مجازی کے علاوہ تصوف کے معنی بھی پوشیدہ ہوسکتے ہیں۔ نظامت کے فرائض شعبہ کے ریسرچ اسکالر محمد سلطان نے انجام دیے۔ شعبۂ اردو کی استاد ڈاکٹر زرین فاطمہ اور ان کی ہمنواؤں نے فانی بدایونی کی ایک غزل پڑھ کر اس محفل کا آغاز کیا۔ بعدہ فارسی اور اردو طلبہ وطالبات نے میر درد و فانی بدایونی کی مختلف فارسی اور اردو غزلیں پڑھیں۔ آخر میں موجود مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر ذوالفقار علی نے مختصراً اس بات کی وضاحت کی کہ ہم صوفیانہ اور غیر صوفیانہ شعر میں فرق کیسے کرسکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جس شعر کے معنی ہم عشق حقیقی اور عشق مجازی میں بانٹ نہ سکیں یا اس میں فرق نہ کرسکیں کہ وہ شعر صوفیانہ شعر ہے۔ انھوں نے کہا کہ صوفی ہونا اور صوفیانہ شاعری کرنا دونوں الگ الگ باتیں ہیں، ان کو جوڑ کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ شعبہ کے ریسرچ اسکالر جسپریت سنگھ نے میر درد کی ایک غزل گنگنائی اور ریسرچ اسکالر رضوانہ کوثر اور خلیق اعوان نے بھی ان شعرا کی غزلیں پیش کیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 ستمبر 2023

تلنگانہ

اردو پر فارسی کے اثرات

حیدرآباد: زبانوں کی صورت گری میں دیگر زبانوں کے اسماوصفات آسانی سے منتقل ہوجاتے ہیں۔ اردو نے فارسی سے زیادہ تر ایسے اسما قبول کیے ہیں جن سے خاص وعام ہر ایک کو سابقہ پڑتا ہے جس کی وجہ سے اردو زبان کے رنگ وروپ میں نکھار آیا ہے۔ یہ الفاظ ثقافتی نوعیت کے ہونے کی وجہ سے اردو کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی داخل ہوگئے ہیں کیونکہ ہندوی زبانوں میں ان کے مترادف یا متبادل الفاظ ہیں ہی نہیں۔ آج ادبی، لسانی وتہذیبی تبدیلیوں کے باوجود ہمارے سیاسی مقررین کی زبان سے بھی اکثر فارسی الفاظ بے تحاشہ وبے ساختہ نکل جاتے ہیں۔ یہ فارسی کا جادو ہے جو سر چڑھ کے بولتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اشرف رفیع، سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ نے 'اردو پر فارسی کے اثرات' کے زیرعنوان شعبۂ فارسی ومطالعات وسط ایشیا، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں منعقدہ ایک توسیعی لیکچر میں کیا۔ پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے صدارتی خطاب میں اردو اور فارسی کے شعرا، متقدمین کے کلام کا تقابلی احاطہ کرتے ہوئے دونوں ہی زبان کی لطافت و جمالیات کو واضح کیا۔ ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں، کنوینر وصدر شعبہ نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ پروفیسر عزیز بانو، ڈین اسکول آف لینگویجز نے بحیثیت مہمان اعزازی شرکت کرتے ہوئے اپنے خطاب میں موجودہ دور میں فارسی زبان کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر قیصر احمد ایسوسی ایٹ پروفیسر نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 ستمبر 2023

مادری زبان اور ہماری ذمے داریاں

حیدرآباد: نئی نسل کو مادری زبان اردو سے جوڑنا ضروری ہے تاکہ اس زبان کی آبیاری کے لیے ایک اور نسل تیار ہوسکے۔ مسلمانوں نے یوروپی اقوام سے بہت کچھ اپنایا لیکن ان کی مادری زبان سے محبت کرنے کا جو جذبہ ہے وہ اپنا نہیں سکے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید اسلام الدین مجاہد ریٹائرڈ پروفیسر اردو آرٹس کالج نے فری پریس ایڈیٹرس اینڈ جرنلسٹس فیڈریشن کے زیراہتمام عالمی یوم مادری زبان کی مناسبت سے منعقدہ ادبی اجلاس بعنوان مادری زبان اور ہماری ذمے داری سے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے کیا جس کا انعقاد FPS روبرو وکٹوریہ ہوٹل بی بی بازار چوراہا میں کیا گیا تھا۔ اس ادبی اجلاس کی صدارت جناب طاہر رومانی صدر فیڈریشن وایڈیٹر ترکش ہند نے کی۔ اجلاس کے ایک اور مہمان ڈاکٹر ناظم الدین ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ نظام آباد نے اپنے خطاب میں کہا کہ اقوام عالم جس طرح اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہیں اسی طرح ہمیں بھی اردو ذریعہ تعلیم سے تعلیم حاصل کرتے ہوئے فخر ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ مادری زبان سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے میں نہ صرف یہ کہ بچے کی صلاحیت اور لیاقت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ذہانت بھی ابھرتی ہے۔ جناب طاہر رومانی صدر فیڈریشن نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ زبانوں کی بقا اور ترقی کے لیے حکومتوں کی سرپرستی بھی ضروری ہے، مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو بھی تمام تر سہولتیں اور مواقع میسر آنے چاہئیں۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 30 ستمبر 2023

مہاراشٹر

میرا ادبی سفر

ممبئی: ممبئی یونیورسٹی شعبۂ اردو کے تحت 'میرا ادبی سفر' کے عنوان پر اظہار خیال کرتے ہوئے مشہور بزرگ شاعر، عروض داں اور ناقد ڈاکٹر شعور اعظمی نے واضح طور پر کہا کہ مطالعے کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ شعبۂ اردو نے گزشتہ سال سے 'میرا ادبی سفر' کے عنوان سے یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ مذکورہ تقریب کی صدارت ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد (صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی) نے کی اور مہمان خصوصی ڈاکٹر سکینہ خان، (شعبۂ فارسی، ممبئی یونیورسٹی) تھیں۔ اس تقریب میں شعور اعظمی نے اپنا تعارف تعلیمی سفر اور ممبئی میں بزرگوں کی علمی و ادبی صحبتوں سے استفادہ پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے اپنے ادبی سفر کا احوال بیان کیا۔ اپنے ادبی سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر شعور اعظمی نے ممبئی کے مشاعروں، نشستوں، ممبئی کے کتب خانوں، ممبئی کے ادبا و شعرا اور ادبی حلقوں پر کچھ اس انداز میں گفتگو کی کہ گزشتہ پچاس سال کے ممبئی میں اردو علمی و ادبی منظرنامہ کو پیش کردیا۔ مہمان خصوصی شعبۂ فارسی کی صدر سکینہ خان نے بھی شعور اعظمی کے انداز کی ستائش کی۔ صدارتی خطبہ میں ڈاکٹر عبداللہ امتیاز نے کہا کہ شعور اعظمی بھلے اپنے بارے میں کچھ بھی کہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے سامنے تاریخ پیش کی ہے اور اپنے تجربات کو پیش کیا ہے جو کہ اہم مواد ہے۔ انھوں نے کہا کہ شعور اعظمی کا شمار استاد شاعروں میں ہوتا ہے۔ اس موقعے پر اہم شخصیات موجود تھیں۔ تقریب کی نظامت شعبہ کے استاذ ڈاکٹر قمر صدیقی نے کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 ستمبر 2023

مغربی بنگال

عبدالرزاق ملیح آبادی: شخصیت وفن

کلکتہ: مولانا ابوالکلام آزاد سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی رفاقت کا عرصہ 38 برسوں پر محیط ہے، لیکن اتنی قربت

اور ہم آہنگی کے باوجود تحریر کے معاملے میں انھوں نے مولانا آزاد کی پیروی نہیں کی بلکہ اپنا منفرد اسلوب اختیار کیا۔ مولانا آزاد جہاں مقفی اور مسجع زبان لکھتے تھے تو وہیں مولانا ملیح آبادی نے عام فہم اور سادہ زبان اختیار کی۔" ان خیالات کا اظہار گزشتہ روز سینئر صحافی معصوم مرادآبادی

نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی پر قومی سیمینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ مغربی بنگال اردو اکادمی کے زیر اہتمام کلکتہ میں منعقدہ اس سیمینار کی صدارت ممبر پارلیمنٹ محمد ندیم الحق نے کی اور مہمان خصوصی کے طور پر بزرگ صحافی محمد وسیم الحق شریک ہوئے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر دبیر احمد نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

دہلی سے تشریف لائے سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے اپنے کلیدی خطبے میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی شخصیت اور مجموعی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ ''امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے دست راست مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنے علم وفضل اور کمالات سے تاریخ کے صفحات پر گہرے نقوش چھوڑے، مگر ان کی جیسی پذیرائی ہونی چاہیے تھی، وہ نہیں ہوسکی۔''

مہمان خصوصی محمد وسیم الحق نے کہا کہ مغربی بنگال اردو اکادمی نے عبدالرزاق ملیح آبادی پر سیمینار منعقد کرکے اپنا فرض منصبی ادا کیا ہے۔ ان کا اخبار روزنامہ 'آزاد ہند' ایک زمانے تک مشرقی ہندوستان کا سب سے بڑا اخبار تھا۔ ان کے اداریے بے لاگ ہوتے تھے۔ ان میں حقائق کے علاوہ ادب کی چاشنی بھی ہوتی تھی۔ صحافی سہیل انجم نے اپنے مقالے میں مولانا آزاد اور مولانا ملیح آبادی کے رشتوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ'' دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم تھے۔ ان کی قربتوں کا اندازہ 'ذکر آزاد' اور 'آزادی کی کہانی' سے ہوتا ہے۔''

سیمینار کے اغراض ومقاصد کے حوالے سے ڈاکٹر دبیر احمد نے کہا کہ 'ہمیں اکابرین کو یاد کرتے رہنا چاہیے۔ ان کی ادبی، ملی، صحافتی اور سماجی خدمات سرمایہ حیات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ہمارا مقصد ایسی شخصیات سے نئی نسل کو روشناس کرانا ہے۔'' اس سیمینار میں مولانا ملیح آبادی کے پوتے انور سعید نے بھی شرکت کی۔ صدارتی تقریر میں اکادمی کے وائس چیئر مین محمد ندیم الحق (ایم پی) نے کہا کہ اس سیمینار سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی پر تحقیق کے نئے گوشے وا ہوں گے۔ سیمینار کے دیگر مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر شمشیر عالم، ڈاکٹر تسلیم عارف، خورشید اختر فرازی، محمد فاروق، امان اللہ محمد، انجم عظیم آبادی، ڈاکٹر سنجر ہلال بھارتی اور فریدہ انور کے نام شامل ہیں۔ آخری دو اجلاس کی نظامت نسیم عزیزی نے کی اور صدارت بالترتیب سہیل انجم اور معصوم مرادآبادی نے کی۔ آخر میں اکادمی کی سکریٹری محترمہ نزہت زینب نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: معصوم مرادآبادی، دہلی، 18 ستمبر 2023

بنگال میں اردو تذکرے کی روایت

ہگلی: 21 ستمبر 2023 بروز جمعرات ہگلی محسن کالج کے

شعبۂ اردو میں یک روزہ سیمینار بعنوان 'بنگال میں اردو تذکرے کی روایت' منعقد کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر عمر غزالی (صدر شعبۂ اردو، ہگلی محسن کالج) نے کی اور افتتاح جناب ڈاکٹر پُرشوتم پرمانک (پرنسپل، ہگلی محسن کالج) نے کیا۔ اپنی ابتدائی تقریر میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر پُرشوتم پرمانک نے اظہار خیال کرتے ہوئے شعبۂ اردو کی کارکردگیوں کو سراہا۔ خیر مقدمی کلمات ڈاکٹر محمد ہمایوں جمیل خان نے بحسن وخوبی ادا کیے۔ کلیدی خطبہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالمنان (سابق صدر شعبۂ اردو، کلکتہ یونی ورسٹی) نے پیش کیا اور اردو تذکرے کی روایت پر بھرپور روشنی ڈالنے کی کوشش کی۔ بنگال میں اردو تذکرے کے حوالے سے ان کی تحقیق وتنقید بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مہیر گھوش (آفیسر، بردوان یونیورسٹی) شریک بزم تھے۔ انھوں نے سیمینار کے انعقاد پر دلی مبارکباد پیش کی اور اس اہم موضوع کے انتخاب پر مسرت کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر چندنا دتا (سکریٹری، ٹیچرس کاؤنسل) اور ڈاکٹر سریش ناتھ بیراگیہ (کوآرڈینیٹر IQAC، ہگلی محسن کالج) نے مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے سیمینار کے تعلق سے اپنی کارآمد گفتگو کی۔ صدر شعبۂ اردو، ڈاکٹر عمر غزالی نے اپنی پرمغز تقریر میں شعبۂ اردو کی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے طلبہ وطالبات کو سیمینار کی اہمیت وافادیت سے آگاہ فرمایا۔ اس کے بعد پروفیسر ڈاکٹر عبدالمنان کو 'مرزا علی لطف لٹریری ایوارڈ -2023' بدست پرنسپل، ہگلی محسن کالج عطا کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ارشاد احمد (اسسٹنٹ پروفیسر، ہگلی محسن کالج) نے کی اور اظہار تشکر تمنا پروین نے کیا۔

سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر عبدالمنان نے کی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر محمد ہمایوں جمیل خان، ڈاکٹر عمر غزالی، ڈاکٹر ارشاد احمد، تمنا پروین، عابد حسن، محمد طیب نعمانی، گلشن آرا، شبنم پروین، شمع عظیم، نیہا پروین، توفیق انصاری اور محمد خورشید عالم نے اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محمد ہمایوں جمیل خان نے کی اور محمد اظہرالدین، آفتاب عالم، محمد ظہیرالدین، دلکشی ترنم، ارم نشاط، زیبا شاہین، نغمہ پروین، بشریٰ نشاط اور داور حسین نے اپنے مقالے پیش کیے۔

پریس ریلیز: محمد ظہیرالدین، ہگلی، 24 ستمبر 2023

اعزاز و اکرام

ڈاکٹر سید احمد خاں

نئی دہلی: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس دہلی اسٹیٹ کے صدر ڈاکٹر شکیل احمد نے ڈاکٹر سید احمد خاں کو بھاگیرتھی ایوارڈ 2023 ملنے پر مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے اپنے

تہنیتی پیغام میں کہا کہ آج کے پرآشوب دور میں قومی یکجہتی کا یہ ایوارڈ قابل ستائش ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگرچہ ڈاکٹر سید احمد خاں کو سرکاری اور غیر سرکاری درجنوں ایوارڈز مل چکے ہیں لیکن یہ ایوارڈ انتہائی اہم ہے کیونکہ یہ نہ صرف ایوارڈ کی شکل میں ایک اعزاز ہے بلکہ آپسی میل جول کی بھارتیہ روایت کو فروغ دینے کی کوشش بھی ہے۔ اس کے لیے ہم بھاگیرتھی سماجک سنسکرتی منچ، ہنومان مندر کناٹ پلیس، نئی دہلی کے ذمے داروں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

آل انڈیا یونانی طبی کانگریس فارمیسی ونگ کے قومی نائب صدر حکیم اعجاز احمد اعجازی دربھنگوی، قومی سکریٹری حکیم نعیم رضا، حکیم رشادالاسلام الہ آبادی اور فارمیسی ونگ دہلی اسٹیٹ کے نائب صدر حکیم آفتاب عالم، حکیم محمد مرتضیٰ دہلوی کے علاوہ طبی کانگریس کے کوآرڈی نیٹر اسرار احمد اجینی، مغشوش احمد اور پریس سکریٹری محمد عمران قنوجی نے بھی مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 15 ستمبر 2023

جمیل مظہر سیانوی

ہاپوڑ: بزم ادب گڑھ مکتیشور کی جانب سے یوم اساتذہ کی مناسبت سے منعقدہ پروگرام میں معراج فیض آبادی ایوارڈ 2023 سے استاد شاعر جمیل مظہر سیانوی کو سرفراز کیا گیا۔ سماجی خدمت گار ڈاکٹر شعیب، عمران علی ایڈووکیٹ چودھری سخاوت حسین ریٹائرڈ داروغہ ریلوے پولیس کے ہاتھوں معراج فیض آبادی ایوارڈ 2023 استاذ شاعر جمیل مظہر سیانوی کو پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر جمیل مظہر سیانوی نے کہا کہ یہ محبت اور خلوص بزمِ ادب گڑھ مکتیشور کے اراکین کی جانب سے مجھے ایوارڈ کی شکل میں ملی ہے۔ پروگرام کے روحِ رواں بدرالدین نے کہا کہ استاد مظہر کو اردو مجلس دہلی کی جانب سے داغ دہلوی ایوارڈ سمیت دیگر ایوارڈ مل چکے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 ستمبر 2023

یامین برکاتی

سنبھل: افسانہ کے تعلق سے الحاج یامین برکاتی سنبھل شہر کے ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے افسانے کی دنیا میں ایک بلند مقام حاصل کیا ہے۔ انھیں انجمن شاہ برکات نے اعزاز سے نوازا ہے۔ واضح ہو کہ اس سلسلے میں ایک مخصوص پروگرام کا انعقاد سرائے ترین واقع البشیر پبلک اسکول میں کیا گیا، جس میں شہر کی تعلیم یافتہ شخصیات نے شرکت کی۔ اس درمیان ڈاکٹر شاکر حسین اصلاحی، پروفیسر عابد حسین حیدری اور شفیق الرحمٰن برکاتی نے اس پروگرام کی غرض و غایت بیان کی اور انھوں نے بتایا کہ الحاج یامین برکاتی کو جو اعزاز پیش کیا گیا ہے وہ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ہے۔ یامین برکاتی کے اب تک بہت سے مجموعے منظرِ عام پر آ کر نہ صرف باذوق افراد سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں بلکہ انھیں سرکاری اداروں سے ایوارڈ بھی مل چکے ہیں، ان اداروں میں لکھنؤ اکادمی اور بہار اردو اکادمی کا نام سرِفہرست ہے۔ یامین برکاتی اردو زبان کی بے لوث خدمات انجام دینے میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔ انھوں نے بچوں سے متعلق بھی لکھا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اکتوبر 2023

ڈاکٹر نواز دیوبندی و ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی

دیوبند: گاندھی جینتی کے موقعے پر اردو ہندی پندرہ روزہ 'دیوبند ٹوڈے' کی جانب سے محلّہ خانقاہ میں واقع شاہ منزل میں منعقد پروگرام میں عالمی شہرت یافتہ شاعر اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر نواز دیوبندی اور ممتاز افسانہ نگار و مصنفہ

ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی کو ان کی ادبی اور تعلیمی گرانقدر خدمات کے اعتراف میں خصوصی اعزاز سے نوازا گیا، اس دوران ماحولیات کے تحفظ کے تحت مہمانوں کو پودے اور گلدستے دے کر ان کی عزت افزائی کی گئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے اپنے خطاب میں کہا کہ آج ہمارے پاس خاندان اور سماج کے تئیں شکایات بہت ہیں، لیکن ہم اس میدان میں تعاون کم کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے ہماری عزت میں کمی آئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ سب سے پہلے ہمیں اپنے خاندان کو پوری عزت اور وقت دینا چاہیے، آج ہم اپنے بچوں پر بہت پیسہ خرچ کر رہے ہیں لیکن انھیں وقت نہیں دے رہے ہیں، اس لیے موجودہ نسل میں عزت، غیرت اور خدمت کے جذبے کی شدید کمی ہے، جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ پبلک گرلز انٹر کالج کی پرنسپل صبا حسیب صدیقی، نوجوان ادیب و شاعر عبدالرحمٰن سیف نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 14 اکتوبر 2023

سید ساجد علی ٹونکی

نئی دهلی: مراد اکیڈمی ٹونک راجستھان کے زیرِ اہتمام منعقدہ ایوارڈ تقریب میں اخلاص و جاں نثاری کے پیکر سید ساجد علی ٹونکی کو ان کی گراں مایہ خدمات کے اعتراف میں 'یومِ مراد سعیدی' ایوارڈ 2023 پیش کیا گیا۔ اردو کے مشہور ادیب نقاد اور محقق سید ساجد علی ٹونکی مردم خیز خطے 'ٹونک' راجستھان سے آتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت ٹونک میں ہی ہوئی۔ انھوں نے بی ایس سی ایم اے اکونومکس اور ایم اے کی اسناد راجستھان یونیورسٹی سے حاصل کیں اور اس کے بعد محکمہ ڈاک میں ملازم ہو گئے۔ پہلے راجستھان میں خدمات انجام دیں اس کے بعد دہلی آ گئے۔ اردو زبان میں ان کی اب تک پندرہ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی کتابوں کو راجستھان اردو اکادمی اور دلی اردو اکادمی نے بارہا انعامات سے بھی نوازا ہے۔ سید ساجد علی ٹونکی راجستھان کے ساتھ ساتھ پورے ہندوستان میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انھیں ان کی کاوشوں کے صلے میں متعدد ایوارڈ سے پہلے ہی نوازا جا چکا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اکتوبر 2023

اجرا

کلیاتِ دل، مرزا غالب اور جان کیٹس

رامپور: معروف علمی و ادبی ادارہ صولت پبلک لائبریری کی جانب سے ایک پروقار تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ صولت لائبریری کے حمایت ہال میں منعقدہ تقریب کے دوران معروف شاعر دل تاج محلی کی کلیاتِ دل اور پروفیسر زیڈ حسن کی کتاب 'مرزا غالب اور جان کیٹس' کا اجرا عمل میں آیا۔ ڈاکٹر محمود علی خاں صدر صولت لائبریری کے زیرِ صدارت منعقدہ تقریب میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے عالمی شہرت یافتہ شاعر اظہر عنایتی جلوہ افروز رہے جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شعیب رضا خاں وارثی اسسٹنٹ ڈائرکٹر این آئی او ایس نئی دہلی نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ تقریب کے آغاز سے قبل صولت پبلک لائبریری کے صدر، سکریٹری اور مجلس مشاورت کے اراکین نے تمام مہمانوں کی ردا پوشی کی اور ان کو نشانِ یادگار پیش کر کے استقبال کیا۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی اظہر عنایتی، مسلم ڈگری کالج مراد آباد کی معاون پروفیسر ڈاکٹر رباب انجم، گورنمنٹ گرلز پی جی کالج رامپور کے معاون پروفیسر ڈاکٹر الف ناظم، پروفیسر دہلی یونیورسٹی ڈاکٹر ظہیر رحمتی، خلیق النساء بیگم، اور سیما گوہر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ نظیر اکبرآبادی کے شہر اکبرآباد (آگرہ) میں جہاں محبت کی لازوال نشانی جسے ساری دنیا تاج محل کے نام سے جانتی ہے۔ اسی تاج سے محبتیں نکل کر ایک دل میں منتقل ہو گئیں اور اس شخص کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محبتوں کے اس سرمایے کو دوسروں تک بنا کسی تاخیر کے بانٹ رہا ہے جسے ہم مرزا وسیم بیگ المعروف بہ دل تاج محلی کے نام سے پہچانتے ہیں۔ اردو ادب میں بہت کم ایسی شخصیات ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے بہ یک وقت کئی خوبیوں اور صفتوں سے نوازا ہے۔ دل تاج محلی ان میں سے ایک ہیں۔ وہ ایک معتبر اور باشعور شاعر ہیں جن کے یہاں فکر کی گہرائی، سوچ میں وسعت، انسانی مسائل کا تحقیقی اظہار، ان کی شاعری کا حسن ہے۔ دل تاج محلی اردو، ہندی کے علاوہ انگریزی میں بھی بے تکان لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر محمود علی خاں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ پروفیسر ظہیر حسن المعروف ڈاکٹر زیڈ حسن ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جنھوں نے کبھی درازیٔ عمر کے اثر کو قبول نہیں کیا۔ وہ عمر کی روانی کے ساتھ خود کو اور بھی ذمے دار، فرض شناس، متحرک، فعال اور سرگرم محسوس کرنے لگے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دونوں ادبی شخصیات قابلِ احترام ہیں۔ آخر میں صولت پبلک

لائبریری کے سکریٹری ڈاکٹر عدنان خاں ضیائی نے سبھی مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 11 ستمبر 2023

شہرت (اردو) اور 'دھنک' ہندی

لکھنؤ: جدید لب ولہجہ کے معروف شاعر حیدر علوی کی بیک وقت اردو ہندی میں شائع شدہ کتابوں کی رونمائی ہوٹل میزبان انٹرنیشنل واقع پرانا آرٹی او آفس، لاٹوش روڈ لکھنؤ میں ہوئی۔ اس پرتکلف ادبی تقریب کا اہتمام وانعقاد ڈاکٹر غفران راشد اور ڈاکٹر رئیس احمد خاں نے کیا۔ نظامت رضوان احمد فاروقی اور فریضہ صدارت مستند افسانہ نگار و صحافی احمد ابراہیم علوی نے انجام دیا۔ مہمانان خصوصی ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، مرزا شارق لاہرپوری، اور ایڈوکیٹ زبیر انصاری رہے۔ صدر ذی وقار نے خطاب کرتے ہوئے کہا 'شہرت' اور 'دھنک' کے شاعر نے اپنی شاعری سے الگ راہ بنائی ہے۔ حیدر کی شاعری انفرادیت کے ساتھ غور وفکر کے لیے مجبور کرتی ہے، تازگی اور توانائی کا قدم قدم پر احساس دلاتی ہے۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی کے مطابق کلام کی انفرادیت ہی شاعر کے لیے دلیل عظمت ہے۔ ان کے چہرے اور شاعری میں بڑی مماثلت ہے۔ ایڈوکیٹ زبیر انصاری نے حیدر علوی کو بہترین انسان قرار دیا۔ کنوینر پروگرام ڈاکٹر غفران راشد نے کہا حیدر علوی کی شاعری سے بہتر توقعات ہیں۔ جواں سال قلم کار حفیظ قدوائی نے اپنے مقالے میں کہا حیدر علوی کی شاعری میں زمیندارانہ ماحول اور تعقلداری کی خوشبو رچی بسی ہے مگر مزاج قلندروں جیسا ہے۔ شاعر وصحافی رضوان احمد فاروقی کی نظر میں یہ کسی کے پیروکار نہیں ہیں، ان کا اپنا انداز اور جداگانہ لہجہ ہے۔ یہی مقام امتیاز ہے۔ عطیہ بی نے مبارکباد کے ساتھ شاعری کو نوجوانوں کے لیے کارآمد بتایا۔ پروفیسر جمال نصرت نے حیدر علوی کی شاعری کو لائق تحسین وتقلید بتایا، اور کہا ان کے جذبوں کی تشہیر کی ضرورت ہے۔ استاذ شاعر محمد فاروقی جاذب، رفعت شیدا صدیقی نے منظوم تاثرات پیش کیے۔ اس موقعے پر حیدر علوی کے استاذ مرزا شارق لاہرپوری نے منتظمین، شرکا اور مقررین کو خصوصی مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 اکتوبر 2023

تذکرۂ قراءِ ہند

سہارنپور: دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تجوید وقرأت کے سابق صدر وشیخ القراء اور رکن رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ قاری ابوالحسن اعظمی کی نئی کتاب 'تذکرۂ قراءِ ہند' کا اجرا دارالعلوم صدیقیہ ٹلہیڑہ، احمد پور، روڑکی (ہریدوار) میں مولانا ندیم الواجدی، ادارہ کے بانی ومہتمم مولانا قاری محمد اکرام، قاری شعیب جلال آبادی، مولانا محمود الحسن دہلی، مولوی محمد بلال، بابو اسلام الدین گڑگاؤں، سید وجاہت شاہ، مولانا سالم اشرف قاسمی، مولانا قاری محمد بلال سمیت موقر علماء کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مولانا ندیم الواجدی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ مولانا قاری ابوالحسن اعظمی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے دیگر موضوعات کے علاوہ فن تجوید پر جتنی کتابیں لکھی ہیں ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ ان کی نئی کتاب 'تذکرۂ قراءِ ہند' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ قاری صاحب کی تحریریں اور قلمی خدمات کا دائرہ وسیع ہے، وہ مسلسل اور لگاتار اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں جو ایک ریکارڈ ہے۔ مولانا نورالدین راشد کاندھلہ نے اپنے تحریری پیغام میں کہا کہ پوری انسانیت اور تمام دنیا کے لیے قرآن کریم کا پیغام نجات و ہدایت و رحمت ہے۔ انھوں نے کتاب کے حوالے سے کہا کرنل بسم اللہ بیگ صاحب کی کتاب 'تذکرہ قاریانِ ہند' واحد مرجع ہے جو عمومی طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ کرنل صاحب نے بہت محنت کی، بہت وسیع اور جامع کام کیا ہے مگر علم کا سفر جاوداں اور احوال وسوانح کی دنیا ہری بھری ہے، جس میں ہر وقت نئے نئے شگوفے کھلتے، نئے نئے پھول ظاہر ہوتے اور تازہ تازہ خوشبو عام ہوتی رہتی ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ اس روایت وسلسلے کو آگے بڑھایا جائے، کرنل بسم اللہ بیگ صاحب کے بعد کی منزلوں کی نشاندہی ہو اور ہندوستان میں قرأت وتجوید کے، بعد کے اساتذہ، اہم مراکز اور قاریانِ کرام کی خدمات کا ایک اور مفصل جائزہ تحریر ہو۔ مولانا قاری ابوالحسن اعظمی، نے اس پر توجہ کی اور اپنے مزاج ومعمول اور خاص فیضان الٰہی سے اس پر ایک نئی جامع کتاب تحریر فرمائی ہے، جو امید ہے کہ کرنل بسم اللہ بیگم صاحب کی 'تذکرہ قاریان ہند' کی طرح ایک بڑا مرجع اور تاریخی حوالہ ثابت ہوگی۔ معروف ادیب سید وجاہت شاہ اور معروف شاعر عبداللہ راہی نے منظوم کلام پیش کیا۔ آخر میں ادارے کے بانی ومولانا قیر محمد اکرام نے دعائی کرائی۔ نظامت مولانا بلال قاسمی نے کی۔ پروگرام کے کنوینر مولانا قاری محمد اکرام اور مولانا مستجاب الرحمٰن نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 ستمبر 2023

مقالات سرسید کی نویں جلد اور جی ٹوئنٹی سے متعلق موضوعات پر پانچ کتب کا اجرا

علی گڑھ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی کی مرتب کردہ 'مقالاتِ سرسید' کی نویں جلد اور جی 20 سے متعلق مختلف موضوعات پر سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شائع کردہ پانچ کتب کا اجرا یہاں سرسید اکیڈمی کے زیر اہتمام منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں کیا گیا۔ مقالات سرسید کو اکیڈمی نے تصحیح وتہذیب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کی نویں جلد اسلامی دنیا اور واقعات حاضرہ پر سرسید احمد خاں کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں 45 مضامین شامل ہیں۔ کتابوں کا اجرا وزارت سماجی انصاف و اختیار دہی کے سکریٹری مسٹر سوربھ گرگ آئی اے ایس، ریلائنس انڈسٹریز کے مسٹر روہت بنسل اور اے ایم یو وائس چانسلر پروفیسر محمد گلریز نے اے ایم یو رجسٹرار مسٹر محمد عمران آئی پی ایس، سرسید اکیڈمی کے ڈائرکٹر پروفیسر علی محمد نقوی اور سرسید اکیڈمی کے ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شاہد کی معیت میں کیا۔ جی 20 سے متعلق جن دیگر کتابوں کا اجرا کیا گیا ان میں 'جی ٹوئنٹی: تعارف، تاریخ اور تجزیہ (ہندوستان کے حوالے سے)' از ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی، 'جی ٹوئنٹی اور افکار سرسید' از ڈاکٹر محمد ناصر، شعبہ دینیات، 'گروپ آف ٹوئنٹی: این انٹروڈکشن' (انگریزی) از محمد راحت حسن، 'انڈیاز جی 20 پریزیڈنسی، رائز آف انڈیا ایز گلوبل پاور' (انگریزی) از محمد راحت حسن اور 'جی ٹوئنٹی: این آؤٹ لائف آف ریلیجن اینڈ کلچرز' (انگریزی) از فیاض حیدر شامل ہیں۔ ان کتب میں جی ٹوئنٹی کے کلیدی مقاصد، تنظیم کے قیام کی وجوہات اور مختصر تاریخ و دیگر متعلقہ موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 6 ستمبر 2023

بوند بوند چاہت

کانکی نارہ: ادارہ 'چراغ ادب' کے زیر اہتمام معروف ومقبول شاعر شمیم انجم وارثی کی نئی کتاب 'بوند بوند چاہت' کی رسم رونمائی بمقام کانکی نارہ کمیونٹی ہال نزد کانکی نارہ حمایت الغرباء ہائی اسکول ادا کی گئی۔ تقریب اجرا کی صدارت ڈاکٹر عاصم شاہنواز شبلی نے کی۔ نظامت خواجہ احمد حسین نے کی۔ کتاب اور صاحب کتاب پر تاثرات پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر خورشید اقبال، پروفیسر طیب نعمانی، صاحب دیوان شاعر معراج احمد معراج اور پروفیسر عاصم شاہنواز شبلی قابل ذکر ہیں۔ بھاٹ پارہ میونسپلٹی کے سی آئی سی

اور کاؤنسلر نور جمال صاحب، ریاض احمد، پروفیسر زبیر خالد اور کمرہٹی اسکول کے ایڈمنسٹریٹر اصغر علی نے پروگرام کے تعلق سے اظہارِ خیال کیا۔ پروفیسر طیب نعمانی نے کہا کہ پاؤں کی زنجیریں کسی کی کاوشوں کو نہیں روک سکتیں۔ نقیب شہر خواجہ احمد حسین نے کتاب میں شامل معروف شاعر و ادیب ممتاز انور کے مضمون سے چند اقتباسات کو پڑھا کہ میری دانست میں 'بوند بوند چاہت' پہلی تضمینی کاوشوں کا مجموعہ ہے۔ صاحبِ کتاب و صاحب بزم شمیم انجم وارثی نے کہا کہ میری تضمینی کاوشیں کیسی ہیں؟ اس کا فیصلہ قاری و ناقدین کریں گے۔ ڈاکٹر عاصم شاہنواز شبلی میرے دل میں دھڑکتے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 ستمبر 2023

خالد محمود: شخصیت اور ادبی خدمات

دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام جناب سیفی سرونجی اور محترمہ استوتی اگروال کی مرتبہ کتاب 'خالد محمود: شخصیت

اور ادبی خدمات' پر مذاکرے کا ایوانِ غالب میں انعقاد کیا گیا جس کی صدارت سابق چیف الکشن کمشنر جناب ایس وائی قریشی نے فرمائی۔ انھوں نے کہا کہ خالد محمود صاحب سے میں پہلے بھی واقف تھا لیکن اس کتاب کے ذریعے ان کی شخصیت کے تمام پہلو مجھ پر روشن ہو گئے ہیں۔ اس مذاکرے میں جو گفتگو میں نے سنی اس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں مبالغے کو دخل نہیں تھا اور سب نے خود کو موضوع تک محدود رکھا، کسی مذاکرے کی کامیابی کی اس سے بڑی کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ جلسے کے مہمان خصوصی اور دہلی کے سابق لیفٹیننٹ گورنر جناب نجیب جنگ صاحب نے کتاب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ خالد محمود صاحب سے میری پہلی ملاقات بہت یادگار تھی اور وہ آج تک میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ انھوں نے جس ادارے کی ذمے داری قبول اس کی قسمت بدل کر رکھ دی۔ وہ اچھے استاد اور لاجواب منتظم ہیں۔ اس کتاب میں ان کی شخصیت کے سبھی پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ اس بہترین ترتیب کے لیے اس کے مرتبین لائق مبارکباد ہیں۔ اجلاس کے مہمان اعزازی جناب چندر بھان خیال نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ خالد محمود اگرچہ میرے استاد نہیں ہیں لیکن میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان کی شخصیت میں کمال کا انہماک ہے جس چیز میں لگ جاتے ہیں اس میں ایک منفرد شان پیدا کر دیتے ہیں۔ شاعری، خاکہ نگاری ہو یا انتظامی امور وہ ہر میدان کے شہسوار ہیں۔ اس کتاب کے مرتب جناب سیفی سرونجی صاحب نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خالد محمود صاحب میرے استاد بھی رہے ہیں اور ایک ادیب کی حیثیت سے ان کا اسلوب تربیت کا وسیلہ ہے۔ ان سے ہر ملاقات میں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ ایسی شخصیت کے علمی کارناموں کا اعتراف تحریری شکل میں لازم ہے اسی خیال نے مجھے کتاب کی ترتیب پر راغب کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ سب نے اسے پسند کیا اور اپنے گراں قدر خیالات پیش کیے۔ محترمہ استوتی اگروال نے اس کتاب کی ترتیب میں بہت محنت کی ہے وہ زیادہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر معین الدین جینا بڑے، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر سراج اجملی، پروفیسر ابوبکر عباد، پروفیسر تسنیم فاطمہ، جناب راشد جمال فاروقی، محترمہ فوزیہ رباب، ڈاکٹر نعمان قیصر، اور ڈاکٹر فیضان شاہد نے کتاب کے اہم گوشوں اور خالد محمود صاحب کی شخصیت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر خالد مبشر نے انجام دیے اور ادارے کی جانب سے استقبالیہ کلمات ڈاکٹر مظفر رضا نے پیش کیے۔ محترمہ استوتی اگروال نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2023

وفیات

رہبر تابانی

دریاباد، بارہ بنکی: بزم رہبر کے صدر و استاد الشعرا رہبر تابانی دریابادی کا مختصر علالت کے بعد 75 برس کی عمر میں 18 ستمبر کو انتقال ہو گیا۔ وہ 14 ستمبر کو ہی عمرہ کی

ادائیگی سے فراغت کے بعد وطن لوٹے تھے۔ ان کے انتقال سے علمی، ادبی اور سماجی حلقوں میں نہ صرف غم کی لہر دوڑ گئی بلکہ بارہ بنکی، ایودھیا، لکھنؤ، گونڈہ، سلطان پور و دیگر مقامات پر پھیلے ہوئے ان کے شاگردوں، متعلقین و دوست احباب نے تعزیت کر کے دعائے مغفرت کی ہے۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جب کہ اہلیہ کا انتقال تین سال قبل ہو چکا ہے۔

رہبر تابانی یکم ستمبر 1948 کو محلہ چھیپی دریاباد ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام محمد سمیع اور تخلص رہبر تابانی تھا، ان کے والد کا نام ہاشم علی تھا۔ انھوں نے الہ آباد بورڈ سے منشی، کامل اور اردو، عربی و فارسی کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ 1967 میں انھوں نے شاعری کا آغاز کیا اور تاباں شفقتی کے شاگرد ہوئے۔ چنانچہ اسی نسبت سے انھوں نے اپنا تخلص تابانی اختیار کیا۔ تاباں شفقتی کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد ان کی علمی ادبی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہو گیا اور رفتہ رفتہ انھوں نے دنیائے علم و ادب میں وہ مقام حاصل کیا کہ بارہ بنکی ہی نہیں بلکہ قرب و جوار کے تقریباً نصف درجن اضلاع میں ان کی شاعری محتاجِ تعارف نہیں رہی۔ ان کے شاگردوں کی بھی بڑی طویل فہرست ہے جو اپنے اضلاع، قصبوں و گاؤں میں رہتے ہوئے علم و ادب کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔ ان کے چھ مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آ چکے ہیں، جن میں آبلے (1995)، آبگینے (1999)، شب چراغ (2011)، حرمین (1)، الماس (2016) اور ارتعاش (2020) ہیں۔ رہبر تابانی معروف ادیب و استاد شاعر ہونے کے ساتھ ہی نیک، پرہیزگار اور انتہائی منکسر المزاج تھے۔ وہ متعدد دینی، علمی، ادبی و سماجی تنظیموں کے سرپرست و ممبر بھی تھے۔ فن عروض اور رباعی گوئی میں خصوصی مہارت تھی، اچھی بات یہ تھی کہ علم و فن کا ذرہ برابر غرور نہ تھا، اس لیے چھوٹے بڑوں، عوام و خواص سبھی میں یکساں مقبول تھے۔ 2023 میں 296 صفحات پر مشتمل کتاب ان کی شخصیت اور فنی کمالات پر آ چکی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 ستمبر 2023

پروفیسر ڈاکٹر بدیع الرحمٰن

کولکاتا: پروفیسر ڈاکٹر محمد بدیع الرحمٰن سابق صدر شعبہ عربی وفارسی، کلکتہ یونیورسٹی، مغربی بنگال کا طویل علالت

کے بعد انتقال ہوگیا۔ پروفیسر بدیع الرحمٰن، پروفیسر ابو محفوظ الکریم معصومی اور پروفیسر راحت اللہ ازہری جیسے بڑے اساتذہ سے فیض یاب ہوئے تھے۔ آپ کا تعلق ایک علمی گھرانے سے تھا، آپ کے والد شیخ عبدالرحمٰن ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے۔ آپ نے عالم وفاضل ویسٹ بنگال، مدرسہ بورڈ سے پاس کیا تھا۔ ہائی اسکول، پری یونیورسٹی، بی اے (آنرز) عربک اور ایم اے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے آپ پی ایچ ڈی سے سرفراز کیے گئے۔ شروع میں ایک اسٹیل کمپنی میں کام کیا۔ اس کے بعد انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز تغلق آباد میں پی آر او کی حیثیت سے تقرر ہوا، ساتھ ہی عربی کے سرٹیفکیٹ کورس کی تدریس کی ذمے داری بھی دی گئی۔ اگست 1983 میں کلکتہ یونیورسٹی کولکاتا میں لیکچرر کی حیثیت سے عربی وفارسی شعبے میں تقرر ہوا۔ آخری دم تک اسی یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھیں وزٹنگ پروفیسر بنادیا گیا۔ آپ کے مختلف مضامین انگریزی اور بنگالی میں مختلف موقر مجلات میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر طہ حسین پر اپنے انگریزی مضامین کا ایک مجموعہ تیار کیا، جس میں ایک مضمون عربی میں بھی ہے۔ اسی طرح آپ نے بی اے آنرز عربک اور بی اے جنرل کی نصابی کتابوں کو بھی ایڈٹ کیا۔ نیز رابندر ناتھ ٹیگور پر آپ کے بعض مضامین شائع ہوئے ہیں۔ آپ کو تدریسی اور انتظامی امور میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ صدر جمہوریہ ہند نے آپ کی عربی خدمات پر آپ کو اعزاز سے نوازا تھا۔ طبیعت ناساز ہونے پر دو ہفتے پہلے ہسپتال میں داخل ہوئے تھے جہاں سے 18 ستمبر کو ڈسچارج کر دیا گیا تھا لیکن اگلے ہی دن صبح 19 ستمبر کو گھر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ کولکاتا میں پارک سرکس کے گوبرا قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 22 ستمبر 2023

غلام نبی خیال

سری نگر: وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والے نامور ادیب، صحافی، شاعر، قلمکار غلام نبی خیال 15 اکتوبر

بروز اتوار علی الصبح انتقال کرگئے۔ ذرائع نے بتایا کہ انھوں نے راول پورہ میں واقع اپنی رہائش گاہ پر آخری سانسیں لیں۔ ان کے پسماندگان میں 2 بیٹے ہیں جو بیرون ملک کام کرتے ہیں۔ مرحوم خیال نے جہاں قومی و بین الاقوامی سطح کے صحافتی اداروں میں اپنی خدمات انجام دی ہیں، وہیں انھوں نے انگریزی، اردو اور اپنی مادری زبان کشمیری میں زائد از 30 کتابیں تصنیف کی ہیں جس میں رباعیات عمر خیام (1961)، چراگاش (1962)، کاروانِ خیال (1998)، فکر خیال (2007)، خیالات (2009)، چنار رنگ (2010)، خیال قلم (2012) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی شاہکار کتاب 'گاشک مینار' کے اعزاز میں انھیں ایک باوقار قومی اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ انھیں سال 1975 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے ان کی وابستگی رہی ہے۔ مرحوم خیال کے عمر خیام کی رباعیات کے کشمیری ترجمے نے ان کی شہرت کو بام عروج پر پہنچایا۔ انھیں اپنے آبائی مقبرہ راول پورہ میں سپرد خاک کیا گیا اور ان کی تجہیز وتکفین میں مختلف شعبہ ہائے حیات بالخصوص علم وادب سے وابستہ اہم شخصیات کے علاوہ لوگوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ غلام نبی خیال کے انتقال پر مختلف سیاسی، سماجی وادبی تنظیموں نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 اکتوبر 2023

ڈاکٹر محمود شیخ

جبل پور: مدھیہ پردیش کے نامور ادیب وشاعر جناب

ڈاکٹر محمود شیخ صاحب کا مختصری علالت کے بعد 15 ستمبر 2023 کی شب 2 بجے میدانتا اسپتال دہلی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 72 سال تھی۔ 15 ستمبر کو جسد خاکی شام کو جبل پور پہنچا۔ 16 ستمبر کو رانی تال قبرستان میں بعد نماز ظہر سپرد خاک کیا گیا۔ ڈاکٹر محمود شیخ صاحب کے پسماندگان میں اہلیہ اور تین بیٹے شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمود شیخ کی پیدائش 14 اپریل 1951 میں جبل پور میں ہوئی۔ بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد محکمہ دفاع کی گن کیرج فیکٹری میں ملازم ہوگئے۔ 31 اپریل 2011 کو گزیٹڈ آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اردو ادب کے مطالعے کے شوق کے سبب اردو میں ایم اے کیا اور جبل پور کے مشہور ومعروف قابل استاد ڈاکٹر عبدالباقی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کے مقالے کا عنوان 'رتن سنگھ کی افسانہ نگاری' تھا۔ ڈاکٹر محمود شیخ صاحب بیک وقت افسانہ نگار، شاعر، محقق اور تنقید نگار تھے۔ آپ کے مضامین متواتر اردو کے موقر رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ آپ کے افسانوں کا ایک مجموعہ 'بھری دوپہر میں آگ' (2006) میں منصۂ شہود پر آکر داد وتحسین حاصل کرچکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین کے چار مجموعے بھی شائع ہوچکے ہیں جن میں علامیاتی تفہیم کا بیان (2004)، جذباتی اور جدلیاتی شعور ادب (2012)، بیان کی تلاش (2016) اور امیجری کا زوال (2019) شامل ہیں۔ انھیں تنقیدی مضامین نے پورے ہندوستان میں شہرت دوام بخشی ہے۔ آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال نے 'محمد علی تاج صوبائی اعزاز' 2013 میں اور دوسرے صوبائی اعزاز سے 2019 میں نوازا۔ اس کے علاوہ اتر پردیش اکادمی لکھنؤ نے ان کی کتاب پر انعام سے بھی نوازا۔ محمود شیخ کے سانحہ ارتحال پر جبل پور ہی نہیں مدھیہ پردیش کے ادبی حلقوں میں سوز وغم کا ماحول ہے۔ ہندوستان کے تنقیدی ادب اور خاص طور پر عمرانیات اپنی پرزور اور فلسفیانہ تحریروں سے اردو ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کرنے والے علامہ ڈاکٹر محمود شیخ صاحب کے اس جہان فانی سے کوچ کر جانے کے سبب جو خلا پیدا ہوگیا ہے اس کو پر کرنا مشکل ہوگا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد اشفاق عارف، صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ ایم بی گرلس کالج، جبل پور، مدھیہ پردیش، 13 اکتوبر 2023

ایس ایم آصف

نئی دهلی: 'ان دنوں' گروپ کے بانی اور سربراہ معروف سینئر صحافی ڈاکٹر ایس ایم آصف کا رام منوہر لوہیا ہسپتال

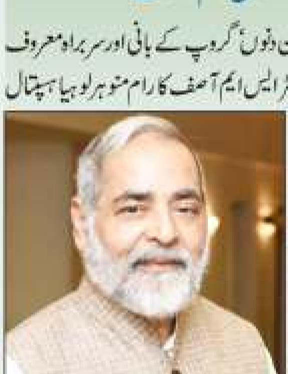

میں 20 ستمبر کو تقریباً صبح گیارہ بجے انتقال ہوگیا۔ مرحوم کئی ماہ سے سخت علیل تھے، آٹھ ماہ

قبل جنوری کے اواخر میں انھیں گردہ کی شکایت پیش آئی، جس کا دہلی کے مشہور ڈاکٹروں کی نگرانی میں علاج چل رہا تھا نیز ایک ہفتہ قبل انھیں برین ہیمرج ہوا۔ ایس ایم آصف کی پیدائش 10 دسمبر 1953 میں ہوئی۔ مرحوم اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی بلا کے ذہین اور صحافت سے دیرینہ دلچسپی رکھتے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے روزنامہ 'ان دنوں' کو سب سے پہلے 1975 میں بہار کی راجدھانی پٹنہ سے شائع کیا، اردو حلقے میں خاصا معروف ہوا، جس کے بعد بتدریج دہلی، ممبئی، لکھنؤ، جے پور اور سہارنپور جیسے شہروں سے بھی شائع ہونے لگا۔ اردو صحافت کی خدمت کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی زبان میں بھی روزنامے نکالے۔ انھوں نے 1998 میں آل انڈیا مائناریٹیز فرنٹ قائم کی اور پارٹی کے ممبران اور کارکنان کی باہمی مشاورت سے اس فرنٹ کے صدر بھی منتخب کیے گئے۔ مرحوم کی نماز جنازہ بٹلہ ہاؤس کے خلیل اللہ مسجد کے احاطہ میں ادا کی گئی، جس میں محبین اور کثیر تعداد میں صحافی برادری نے شرکت کی اور تدفین بٹلہ ہاؤس قبرستان میں ہی عمل آئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 ستمبر 2023

شبیر احمد قرار

ممبئی: ممبئی کے ممتاز شاعر اور احمد سیلر ہائی اسکول (ناگپاڑہ، ممبئی) کے سابق مدرس شبیر احمد قرار 11 اکتوبر بروز بدھ وار کو رات آٹھ بجے کے آس پاس (ممبرا میں) انتقال کر گئے۔ 82 سالہ شبیر احمد قرار گزشتہ ایک عرصے سے صاحب فراش تھے۔

وہ 25 اگست 1941 کو مدھیہ پردیش کے مشہور شہر برہانپور میں پیدا ہوئے تھے۔ شبیر احمد قرار کے بزرگ رائے بریلی (اترپردیش) سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ مرحوم قرار نے برہانپور کے علاوہ بھوپال میں تعلیم حاصل کی۔ پونے یونیورسٹی سے انھوں نے ماسٹرز کیا تھا، اس وقت وہ اپنے تمام ساتھی طلبا میں ممتاز تھے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ 'ہرے بھرے لمحات' ایڈ شاٹ پبلی کیشنز (ممبئی) کے زیر اہتمام (2001) میں شائع ہو چکا ہے۔ جمعرات 12 اکتوبر کو ایم ایم ویلی کے علاقے میں کوسہ ممبرا کے اسٹیڈیم اور سرکاری ہسپتال کے سامنے واقع قبرستان میں ان کے جسد خاکی کو قبل از نماز عشا سپرد خاک کیا گیا۔

روزنامہ 'اردو نیوز' ممبئی، 14 اکتوبر 2023

رضوان سلمانی

دیوبند: اردو کے صحافی رضوان سلمانی کا علالت کے باعث 1 اکتوبر کی صبح تقریباً پانچ بجے عیدگاہ روڈ پر واقع فیضان میڈیکل ملٹی اسپیشلٹی ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 55 برس کے تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سے سماجی، سیاسی، صحافتی اور علمی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی، بڑی تعداد میں علماء کرام، صحافیوں اور سرکردہ شخصیات نے گہرے رنج و الم کا اظہار کیا، اور تعزیت مسنونہ پیش کی۔ رضوان سلمانی گزشتہ ایک ماہ سے سخت علیل تھے۔ دہلی، مظفر نگر اور دیوبند کے مختلف ہسپتالوں میں ان کا علاج چل رہا تھا۔

رضوان سلمانی نے اپنی زندگی کا نصف حصہ اردو صحافت کو دیا۔ وہ دہلی سے شائع ہونے والے روزنامہ 'ہمارا سماج' کے بیورو چیف ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد اخبارات اور رسائل میں لکھتے تھے۔ انتہائی خوش مزاج، ملنسار، ہمدرد اور تعلق نبھانے والی شخصیت کے مالک تھے، رضوان سلمانی بلاشبہ ان خوش خو صحافیوں میں سے تھے جن کے نزدیک صحافت کو ایک پیشہ سے زیادہ جنون کی حیثیت حاصل ہے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے اور ضعیف العمر والد ماسٹر محمد اسلام ہیں۔ نماز جنازہ بعد نماز ظہر احاطہ مولسری میں ممتاز عالم دین مولانا مفتی سید عفان منصور پوری نے ادا کرائی۔ بعد ازیں اردو گیٹ کے متصل قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 اکتوبر 2023

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر .... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زر تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دکنی ہندو اور اردو املا

مصنف: نصیرالدین ہاشمی

تیسری اشاعت: 2023

صفحات: 266

قیمت: 170 روپے

کلیاتِ فراق (جلد سوم)

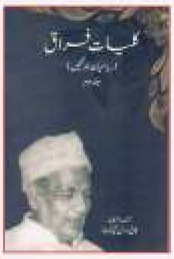

ترتیب و تدوین: کالی داس گپتا رضا

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 399

قیمت: 235 روپے

املا نامہ

مرتب: گوپی چند نارنگ

چوتھی اشاعت: 2023

صفحات: 97

قیمت: 80 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین

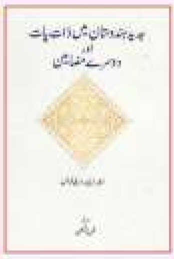

مصنف: ایم این سری نواس

مترجم: شہباز حسین

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 180، قیمت: 125 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

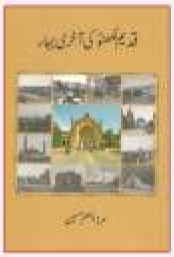

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

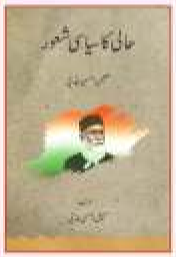

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

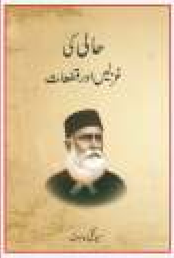

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 66+185

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

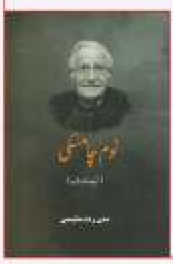

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, नवम्बर-२०२३,वर्ष:२५, अंक:११
URDU DUNIYA Monthly, November-2023, Vol.25, Issue:11
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/10/2023
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Prof. Dhananjay Singh, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6